قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

نومبر 2012، قیمت -/15

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

جدید ہند کے معمار
اردو زبان و تہذیب کے پرستار

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

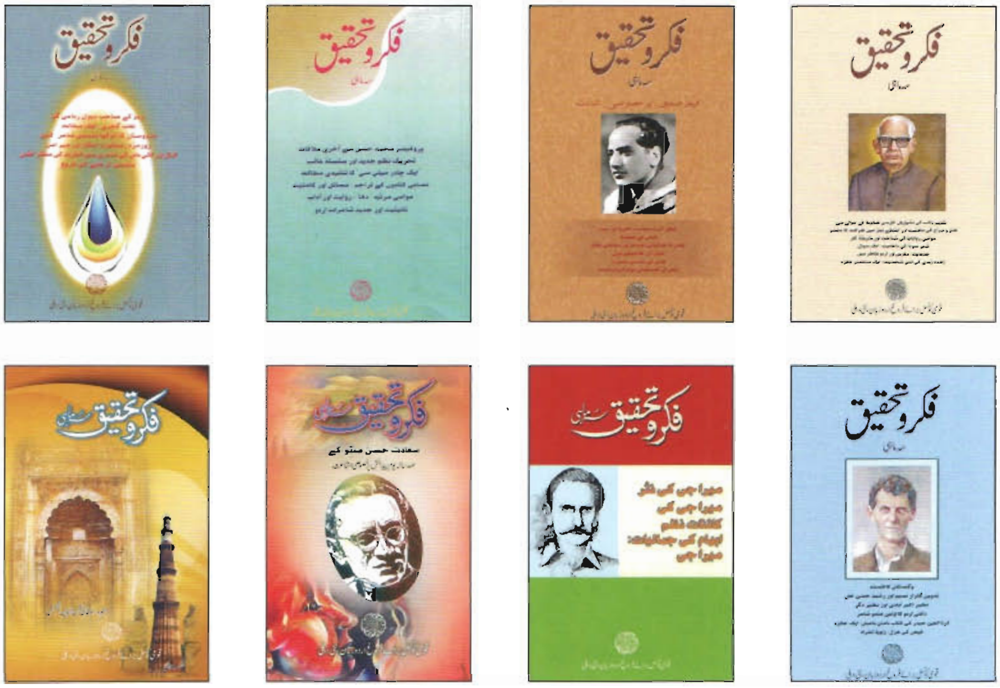

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066، فون: 26109746، فیکس: 26108159

E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com

ماہنامہ
اُردو دُنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:14،شمارہ:11،نومبر 2012

مدیر: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

اعزازی مدیر: نصرت ظہیر

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا
انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

قیمت-/15 روپے، سالانہ -/150 روپے

■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی -110025
فون: 49539000
(شعبۂ ادارت:49539009)

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
email: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7
آر کے پورم، نئی دہلی ۔ 110066
فون: 26109746
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد -500002
فون: 24415194 - 040

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 2

خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط 3

انٹرویو
عارف مارہروی — فیصل عارف 7

شخصیت
اسرارالحق مجاز: ایک زندہ دل شاعر — مدثر علی خاں 10

کور اسٹوری
اردو اور پنڈت نہرو — شفیع ایوب 12
میرا دوست نہرو! — جوش ملیح آبادی 14
میرا بچپن — جواہر لعل نہرو 18

زبان و تعلیم
متھلا انچل میں اردو... — محمد جہانگیر وارثی 23

ادبی مباحث
بچوں کا ادب اور اردو — ابن کنول 25
آج کی تانیثی شاعری کا منظرنامہ — وسیم بیگم 27
ہندوستانی ادب میں دلت کہانیاں — شائستہ فاخری 29

صحافت
انٹرویو کی اہمیت وتکنیک — نسیم احمد 32

ہم نے جنھیں بھلا دیا
حکیم احمد خاں فاخر رام پوری — تبسم صابر 35

مشاہیر ادب/نظم
وحشت کلکتوی — شبیر احمد 38
کلام وحشت کلکتوی 40

مشاہیر ادب/نثر
سجاد ظہیر — ادارہ 41
لندن کی ایک رات — سجاد ظہیر 42

ہماری مطبوعات
ہجو و ہزل اور واسوخت — محمد انصار اللہ 47

یوم عاشور
مرثیہ انیس میں یوم عاشور — ایس نسیم بانو 50

تہذیب و ثقافت
حیدرآبادی ڈھولک گیت — قاضی حبیب 52

فلم
سنیما کیسے دیکھیں؟ — محمد علم اللہ 54

کیریئر گائڈ
بدلتے وقت کی ضرورتیں — اسما مسعود 57

دوسری زبانوں سے
برکھا کی کائنات (بنگلہ کہانی) — سوئیکت مکھو پادھیائے، ترجمہ: نسیم عزیزی 60

صحت
دماغ اور دماغی صحت — شمس الاسلام فاروقی 63

سائنس
انفارمیشن ٹیکنالوجی: تدبیر یا تقدیر — پرویز احمد 65

کتابوں کی دنیا
تبصرہ و تعارف 69

اردو کیمپس
ممبئی یونیورسٹی میں اردو تعلیم — ماجد قاضی 75
یونیورسٹیوں کی اردو سرگرمیاں — ادارہ 77

اشتہار
ڈی اے وی پی (DAVP) 82

عالمی اردو نامہ — ادارہ 84

خبرنامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 86

ہماری بات

جدید ہندوستان کے معمار اور اردو زبان و تہذیب کے پرستار پنڈت جواہر لعل نہرو اگر آج ہمارے بیچ موجود ہوتے تو اکیسویں صدی کے ہندوستان کو دیکھ کر حیران رہ جاتے۔

ایک طرف انھیں یہ دیکھ کر دکھ ہوتا کہ جمہوریت کی جڑیں پہلے سے زیادہ مضبوط ہونے کے باوجود ملک سے بدعنوانیوں کا خاتمہ نہیں ہوا ہے۔ پانچ سالہ ترقیاتی منصوبوں پر خرچ ہونے والی رقم میں ہر منصوبے کے ساتھ زبردست اضافہ ہوا ہے لیکن کئی کروڑ لوگ آج بھی خط افلاس سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں اور مہنگائی سے عام آدمی کو نجات نہیں ملی ہے۔ اناج کے گودام تمام کے تمام بھرے ہوئے ہیں پھر بھی بچوں اور خواتین کی ایک اچھی خاصی تعداد تغذیہ کی کمی کا شکار ہے۔ دنیا آج ہمیں سب سے تیزی کے ساتھ ابھرنے اور پھیلنے والی معیشت مانتی ہے لیکن بے روزگاری ہمارے لیے آج بھی ایک بڑا مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ سیاسی اور سماجی سطحوں پر بلالحاظ قوم و مذہب لوگوں کا ایک دوسرے پر انحصار مسلسل بڑھتا جارہا ہے مگر فرقہ پرستی اور مذہبی تعصب کی لعنت سے ابھی تک پوری طرح نجات نہیں ملی ہے۔ چھوا چھوت کا ذلیل اور غیر انسانی رویہ بڑی حد تک ختم ہوا لیکن ذات پرستی کا خاتمہ ابھی تک نہیں ہوسکا ہے۔

لیکن دوسری طرف جب وہ یہ دیکھتے تو یقیناً خوش ہوتے کہ مایوسیوں اور ناامیدی کے اندھیروں میں بہت سی مشعلیں بھی جل رہی ہیں۔ پچاس برس پہلے ہم پی ایل 480 کے تحت امریکی گندم کی خیرات سے شکم پری کر رہے تھے لیکن آج ہمارے کسان اتنی مقدار میں اناج اگا رہے ہیں اور زرعی پیداوار اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اسے گوداموں میں رکھنا بھی ایک مسئلہ بن گیا ہے۔ ساٹھ سال قبل ہمارے یہاں اعلیٰ سائنسی و طبی تعلیم کے ذرائع محدود تھے مگر آج ہندوستان دنیا میں سب سے زیادہ سائنس داں اور ڈاکٹر پیدا کرنے والا ملک ہے۔ خلائی تحقیق میں صرف 33 برس پہلے ہم نے محض 40 کلوگرام وزنی پے لوڈ والے راکٹ کی اڑان سے ایک معمولی شروعات کی تھی اور آج ہمارے سیکڑوں مصنوعی سیارے خلا میں گھوم رہے ہیں یہاں تک کہ امریکہ برطانیہ اور جاپان جیسے ترقی یافتہ ملک بھی اپنے مصنوعی سیارے ہمارے راکٹوں سے خلائی مداروں میں نصب کرا رہے ہیں، اور سب سے پچھڑے ملکوں میں شمار ہونے والا ہندوستان چاند پر قدم رکھنے کے منصوبے پر عمل پیرا ہے۔

اس سے بھی زیادہ خوشی جواہر لعل نہرو کو یہ دیکھ کر ہوتی کہ تمام تر 'ماہرانہ نکتہ چینیوں' کو بالائے طاق رکھ کر انھوں نے بڑے بڑے باندھ بنانے، بھاری صنعتوں کے شعبے میں سرکاری کارخانے لگانے اور اعلیٰ سائنسی تکنیکی و طبی تعلیم و تحقیق کے ادارے قائم کرنے کا جو خطرہ مول لیا تھا اور جنھیں وہ نئے ہندوستان کے نئے مندر کہا کرتے تھے، ان کی بدولت آج ملک کے لاکھوں گاؤں بجلی سے روشن ہو رہے ہیں، لاتعداد کھیت سیراب ہو رہے ہیں، ٹرینوں کے انجن اور ڈبے، ہوائی جہاز، مال بردار سمندری جہاز، بسیں اور ٹرک، فولادی ساز و سامان اور الیکٹرانک آلات ملک کے اندر ہی تیار ہو رہے ہیں۔ چیچک اور پولیو جیسی بیماریوں کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ ہمارے سپر اسپیشیالٹی ہاسپٹلز میں یوروپ اور امریکہ کے لوگ بھی علاج کرانے آرہے ہیں۔ ہمارے دفتروں اور گھروں میں کمپیوٹر کا استعمال ہو رہا ہے۔ ٹیلی فون، موبائل فون، ٹیلی ویژن، اے ٹی ایم، انٹرنیٹ بنکنگ جیسی نئے زمانے کی سہولتیں عام آدمی کی دسترس میں ہیں اور تمام تر مشکلات کے باوجود ہم ترقی کی نئی منزلیں سر کر رہے ہیں۔

اس سب کے ساتھ نہرو یہ دیکھ کر اور بھی خوش ہوتے کہ جس اردو زبان کو وہ اپنی مادری زبان کہا کرتے تھے، جس اردو تہذیب کو انھوں نے اپنے رہن سہن اور پہناوے تک کا حصہ بنا رکھا تھا، وہ زبان لسانی تعصب کے اس گھنے اندھیرے سے بڑی حد تک باہر نکل آئی ہے جس میں اسے ملک کی تقسیم نے دھکیل دیا تھا۔ وہ زبان جس کے لیے وہ اپنے دور حکومت میں بہت کچھ کرنا چاہتے تھے لیکن تقسیم کے اسباب میں اسے بھی شامل کر لیے جانے کی وجہ سے ان کے ہر ارادے کی تکمیل میں مشکلات حائل ہو جاتی تھیں اور جس کا انھیں اکثر ملال رہتا تھا، وہی زبان آج اپنی طاقت اور حکومت کی سرپرستی کی بدولت پھل پھول رہی ہے۔ نئی ٹیکنالوجی، نئی سوچ اور نئی ضرورتوں نے اردو تہذیب کو جس طرح ملک کے کونے کونے میں پھیلانے کے مواقع پیدا کیے ہیں انھیں دیکھ کر پنڈت نہرو کو کچھ نہ کچھ اطمینان ضرور ہوتا۔

یہ مہینہ، اردو تہذیب کے اسی فرزند کی پیدائش کا مہینہ ہے۔ نہرو کی عظیم شخصیت کو ہم اردو والوں کا سب سے بڑا خراج عقیدت یہی ہوگا کہ ان کی مادری زبان کو ہم سب اپنے گھروں میں جگہ دیں اور اس شاندار وراثت کو اپنی اولاد تک منتقل کرنے کا مناسب انتظام کریں!

آپ کی بات

ڈاکٹر جہاں آرا سلیم

292/152، وکٹوریہ گنج، لکھنؤ

'اردو دنیا' اکتوبر 2012 کا تازہ شمارہ سرسری طور پر ہی ابھی دیکھا ہے۔ ظاہری خوبصورتی روز بروز زیادہ بہتر اور دلکش ہوتی جارہی ہے۔ رسالے کے مشمولات میں ایک سے ایک اچھے ادبی مضامین شامل ہیں جن کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہی ہوگی۔ ہماری بات کے عنوان سے آپ بہت خوب مسئلے اٹھاتے ہیں۔ ستمبر میں آپ نے مدرسوں میں اردو اساتذہ کا مسئلہ اٹھایا تھا اور ان کی حالت زار کا تذکرہ کیا اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے دل میں اردو اور اردو کی خدمت کررہے افراد کے لیے بڑا نرم گوشہ ہے جو آپ کو بے چین کرتا ہے اور یہی بے چینی آپ کو کچھ اچھا کرنے کی ترغیب دیتی ہے لیکن اس درد کو چھپا کر رکھنا بھی اشد ضروری ہے۔ ستمبر میں گوپال داس نیرج صاحب سے فاروق ارگلی کی گفتگو بھلی لگی۔ گفتگو کا جو سلسلہ آپ نے شروع کیا ہے بڑا حوصلہ دیتا ہے۔ دشواریوں کی آنچ میں تپ کر ہی انسان کھرا سونا بنتا ہے۔

محمد عارف اقبال

مدیر اردو بک ریویو، 1739/3، نیا کوہ نور ہوٹل، پٹودی ہاؤس دہلی

ماہنامہ اردو دنیا شمارہ (اکتوبر 2012) 'مہاتما گاندھی اور اردو' کے حوالے سے خاص ہے۔ آپ نے اپنے اداریہ کے آخری پیرا میں بجا طور پر لکھا ہے کہ ''ہندوستانی زبان کے نام سے گاندھی جی نے جو نظریہ پیش کیا تھا، اسے آج کے ہندوستان میں 'بین لسانی بقائے باہم' کے محرک کے طور پر اپنایا جاسکتا ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کو ملک کے مختلف حصوں کی علاقائی زبانوں اور بولیوں کے ساتھ ہم رشتہ کیا جائے۔'' کاش آپ کی بات پر صدق دل سے توجہ دی جائے تو اس کے دوررس نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔ تازہ شمارہ کے سرورق پر گاندھی جی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک یادگار خط کا عکس شائع ہوا ہے۔ یہ خط (مرقوم 9 جون 1938) گاندھی جی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اقبال نمبر میں شائع ہوا۔ ماہنامہ اردو دنیا کے موضوعات میں جو تنوع ہے، اللہ کرے آپ کی قیادت و ادارت میں مزید نکھار پیدا ہو۔

عبدالواجد خان

اردو مجلس ٹرسٹ رجسٹرڈ میسور

اکتوبر 2012 کا 'اردو دنیا' 2 اکتوبر گاندھی جی کا یوم پیدائش، اور اِن کے ہاتھ کا لکھا ہوا اردو خط، مہاتما گاندھی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ مہاتما گاندھی نے

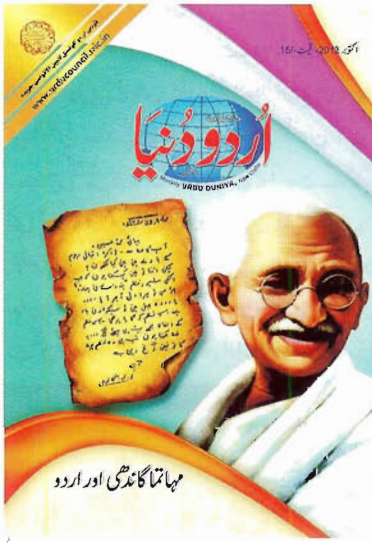

بالکل سچی اور سیدھی سادھی زبان میں اقبال کے ترانۂ ہند پر یہ کہہ دیا کہ 'ہندوستان ہمارا' نظم پڑھ کر ان کا دل بھر آیا تھا۔ اس نظم کے الفاظ مجھے بہت ہی میٹھے لگے۔ کیوں نہ ہوں آخر اردو زبان میں جو لکھے گئے تھے، اور یہ ان کی چہیتی زبان بھی تھی۔ اِس اردو کو آج، صرف مسلمانوں کی زبان، بٹوارے کی زبان، نفرت پھیلانے والی زبان، غیر ملکی زبان، اور نہ جانے کیا کیا بے تعلق الزاموں سے نوازہ جارہا ہے، دل کھوٹے تو زباں بھی کھوٹی، کیونکہ وہ مردِ صداقت کم ہوتے جارہے ہیں۔

شیخ صادق

معاون مدرس، الحسنات رسلپور، (مہاراشٹر)

انٹرنیٹ کی دنیا پر سفر کرتے ہوئے اچانک میری نظر اردو کونسل کی سائٹ پر پڑی۔ جس میں 'اردو دنیا' کو دیکھ کر پڑھنا شروع کیا تو پڑھتا گیا۔ پھر ارادہ کیا کہ اس کا سالانہ خریدار بن جاؤں۔ میں گزشتہ تین مہینوں سے اس کا خریدار ہوں۔ جب پہلی مرتبہ 'اردو دنیا' ہاتھ میں آیا تو میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ مجھے یقین ہی نہیں آیا ہے۔ ان مشکل ترین حالات میں اور اتنی کم قیمت پر اُردو کا کوئی ایسا رسالہ نکلتا ہو۔ اردو دنیا ہم جیسے درس و تدریس سے جڑے لوگوں کے لیے کسی نعمت مطہرہ سے کم نہیں ہیں۔ اکتوبر 2012 کا رسالہ نظروں سے گزرا۔ سرورق پر گاندھی جی کا اردو میں لکھا ہوا خط دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ واقعی اردو کونسل اور اردو دنیا اردو کی کافی خدمت کررہا ہے۔ کیریئر گائڈ کے تحت UGC کی تیاری کیسے کریں، معلومات افروز رہا۔ امید ہے اسی طرح اردو دنیا ہماری رہنمائی کرتا رہے گا۔

محمد عبدالعزیز سہیل

4-2-75، لطیف بازار، نظام آباد

'اردو دنیا' اکتوبر کا شمارہ حسب معمول یکم اکتوبر کو موصول ہوا۔ سرورق گاندھی جینتی کی عکاسی کررہا ہے اور آپ نے گاندھی جی کا اردو زبان میں لکھا خط بھی ٹائٹل پر شائع کیا ہے جو کہ قومی یکجہتی کے تصور کو واضح کرتا ہے جس میں علامہ اقبالؒ کی نظم کا تذکرہ ہے۔ آپ نے 'ہماری بات' کے تحت اداریہ کو مکمل طور پر گاندھی جی کی شخصیت اور ان کے نظریہ کے بارے میں لکھا ہے اچھا ہے اگر ساتھ ہی اس شمارے پر تبصرہ کرتے تو اور اچھا ہوتا۔ مجتبیٰ حسین صاحب کی 50 سالہ ادبی خدمات کی تکمیل پر جو انٹرویو محمد ظفرالدین نے لکھا ہے پڑھ کر خوشی ہوئی اور معلومات کا ذریعہ بھی بنا۔ مجتبیٰ حسین، اقبال متین، علامہ شمس الرحمٰن فاروقی، مظفر حنفی، وسیم بریلوی، ہمارے ادب کا قیمتی سرمایہ ہے ان کی ادبی خدمات پر مسلسل لکھا جانا چاہیے۔ 'پریم چند کی تخلیقات پر گاندھی جی کا اثر' عبدالرشید خان کا مضمون بھی اچھا ہے۔ سرسید احمد خان سے متعلق تحریر بھی پسند آئی۔ ادبی مباحث کے تحت شامل مشمولات فیض احمد فیض، کیفی اعظمی، علامہ اقبال، کنہیا لال کپور جیسی تحریروں سے معلومات بھی حاصل ہوئی ساتھ ہی دل کو راحت اور تفریح کا موقع نصیب ہوا۔ کیریئر گائیڈ کے تحت UGC نیٹ کی تیاری کیسے کریں کو آپ نے شامل کرکے میرے دل کی بات سن لی اس طرح کے مضامین کا سلسلہ جاری رکھیں اور ساتھ ہی طالب علموں اور نوجوانوں میں احساس خودی اور ہمت افزائی کے لیے بھی مضامین کو شامل کریں تو ان کی ہمت افزائی اور صحیح رہنمائی ہوسکے گی۔

اعجاز عبید

9-1-25/A/1، ہاشم نگر، لنگر ہاؤس، حیدرآباد

میں اس وقت علی گڑھ میں ہوں، یہاں 'اردو دنیا' کے ستمبر اکتوبر کے شمارے خریدے تو معلوم ہوا کہ اس میں صوری اور معنوی نکھار آ گیا ہے۔ جب میں ناگپور میں تھا تب باقاعدگی سے اسے خریدتا تھا، بلکہ اپنے مرحوم آن لائن جریدے 'سمت' میں اس وقت کے معاون مدیر افروز عالم کے تشکر کے ساتھ احمد ندیم قاسمی کے انتقال پر احمد ندیم قاسمی کا گوشہ بھی 'سمت' میں شامل کیا تھا جس میں 'اردو دنیا' کا کافی مواد موجود تھا۔ اب 'سمت' تو بند ہو گیا ہے، لیکن میری برقی کتابوں کی سائٹ جاری ہے۔ تازہ شمارے میں اس سلسلے میں جو اردو سافٹ ویئر کے تمیں سالوں کی روداد شامل ہے، وہ مضمون سے زیادہ ان پیج کا اشتہار نظر آتا ہے۔ حالانکہ یونی کوڈ کا تذکرہ ضرور ہے، 'جس کے توسط سے 'مائکرو سافٹ ورڈ' میں اردو لکھی جا سکتی ہے' مصنف کی لاعلمی ظاہر کرتی ہے۔ زیادہ درست یہ ہوگا، کہ اب کسی بھی آپریٹنگ سسٹم میں کسی بھی سافٹ ویئر میں اردو لکھنا ممکن ہے۔ اب تک نستعلیق فانٹ کو کچھ سافٹ ویئرس میں استعمال کرنا دشوار ضرور تھا، لیکن اس ماہ جاری ہونے والے ونڈوز کے ورژن 8 میں کیریکٹر بیسڈ نقل فانٹ کے اردو کے لیے ڈفالٹ فانٹ آنے کے بعد اب شاید کسی بھی سافٹ ویئر۔ پیج میکر، کورل ڈرا وغیرہ میں ان پیج کی قطعی ضرورت نہیں رہے گی، محض کمپوزنگ کے لیے ہی نہیں، پیج سیٹنگ کے لیے بھی۔ اب تو انٹرنیٹ پر ویب صفحات بھی ڈفالٹ نستعلیق فانٹ میں نظر آئیں گے، بشرطیکہ وہ واقعی اردو تحریری زبان یا رسم الخط میں ہوں اور ان کی زبان کو اردو کی حیثیت سے درج کیا گیا ہو۔ کچھ عرصہ پہلے کونسل کی سائٹ پر لائبریری کی کتابیں یونی کوڈ میں ہی دی گئی تھیں، جو میں نے اس وقت کچھ کاپی کر رکھی ہیں، لیکن کسی مجہول ان پیج ٹو یونی کوڈ کنورٹر کے باعث درست کنورٹ نہیں ہوئی تھیں۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ شاید اب کچھ بہتر انتظام ہو، لیکن اب تو معلوم ہوا کہ ساری کتابیں پی ڈی ایف میں کر دی گئی ہیں۔ تو اب مجھے شک ہو رہا ہے کہ شاید کونسل کی ان کتابوں کو اپنی لائبریری میں شامل کرنے پر کونسل کو کوئی اعتراض ہو، کہ یہ اب آن لائن نہیں رہی ہیں۔ اگر اجازت کی ضرورت واقعی ہے تو کیا مجھ کو اجازت دی جا سکتی ہے؟ وہ کتابیں عرصے سے برائے تدوین رکھی ہیں کہ ہمارے اردو کمپوزر ہمیشہ بے شمار اغلاط کرتے ہیں۔ (جن کو پکڑنا بہت مشکل ہوتا ہے، جب تک کہ اسپیل چیکنگ نہ کی جائے۔ پروف پڑھنے پر یہ کہاں معلوم ہو سکتا ہے کہ مثلاً 'اور' میں 'او' اور 'ر' کے درمیان غلطی سے سپیس دی گئی ہے۔ یا درست لکھا ہے۔) طویل فائلیں بہت زیادہ وقت کی متقاضی ہیں۔

اخلاق اثر

صادق منزل، چوکی امام باڑہ بھوپال

اردو کونسل سے آپ کی وابستگی کے مفید ثمرات سامنے آنے لگے ہیں اور اردو دنیا میں ان کی بھرپور عکاسی ہو رہی ہے۔ خبر نامہ زیادہ ذمے دار اور شفاف ہو گیا ہے۔ زبان و تدریس پر مضامین میں اضافہ ہوا ہے جب کہ نقد و تبصرہ میں عرصہ دراز کے بعد ایک اشاعت نو پر تبصرہ شامل ہوا ہے۔ 'فکر و تحقیق' کے سعادت حسن منٹو پر پروفیسر ابن کنول کا مدلل اور مکمل تبصرہ شائع ہوا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ منٹو کی ڈرامہ نگاری کتنی اہم ہے۔ دوسرے اداروں اور دانش گاہوں نے اس پہلو کو نظر انداز کر دیا تھا۔ جناب عبیدالرحمٰن صاحب کا لاجواب بھرپور مضمون 'اب کھل رہے ہیں تخلیق کائنات کے راز' ہے جو اگست کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ پچھلی دو دہائیوں میں سائنس کے موضوع پر عقیدے کی تیز دھار پر صحیح سلامت چلتے ہوئے رواں دواں علمی اردو میں ایسا مضمون نہیں پڑھا۔ عالمی سطح سے ملکی سطح کی دانش گاہوں اور اداروں کی حصے داری اور

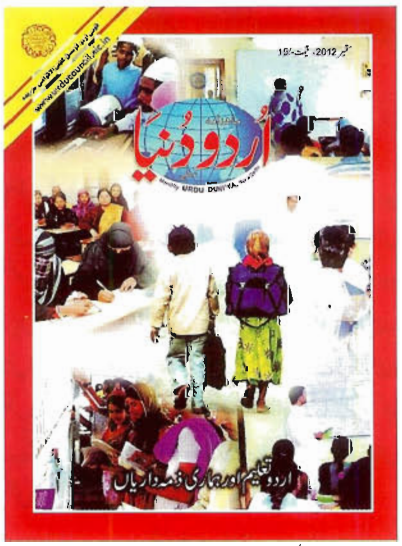

تعاون کو بخوبی دلنشیں انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ جب تک ایسے رسالے اور قلمکار ہیں اردو کا مستقبل تابناک ہے۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

سابق ممبر راجیہ سبھا، نئی دہلی

'اردو دنیا' کا ستمبر 2012 کا شمارہ موصول ہوا۔ یہ شمارہ گراں قدر مضامین کا مجموعہ اور معلومات کا خزانہ ہے۔ (شخصیات) کے تحت کرشن چندر پر مضمون، اردو کی تدریس اور درسی کتابیں، (ادبی مباحث) کے تحت مومن خاں اور قرۃ العین حیدر، نوح ناروی اور (تہذیب و ثقافت) پر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا محققانہ مضمون بہت زیادہ پسند آئے۔ جی یہ چاہتا ہے کہ اردو دنیا کے زیادہ صفحات اردو کے معماروں اور جلیل القدر ادیبوں مثلاً مولانا شبلی، ڈپٹی نذیر احمد، راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی، سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریابادی، قاضی عبدالغفار، عبدالحلیم شرر، مرزا فرحت اللہ بیگ، خواجہ محمد شفیع دہلوی، ڈاکٹر عابد حسین کے لیے وقف ہوں۔

قسیم اختر

امور، پورنیہ، بہار

دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں آپ کا۔ اردو اور اردو بستیوں سے آشنائی آپ کی 'اردو دنیا' نے کرائی ہے۔ میگزین میں شامل کن کن مشمولات، کن کن عنوانات کی تعریف کروں۔ ستمبر کا شمارہ نظر کے سامنے ہے۔ مہاراجکر سنگھ ایشر کا مضمون 'کرشن چندر! تجھے سلام' کیا خوب معلوماتی اور پرمغز مضمون ہے۔ شکر گزار ہوں ایشر صاحب کا بھی کہ کرشن چندر کے بہت سے گوشوں سے انھوں نے پردہ اٹھایا ہے۔ خاص طور پر ناول 'مٹی کے صنم' کے متعلق معلوم ہوا۔

جاوید عالم

192/3، جونا رسالہ، اندور (ایم پی)

'اردو دنیا' ستمبر 12 کا شمارہ معلوماتی ہے۔ شاعر نیرج کے انٹرویو سے ان کے بارے میں کئی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ مضمون 'تہذیب اور ثقافت میں فرق' میں مناظر عاشق ہرگانوی نے ثقافت تہذیب اور تمدن کے انگریزی مترادف بالترتیب culture، civilization اور urban culture دیے ہیں۔ ان کے ساتھ ہندی متبادل جیسے، کلچر کا سنسکرتی اور سولائزیشن کا سبھیتا بھی جوڑے جا سکتے تھے۔ اردو کے ساتھ ہندی الفاظ سے بھی واقفیت رہے تو بہتر ہے۔ 'دوسری زبان سے' کے تحت شائع کہانی 'چمپک درخت' اچھی ہے مگر اس کا کہیں ذکر نہیں کہ اصلاً یہ کہانی کس زبان کی ہے۔

ڈاکٹر رضوانہ ارم

صدر شعبۂ اردو، جمشید پور ویمنس کالج، جمشید پور

'اردو دنیا' ستمبر 2012 اور اس سے قبل کے تمام شمارے بروقت موصول ہو رہے ہیں۔ ہر شمارہ پہلے سے بہتر اور وقت اور تعلیم کے مقتضیات پہ کھرا اتر رہا ہے۔ درس و تدریس سے وابستہ ہونے کی وجہ کو بڑی بے صبری سے 'اردو دنیا' کا انتظار رہتا ہے۔ اردو دنیا ایک ایسا جریدہ

ہے جس کے مطالعے کے دوران ہم منٹوں میں ادب، مسافتیں، ٹیکنالوجی، صحت، مذہب شخصیات ومطبوعات سے متعارف ہوتے جاتے ہیں۔'اردو دنیا' اردو کے قاری کی معلومات میں اضافے کا باعث ہی نہیں بلکہ ذہنی و فکری سیرابی کا بھی وسیلہ ہے۔

مسرت جہاں

ریسرچ اسکالر (اردو)، شعبہ اردو، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

'اردو دنیا' ستمبر 2012 کا شمارہ وقت پہ ملا۔ اداریہ پسند آیا جس میں مدیر خواجہ اکرام الدین صاحب نے اردو کے مدرسین کے متعلق دعوتِ فکر دی ہے کہ ہر سال 5 ستمبر 'یومِ اساتذہ' کے طور پر ایک ملک گیر تہوار منایا جاتا ہے لیکن اردو کی طرف توجہ کسی بھی یوم اساتذہ پر نہیں دی جاتی ہے۔ ادبی مباحث میں پروفیسر مجید بیدار صاحب کا مقالہ 'فن پارے کی ترجمانی کے مختلف انداز' اور محمد عرفان صاحب کی تحریر 'قرۃ العین حیدر عنوانات کے آئینے میں' یہ دونوں مضامین بہت خوب ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر مشمولات بھی اچھے ہیں۔ مثلاً کرشن چندر! تجھے سلام، میں شہر 'پونچھ' کا ذکر ہے۔ پونچھ سے انھیں فطری لگاؤ تھا۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز بھی وہیں سے ہوا۔ یہاں تک کہ 'ناول مٹی کے صنم' میں پونچھ اور اس کے گرد ونواح کا پس منظر پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح کے مضامین سے مختلف شخصیات اور اس کے پس منظر سے آشنائی ہوتی ہے۔

ایم راگھو راؤ

ساؤتھ سول لائسنس، چھندواڑا، مدھیہ پردیش

ستمبر 2012 کا شمارہ نظرنواز ہوا۔ 'اردو دنیا' کی اشاعت اردو زبان کی بہترین خدمت ہے۔ آپ کا اداریہ اس بار بھی غور طلب ہے۔ فاروق ارگلی اور گوپال داس نیرج کے بیچ گفتگو دلچسپ ہے، نیرج ہندی کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے ہندی شاعری کو اردو شاعری کے ڈکشن سے آشنا کرایا۔ کرشن چندر کے افسانوں میں سادگی اور شگفتگی، شادابی اور رعنائی ہے۔ جہاں تک اردو زبان کی تعلیم اور تدریس اور اردو اساتذہ کے مسائل کے سرکاری حل کا تعلق ہے تو اس کا ایک کارگر طریقہ یہ بھی ہے کہ این سی پی یو ایل کو پورے ملک میں اردو تعلیم کی مانیٹرنگ اتھارٹی بنا دیا جائے۔ مومن واردات و کیفیت کے بجائے معاملہ بندی، معنی آفرینی اور نازک خیالی کے شاعر ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے اردو کو جن امکانات، تجربات اور انفرادیت سے آشنا کرایا وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ مہدی نظمی ایک ادیب، شاعر، ممتاز صحافی اور خطیب کی حیثیت سے اردو ادب کی تاریخ میں اپنی ایک انفرادیت رکھتے ہیں، نظمی نے حالات و تجربات کی تلخیوں پر اپنے حسن بیان و دلکش طرز ادا سے اسے پرلطف بنا دیا ہے۔

مست حفیظ رحمانی

صدر 'بزم اردو' سیتاپور، یوپی

'اردو دنیا' پابندی سے مل رہا ہے۔ ستمبر کا شمارہ زیر مطالعہ ہے۔ نیرج کا انٹرویو، اردو تعلیم اور اساتذہ، اردو نصاب، مومن دہلی پر مضامین کافی معلوماتی ہیں۔ ہر طرح سے اردو کی ترقی سے متعلق معلومات فراہم ہو رہی ہیں اور قوی امید ہے کہ اردو کا مستقبل روشن ہے اور یہ روشنی پوری دنیا میں پھیل رہی ہے۔ مایوسی کی کوئی گنجائش اب باقی نہیں ہے۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی

پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج، موڑتاڑ، ضلع نظام آباد (اے پی)

ستمبر کا شمارہ بروقت ملا۔ سرورق پر اردو تعلیم سے متعلق تصاویر شائع ہوئیں لیکن عنوان بھی بہت اہم ہے۔ ہماری بات میں مدیر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے اردو اساتذہ کے مسائل اور ان کی شناخت کی طرف اشارہ کیا ہے، اردو اساتذہ بھی محنت و مشقت سے پڑھاتے ہیں لیکن main stream میں ان کا نام لیوا کوئی نہیں۔ آندھرا پردیش میں 5 ستمبر کو یوم اساتذہ کے موقعے پر بیسٹ ٹیچر ایوارڈ دیے گئے۔ سب کا اعتراف خدمات ہوا لیکن ایک بھی اردو والا بیسٹ ٹیچر ایوارڈ کے لیے منتخب نہیں ہوا حالانکہ بعض اردو ٹیچر محنت سے اپنے فرائض منصبی انجام دیتے ہیں اور نتائج بھی شاندار لاتے ہیں۔ گوپال داس نیرج کی خدمات اعلیٰ وارفع ہیں۔ مومن خاں مومن مضمون معلومات سے پر ہے۔ پروفیسر مجید بیدار کا مضمون فن پارے کی ترجمانی کے مختلف انداز ادبی وفنی معلومات سے مزین ہے۔ قرۃ العین حیدر عنوانات کے آئینہ میں مضمون معلوماتی ہے ان کے افسانے وناول کے عنوانات شعری پیکر وہیئت لیے ہوئے ہیں۔ اردو دنیا کا ہر شمارہ ایک کتاب سے کم نہیں۔ اس میں مختلف ادب کے ساتھ مختلف علوم وفنون کی آمیزش ملتی ہے۔

منصور عثمانی

مہ وانجمن، نئی بستی، مرادآباد

'اردو دنیا' کی شگفتگی اور چمک دمک میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے یہی نہیں اردو کے اس شاندار چراغ کی معنویت ومقصدیت بھی معتبر ہوگئی ہے — یہ کرشمہ ہے محترم وسیم صاحب، خواجہ صاحب اور آپ (اعزازی مدیر) کی نیک نیتی کا۔ کونسل کے لیے آپ حضرات کا ساتھ کسی موسم بہار سے کم نہیں ہے۔ اگست کے شمارے میں وسیم صاحب سے آپ کا انٹرویو ایک یادگار انٹرویو ہے۔ پہلی بار ادب کے تخلیقی گوشہ سے جرأت مندانہ آواز اٹھی ہے کہ ''اردو تنقید نے ادب کے عوامی رشتے پر توجہ نہیں دی'' محترم وسیم صاحب نے اس موضوع پر اتنے ٹھوس دلائل کے ساتھ غالباً پہلی بار تفصیلی گفتگو کی ہے یقین کیجیے وسیم صاحب کے پیچھے پوری تخلیقی کائنات کھڑی ہے۔ وسیم صاحب کے درد کو 'دردِ تنہا' نہ سمجھا جائے مجھے خوشی ہوگی اگر اردو تنقید عہد حاضر کے اس معتبر ترین تخلیق کار کے اٹھائے گئے دیانت دارانہ سوالات پر سنجیدگی سے غور کرے اور اپنا رویہ بدلے۔ میں آپ کو بھی مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ آپ کے دانشمندانہ سوالات نے ایک مفکر کے درد کو چھلک پڑنے پر مجبور کر دیا۔ المختصر، اردو والوں کے لیے یہ انٹرویو 'ظہیریت' اور 'وسیمیت' کا ایک خوبصورت فکری اور معنوی امتزاج ہے۔ شمارے کے دیگر مشمولات بھی لائق تحسین ہیں۔ یقین کامل ہے کہ 'اردو دنیا' کا معیاری سفر یونہی جاری رہے گا۔

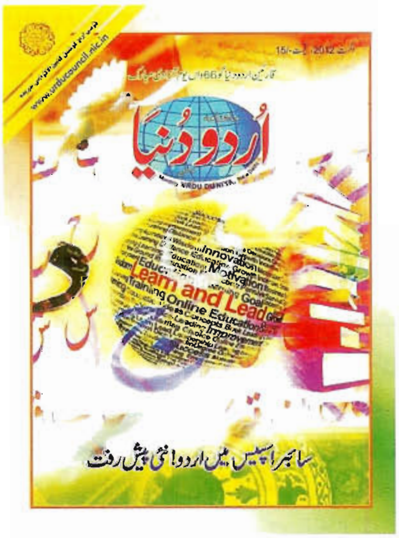

ڈاکٹر محمد اعجاز

رجسٹرار، ادارہ تحقیقات عربی وفارسی، پٹنہ (حکومت بہار)

'اردو دنیا' ماہ اگست 2012 سامنے ہے۔ بہت خوبصورت رسالہ ہے۔ اس میں شامل بیشتر مضامین بے حد اہم اور معلومات سے بھرپور ہیں۔ گوالیار ایک تعارف، مولانا آزاد وغیرہ مضامین نے متاثر کیا۔ نواب واجد علی شاہ عروج و زوال تاریخ اودھ کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ آن لائن میڈیا کا تصور اور اردو بہت خوب ہے۔ اداریہ کافی پسند آیا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو دنیا بہت خوبصورت اور پرمغز رسالہ ہے جو آپ کی سرپرستی میں خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔

عبدالحق بیتاب

جولاساہی، کولکاتہ

'اردو دنیا' کا شمارہ اردو کے مؤقر رسائل میں ہوتا ہے۔ اس کے مشمولات متنوع اور بہت ہی جامع ہوتے ہیں۔ لیکن سعید رحمانی صاحب کا مضمون 'اڑیسہ میں اردو' (مطبوعہ اگست 2012) تحقیقی نقطۂ نظر سے نہایت کمزور ہے۔ موصوف لکھتے ہیں کہ اڑیسہ میں اردو زبان کی ابتدا مغلوں کی آمد سے ہوئی جب کہ ان سے بہت پہلے فیروز شاہ تغلق کے عہد حکومت میں اردو یہاں پہنچ چکی تھی اور یہاں کی اڑیا زبان پر اثر انداز ہو چکی تھی۔ تفصیلات کے لیے ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری کی کتاب 'اڑیسہ میں اردو' (مطبوعہ 2001، ناشر NCPUL) کے بابِ اول سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ موصوف نے جن ہندو شائقین ادب مثلاً لالہ ہردے جی اور شری جگ موہن دیو کو اردو و فارسی کے جید عالم کے طور پر پیش کیا ہے وہ سراسر غلط ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے اپنے مضمون میں لالہ ہردے جی اور ہردے رام جودے کو اس انداز سے پیش کیا ہے جیسے یہ دو الگ ہستیاں ہی۔ اس سلسلے میں جناب خاور نقیب کا تحقیقی مضمون 'اڑیسہ میں اردو شاعری کا نقطۂ آغاز' (مطبوعہ ترویج شمارہ 14، ستمبر 2008) خاصی اہمیت کا حامل ہے جس میں انھوں نے 'تذکرۂ شورش' مؤلفہ سید غلام حسین شورش سے 'تاریخ ادب ہندوستانی' مؤلفہ گارسین دتاسی تک کئی قدیم تذکروں کے حوالے جات پیش کیے ہیں جہاں تک شری جگ موہن دیو کا تعلق ہے وہ اردو و فارسی کے قدرداں ضرور رہے ہوں گے لیکن انھیں ان دو زبانوں کا عالم و فاضل قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ دراصل 'فرہنگِ جانی' (فارسی) کے مؤلف جان خاں صدیقی نے اپنی اس تالیف کو شری جگموہن دیو کے نام معنون کیا تھا لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جگ موہن دیو فارسی اور اردو کے ایک جید عالم بھی تھے۔ اسی طرح مضمون میں جن اخبار و رسائل کے نام درج کیے ہیں وہ اپنی جگہ درست سہی لیکن جنابِ رحمانی نے دیدہ و دانستہ یا سہواً شاخسار، روزن، فروغِ ادب، نئی شناخت جیسے رسائل کو اپنی فہرست سے یکسر خارج کردیا ہے۔

سید مرتضیٰ حسین بلگرامی

فاطمہ منزل ڈگی روڈ، علی گڑھ

'اردو دنیا' جو قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ ہے اس کے شمارے لائق اعتبار و لائق حفاظت ہیں۔ وہ لائق تعریف و توصیف ہیں۔ مضامین کے اعتبار سے بھی، اور افادیت کے طور سے بھی مثلاً شمارہ نمبر 14 جولائی 2012 کا ہے، اس میں ابن صفی پر صفحہ 25 سے 36 تک طویل معلوماتی مضامین اور ان کے کلام کا انتخاب مندرج ہے۔ میری نظر

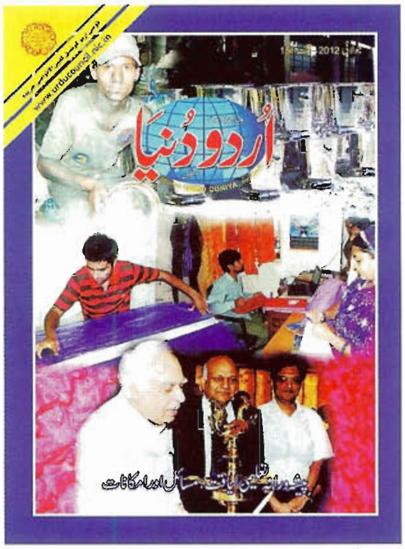

میں پہلی بار یہ منظرنامہ آیا ہے ورنہ مجھے اچھی طرح یاد ہے بلکہ اس زمانے کے کسی مضمون میں لکھا بھی تھا "قاضی عبدالودود صاحب نے ابن صفی کے ناول کو تضیع اوقات اور سفر میں اسے بس سطحی طور پر پڑھنے کا خیال ظاہر کیا تھا اور یہ بھی فرمایا تھا اسے ادب کی کسی صنف میں، خصوصی طور پر ناول کی صنف میں رکھنا، غیرادبی بات ہوگی۔" ہم قاضی صاحب کی اس بات سے اتفاق کریں یا نہ کریں، مگر آپ نے ابن صفی کو اس شمارے کے واسطہ سے دوامی ادیب بنا دیا ہے۔

سید اختر علی (اختر صادق)

101 بی، نمبر 7، لیبر کالونی، ناندیڑ (مہاراشٹر)

NCPUL کی ویب سائٹ کے ذریعے آپ کا ماہنامہ 'اردو دنیا' اور سہ ماہی 'فکر و تحقیق' باصرہ نواز ہوا۔ پہلے کے ویب پیج اور اب کے ویب پیج میں کافی فرق ہے۔ لیکن یہ فرق اب آسانی لیے ہوئے ہے۔ پہلے میگزین آسانی سے نہیں پڑھے جاسکتے تھے۔ صفحات کھولنے اور پڑھنے میں بہت دشواری تھی۔ اب کافی آسانی ہے۔ اس سہولت کے لیے آپ، آپ کی ٹیم اور حکومتِ ہند سب مبارکباد کے مستحق ہیں۔ مارچ 2012 کے 'اردو دنیا' کے شمارے میں 'صحافت' کے تحت صفحہ 54 پر جناب غضنفر اقبال صاحب، گلبرگہ (کرناٹک) کا ایک فکر انگیز مضمون 'ملاقات نگاری: ایک ادبی صنف!' پڑھنے میں آیا۔ موصوف نے اس مضمون کو بڑی عرق ریزی سے لکھا ہے۔ آپ نے لکھا کہ 1) ملاقات نگاری مغرب کی پیداوار ہے 2) انٹرویو اپنے اندر کئی جہان رکھتا ہے اور اس کا جہان، جہانِ دیگر ہے 3) انٹرویو کی حیثیت دستاویز کی ہے۔ انٹرویو کے تعلق سے ایسی ہی اور کئی اہم باتیں آپ نے اپنے اس مضمون میں لکھی ہیں۔

زبیر احمد بھاگلپوری

اردو شعبہ، بہار قانون ساز کونسل، پٹنہ

'اردو دنیا' نے بین الاقوامی رسالے کا معیار حاصل کرلیا ہے۔ اس کے محتویات کی رنگارنگی 'مکسڈ جیم' کی صورت مختلف علوم و فنون کا ذائقہ قارئین کو بہم پہنچائی ہے۔ چونکہ 'اردو دنیا' کا ارتقائی سفر مزید کئی سنگ میل طے کرنے میں کامیاب ہوگا۔ طلبہ کے لیے 'کیریئر کالم' کے تحت مسابقتی مقالے از سر نو شائع ہونے لگے ہیں جو ایک خوش آئند بات ہے۔

حسرت شادانی

کالی باغ، بتیا، چمپارن

'اردو دنیا' عرصے سے پڑھتا رہا ہوں جب اس کی قیمت دس روپیہ تھی اور بھٹ صاحب ایڈیٹر تھے حالانکہ بھٹ صاحب کی ادارت میں ہی اس کی قیمت بڑھی اور رونق بھی۔ اپنی محنت اور سعیِ کامل سے انھوں نے اردو دنیا کو اوجِ ترقی تک پہنچایا۔ وہ بھی قابلِ صد مبارکباد اور

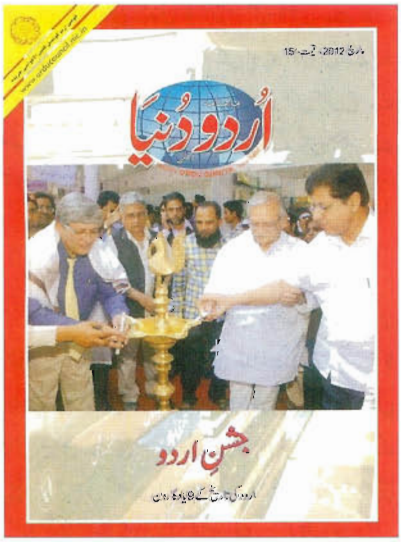

شکریہ کے مستحق ہیں۔ اس طرح میں آپ کا بھی صدق دل سے اردو دنیا کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے خیرمقدم کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ بھی 'اردو دنیا' کو اونچا اور اونچا لے جائیں گے۔ اَب رہی بات 2012 سال کی جس میں ابتدا سے ہی ملک کے نامور ادبا و شعرا اس دنیا سے رخصت ہوگئے آپ نے مارچ 2012 کے شمارے کو جناب شجاع خاور، مظہر امام، ورما صاحب اور شہریار صاحب کے نام خراجِ عقیدت کا دستاویزی یادگار ان کی یادیں، باتیں اور بولتی ہوئی تصویریں عرصہ تک یادگار بنی رہیں گی۔

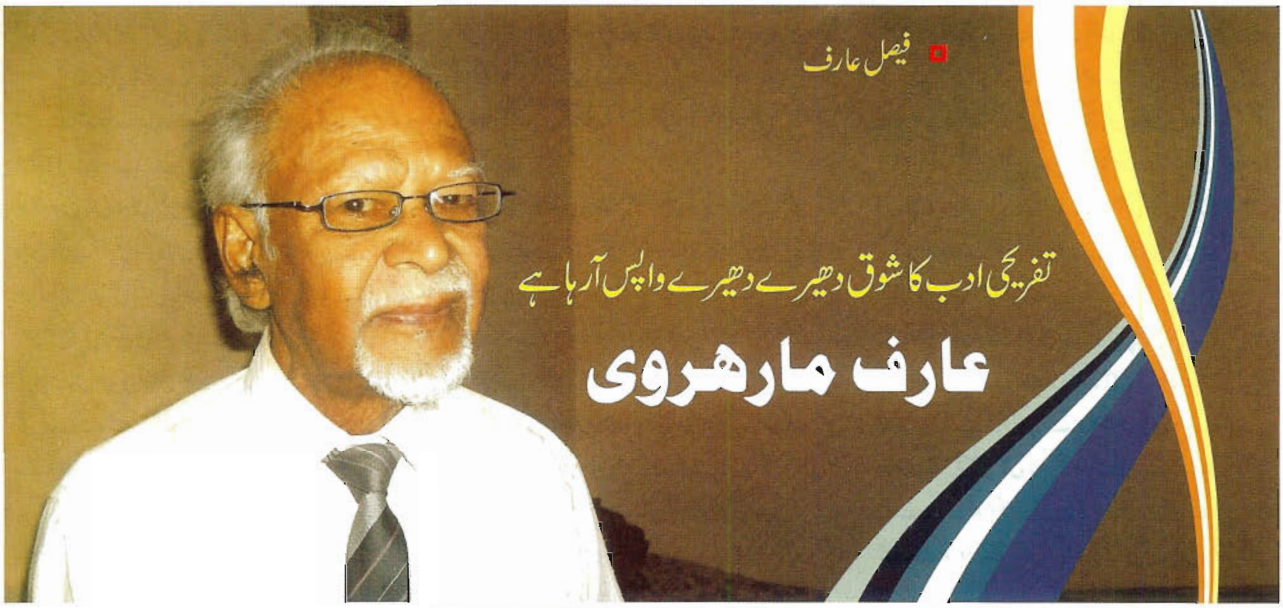

فیصل عارف

تفریحی ادب کا شوق دھیرے دھیرے واپس آرہا ہے

عارف مارہروی

اب سے کوئی نصف صدی پہلے جب اردو پڑھنے والوں میں گلشن نندہ، عادل رشید، دت بھارتی، ابن صفی، اکرم الہ آبادی، اظہار اثر کی سماجی، رومانی اور جاسوسی فکشن نگاری کو قبولیت عامہ حاصل تھی، تو ان ہی دنوں ایک نئے نام نے سب کو چونکا دیا تھا۔ یہ تھے عارف مارہروی جو اَب ستّر برس سے اوپر کے ہوچکے ہیں اور ان دنوں علی گڑھ میں اپنے ماضی کے برعکس خاصی گم نام سی زندگی گزار رہے ہیں۔ عارف مارہروی کی کہانیوں میں بلا کا کہانی پن تھا اور وہ اپنی قوت متخیلہ سے کہانیوں میں اچانک ایسے ڈرامائی موڑ پیدا کردیتے تھے کہ پڑھنے والا ان میں گم ہو کر رہ جاتا۔ عارف صاحب نے جاسوسی ناول لکھے تو ان میں بھی انھوں نے ابن صفی کے کرداروں کی نقل کرکے کام نہیں چلایا بلکہ ان کہانیوں میں سماجی موضوعات کو بھی جگہ دی ۔ یہی نہیں انھوں نے ہیڈ کانسٹبل افسر اور اس کی غریب محبوبہ نازش کی ایک ایسی جوڑی سے بھی متعارف کرایا جو اردو جاسوسی ناولوں کے لیے ایک نئی چیز تھی۔ اس سیریز میں جرم کی تفتیش کرنے والا پولیس آفیسر شاندار شیور لے یا امپالا گاڑیوں میں بدمعاشوں کا تعاقب نہیں کرتا تھا، نائٹ کلبوں میں ڈانس فلور پر حسینائوں کا ہم رقص نہیں بنتا تھا۔ افسر، اپنی بائیسکل پر بدمعاشوں کا پیچھا کرتا تھا، چائے خانوں میں بیٹھتا تھا اور آخر کار مجرم کو پکڑنے میں کامیاب ہوتا تھا۔ جب تک اردو میں مقبول عام فکشن لکھا جاتا رہا عارف مارہروی ہر مہینے کم از کم دو ناول تحریر کرتے رہے ۔ لیکن جب اردو پڑھنے والوں کی تعداد گھٹی تو انھیں معاش کے لیے ہندی کا رخ کرنا پڑا۔ ہندی میں انھوں نے 'راج ونش' کے نام سے لکھنا شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ نام ہندی میں ہر طرف چھا گیا۔ ان کے ناولوں کی تعداد اشاعت ایک لاکھ سے اوپر پہنچ گئی۔ اس کے بعد لالچی پبلشروں نے 'راج ونش' کو ایک ٹریڈ مارک اور گھوسٹ رائٹر ghost writer بنا ڈالا اور انھیں ان کے حق سے محروم کر دیا۔ وہ پبلشر مافیاکی اس یلغار کا مقابلہ نہ کر سکے، اور'راج ونش' کی چکا چوند میں عارف مارہروی کہیں گم ہو کر رہ گیا۔تاہم یہ نام اردو کے'پاپولر لٹریچر' کی ان اہم شخصیتوں میں ہمیشہ شامل رہے گا جنھوں نے اردو اور اس کے تخلیقی ادب کا رشتہ عام قاری سے جوڑے رکھااور جنھیں پڑھ پڑھ کر نہ جانے کتنے لوگوں نے اردو لکھنا سیکھا ہوگا۔ پیش خدمت ہیں عارف مارہروی سے 'اردو دنیا' کے لیے کئے گئے ایک خاص انٹرویو کے اہم اقتباسات جو ان کے فرزند فیصل عارف نے کیا ہے۔ ادارہ

فیصل عارف: آپ کا قلمی نام عارف مارہروی ہے اور سکونت علی گڑھ میں ہی مستقل چلی آ رہی ہے۔ مارہرہ سے آپ کا کیا تعلق ہے؟

عارف مارہروی: میرے آبا و اجداد کا وطن مارہرہ شریف تھا۔ ملازمت کے سلسلے میں میرے والد صاحب محمد ابن حسن علی گڑھ آ گئے۔ تب میں پیدا ہونے والا تھا۔ میری پیدائش علی گڑھ میں ہوئی۔ 31 دسمبر 1944 کو۔ میرا نام محمد عارف حسن رکھا گیا۔ قلم کار بنتے وقت میں نے اپنا نام عارف مارہروی رکھ لیا۔

سوال: اپنی تعلیم کے بارے میں کچھ بتائیے؟

جواب: علی گڑھ کے سٹی ہائی اسکول سے تعلیم شروع ہوئی تھی۔ ہائی اسکول کیا۔ فرسٹ ایئر، سیکنڈر ایئر میں پڑھا تب تک میں مکمل قلم کار بن چکا تھا۔ فرصت ملنا مشکل تھی۔ اس لیے آگے نہیں پڑھ پایا۔ میرے پسندیدہ مضامین علم نفسیات اور پالی ٹکس تھے۔

سوال: آپ کی پہلی تخلیق کون سی تھی؟ کب اور کہاں شائع ہوئی؟

جواب: میری پہلی کہانی 'سیاہ پنجہ' کے نام سے دہلی کے فلم آرٹ ویکلی میں 1954 میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد بچوں کی کہانیاں کھلونا، سہیلیاں اور پھول وغیرہ میں شائع ہوئیں۔ افسانے شمع، تلاش، فلم آرٹ ویکلی، تبسم، جام نو (کراچی) شگوفہ وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔ پہلا جاوسی ناول 'بے قصور مجرم' روبی ڈائجسٹ' نے شائع کیا۔ پہلا رومانی ناول 'یادوں کے سائے'، چمن بکڈ پو سے شائع ہوکر بہت مقبول ہوا۔ پھر ناولوں کا سلسلہ بند ہو گیا۔ میرے اہم ناولوں میں 'یادوں کے سائے'،

'روح کے زخم' اور 'پنکھڑیاں' شمار ہوتے ہیں۔

اسٹار پبلی کیشنز نے مجھے ہندی میں 'راج ونش' کے نام سے متعارف کرایا۔ اس نام کو اتنی شہرت ملی کہ میرا شمار 1974 کے سب سے زیادہ فروخت ہونے والے تین قلمکاروں میں ہوا۔ گلشن نندہ، دینا ناتھ دنکر اور ناقد و مفکر راج ونش۔ ہم تینوں کو اس وقت کے ہندوستان کے نائب صدر آنریبل جی ایس پاٹھک کے ہاتھوں ایوارڈ ملنے تھے مگر میں اپنی بمبئی کی مصروفیات سے وقت نکال کر دلی نہیں آپایا۔ ہاں میری ٹرافی ضرور مجھے مل گئی۔ اس کے علاوہ علی گڑھ کے جیسیز کلب نے مجھے ڈی ایم ایس سی جین کے ہاتھوں ایوارڈ دلوایا۔

فلمی دنیا میں مجھے پہلی بار ایس ڈی نارنگ نے بلا کر سائن کیا۔ اس کے بعد کئی فلم سازوں نے میری کہانیاں خریدیں۔ 'سرکشا'، 'رفتار'، 'اجالا ہی اجالا'، 'لال چڑیا'، 'سگندھ' اور 'بابی' جیسی فلموں کی کہانیاں لکھیں۔ مگر میرا مزاج فلمی دنیا سے ہم آہنگ نہ ہوسکا۔ میں فلمی دنیا چھوڑ کر واپس ادبی دنیا میں آ گیا۔

سوال: آپ کے پسندیدہ شاعر اور ادیب کون تھے اور آپ انھیں کیوں پسند کرتے تھے؟

جواب: شاعروں میں مجھے میرتقی میر پسند تھے۔ ان کی حزنیہ سادگی میرے شاعر دل میں اتر جاتی تھی۔ غالب تو بین الاقوامی پسند کے شاعر تھے۔ نئے دور کے شاعروں میں مجھے مختار ہاشمی، احمد محی الدین عرشی اور جمنا داس راہی پسند تھے۔ میں بھی شاعر ہوں۔ مختار ہاشمی مرحوم میرے استاد رہے ہیں— ادیبوں میں مجھے کرشن چندر جی اس لیے پسند تھے کہ ان کی تحریروں میں سماج کا جو آپریشن ہوتا تھا وہ بہت کم ادیبوں میں پایا جاتا ہے۔ دوسری طرف جاسوسی ناول نگاروں میں میری پہلی پسند محترم ابن صفی تھے جو میرے غائبانہ استاد بھی تھے۔ انھی سے متاثر ہوکر میں اپنے جاسوسی ناولوں کے کرداروں کی تخلیق کی تھی جن میں قیصر حیات نکھٹو بہت زیادہ مقبول ہوا تھا۔ ابن صفی صاحب کے انتقال کے بعد عباسی حسینی صاحب نے مجھے الہ آباد بلایا تھا۔ میرے اعزاز میں پریس کانفرنس بھی کی اور مجھے عمران سیریز لکھنے کی پیش کش کی گئی۔ بلکہ وہ چاہتے تھے کہ میں عمران سیریز ابن صفی صاحب کے نام سے لکھوں۔ اس لیے بات وہیں ختم ہوگئی۔ جاسوسی روپ میں میرے دو ناول 'پانچ بڑے' اور 'باولا' اپنی سماجیت، ادبیت اور انفرادیت کے لیے اتنے مقبول ہوئے کہ مشہور تنقید نگار تک ان کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اکرم الہ بادی کی سیاسی مصروفیات کے سبب جاسوسی پنجہ مجھے لکھنے کو ملا۔ جسے میں نے بیس سال تک لکھا۔

سوال: ناول نگاری اور وہ بھی جاسوسی ناول کی طرف آپ کیسے آئے؟

جواب: جاسوسی ناولوں کا شوق تو مجھے طالب علمی کے زمانے سے ہی تھا۔ منشی تیرتھ رام فیروز پوری اور ندیم صہبائی فیروز پوری کو بہت پڑھتا تھا۔ بعد میں جب ابن صفی صاحب کو پڑھا تو میں ان کا دیوانہ ہوگیا۔ لکھنے کے جراثیم قدرتی تھے۔ اس لیے لکھنا بھی شروع کر دیا اور ایسا اور اتنا لکھا کہ ہندوستان، پاکستان اور جن ممالک میں اردو داں اور ہندی داں موجود تھے ان سب کا مقبول قلم کار بن گیا۔ جاسوسی روپ میں تو اللہ تعالیٰ کے کرم سے مجھے ملکہ حاصل ہوا ہی۔ رومانی اور سماجی ناولوں میں بھی میں نے برابر کی مقبولیت حاصل کی۔

سوال: ہندی میں راج ونش کے نام سے لکھنے کی وجہ کیا ہے؟ گھوسٹ رائٹنگ کے لیے آپ نے خود کو کیسے آمادہ کر لیا؟

جواب: اردو میں عارف مارہروی کے بعد ہندی میں راج ونش کے نام سے بھی میں نے برابر کی مقبولیت حاصل کی اور یہ گھوسٹ رائٹنگ نہیں تھی۔ 'راج ونش' میرا ایک قلمی نام تھا۔ فلموں کی پبلسٹی میں میرے فوٹو راج ونش کے نام سے شائع ہوتے تھے اور کہانیوں کے معاہدے میں راج ونش کے نام سے کرتا تھا۔

سوال: مگر بعد میں تو پبلشرز نے اس نام کو اپنا ٹریڈ مارک بنالیا تھا؟

جواب: کچھ تجارتی مصلحتوں کی بنا پر ان لوگوں نے یہ قدم اٹھایا تھا جس کا نقصان مجھے بہت زیادہ بھگتنا پڑا۔ اِس تفصیل کے لیے ایک الگ انٹرویو کی ضرورت ہے۔

سوال: راج ونش عارف مارہروی سے بھی زیادہ مقبول ہوا اس کی وجہ کیا ہے؟

جواب: اِس نام سے میں نے بہت اچھے ناول لکھے تھے۔ اچھوتوں کے مسئلے پر کوٹھے والیوں کے مسئلے پر۔ سماج کے اور بھی بہت سارے مسائل پر میں نے لکھا تھا۔ یوں تو پبلسٹی کے بل پر گھاس کوڑا تک بک جاتا ہے مگر دیرپا مقبولیت کے لیے مضامین اور تحریروں میں بھی کچھ دم ہونا چاہیے۔

سوال: آپ صرف تفریحی یا مقبول عام ادب ہی تخلیق کرتے رہے۔ آزادانہ فکشن نگاری افسانہ نگاری کی طرف کیوں نہیں آئے؟

جواب: میں نے بے شک عوامی تفریحی ادب بہت تخلیق کیا ہے مگر جہاں تک افسانہ نگاری کا تعلق ہے میرے ادبی سفر کا آغاز ہی افسانہ نگاری سے ہوا ہے۔ 'لکیروں کا کھیل' (علی گڑھ میگزین) نے، 'اور کہانی ختم ہوگئی' (ماہنامہ تلاش، مدیر وشوا ناتھ درد) 'پرانی میز' اور اس جیسے بہت سارے افسانے خالص ادبی افسانے ہیں جنھیں اردو کے تنقید نگاروں نے مجھے جاسوسی ناول نگار سمجھ کر نظر انداز کیا تھا۔

سوال: اردو بلکہ ہندی کے بھی پاپولر لٹریچر نے بھی دم توڑ دیا ہے۔ آپ کے نزدیک اس کی وجہ کیا ہے۔ کیا صرف اس لیے کہ لوگوں نے پڑھنا ہی چھوڑ دیا ہے؟

جواب: اصل میں ہمارے نوجوانی کے دور میں صرف بڑے بڑے گھرانوں میں ریڈیو ہوا کرتے تھے۔ بڑے طبقے کے گھروں میں خواتین اور نوجوان کہانیوں، افسانوں یا ناولوں سے دل بہلاتے تھے 'شمع'، 'سشما'، 'خاتونِ مشرق'، 'کھلونا'، 'کلیاں'، 'پھول'، 'تلاش'، 'دین دنیا' جیسے رسائل گھروں میں آتے تھے۔ ناول نگاروں میں اے آر خاتون، فیاض علی ایڈووکیٹ جیسے ادیبوں کے ناول بڑے ذوق وشوق سے پڑھے جاتے تھے۔ جاوسی ناولوں کے شوقین منشی تیرتھ رام فیروز پوری، ندیم صہبائی فیروز پوری کے ترجے پڑھتے تھے بعد میں ان کی جگہ ابن صفی، اکرم الہ آبادی، اظہار اثر، عارف مارہروی، مسعود جاوید جیسے ناول نگاروں کو پڑھا جانے لگا۔

مگر اس کے بعد ٹی وی کی آمد نے پڑھنے کے شوق کو ختم کر دیا۔ پہلے ٹی وی پر بھی خبریں، ہفتہ میں ایک فلم، سا پتا ہکی 'پھول کھلے ہیں گلشن گلشن' جیسے پروگرام آتے تھے۔ اب تو ہزاروں چینل ہیں۔ ہر چینل پہ سیریلوں کی بھرمار ہے۔ دن بھر کسی نہ کسی چینل پر فلمیں ہی آتی رہتی ہیں۔ ایسے میں گھروں میں فالتو وقت گزارنے کے لیے ناول یا رسائل پڑھنے کی فرصت ہی کس کے پاس ہے؟ آج تو میرا تین سال کا پوتا ریموٹ سے ٹی وی کھول کر 'ڈورے مون' دیکھتا ہے۔ ویسے اب ٹی وی پروگراموں کی یکسانیت اور سیریل میں ایک ہی جیسی کہانی، ایک ہی جیسے کرداروں نے ناظرین کو بیزار کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور ایک بار پھر دھیرے دھیرے لوگوں کی رغبت رسائل اور ناولوں کی طرف بڑھنے لگی ہے۔

سوال: آپ کے جاسوسی ناولوں میں ہی سماجی رنگ حاوی ہوتا تھا۔ ابن صفی اور اظہار اثر کے کرداروں سے الگ طرح کے کردار بھی آپ نے تخلیق کیے جیسے افسر، نازش، یہ تحریک آپ کو کہاں سے ملی؟

جواب: میرے خالو علی بہادر خان ایک کانسٹبل تھے۔

وہ زیادہ تر سائیکل پر گھومتے تھے۔ مین پوری کے گولا بازار میں ان کی پوسٹنگ تھی۔ ایک بار انھوں نے سادہ کپڑے پہن کر سائیکل پر ایک مشتبہ چور کا پیچھا کیا اور اسے چوری کا زیور فروخت کرتے رنگے ہاتھوں پکڑا۔ چور نے بھاگنے کی کوشش کی مار پیٹ بھی ہوئی مگر خالو میاں اسے پبلک کی مدد سے باندھ کر تھانے لانے میں کامیاب ہوگئے۔ تب مجھے خیال آیا کہ جو کام کرنل فریدی یا میجر نیازی کر سکتے ہیں وہ ایک کانسٹبل کیوں نہیں کر سکتا۔ بس تبھی میں نے افسر نام کا کردار تخلیق کیا اور دل چسپی کے لیے ان کے ساتھ نازش کو ڈالا۔

’جاسوسی پنجہ‘ والوں کے لیے میں انسپکٹر گریش کے نام سے بھی لکھ چکا ہوں۔ اس میں میرا کردار انسپکٹر ونے کمار مہرہ تھا۔ بلکہ اس کی تخلیق میں نے ’حاتم طائی‘ سے متاثر ہو کر کی تھی۔

سوال: اردو میں اب ابن صفی کی طرف لوگوں کا دھیان جانے لگا ہے۔ مظہر الحق علوی کے ترجمے بھی چھپ رہے ہیں۔ اس نئے رجحان پر آپ کی رائے بیکار ہے؟

جواب: فطری طور پر آدمی یکسانیت پسند نہیں ہے۔ ایک ہی طرح کے تفریحی مشاغل سے اب لوگ اکتا چکے ہیں۔ جس طرح تیس چالیس سال بعد کپڑوں کا پرانا فیشن لوٹ کر آتا ہے۔ اسی طرح پرانا شوق و ذوق لوگوں کے ذہنوں میں پھر سے لوٹ رہا ہے۔ ویسے بھی تحریری میراث ایسی چیز ہے جس کی کتنی ہی ناقدری کی جائے اس کی قدر کبھی ختم نہیں ہوتی اور ایک نہ ایک دن اس کی قدر پھر سے تازہ ہو جاتی ہے۔

سوال: آج کل آپ کی مصروفیات و مشاغل کیا ہیں؟

جواب: میں کبھی بیکار نہیں بیٹھا۔ ایوانِ اردو، پروازِ ادب، شاندار، اظہارِ خیال جیسے رسائل میں افسانے لکھتا رہتا ہوں۔ ’امنگ‘ میں بچوں کی نظمیں برابر آتی ہیں۔ اکثر شعری نشستوں میں بلایا جاتا ہوں اور کچھ سال پہلے دہلی کے ایک پروڈیوسر کبیر صدیقی کے لیے ایک سیریل ’سب سے بڑا روپیا‘ کے کچھ ایپی سوڈ بھی لکھے تھے۔ باقی وقت اپنے اہل خاندان کے ساتھ گزارتا ہوں۔

سوال: اپنے اہل خاندان کے متعلق کچھ بتائیے۔

جواب: لگ بھگ پچاس سال پہلے میری شادی میری پھوپھی کی لڑکی ’ناظمہ خانم‘ سے ہوئی تھی۔ گھریلو پڑھی لکھی، نیک اور خوبصورت خاتون ہیں۔ میرا ذہن سمجھتی ہیں۔ اکثر میں اپنی کہانیوں کے پلاٹ انھیں سناتا ہوں۔ ان سے Discuss کرتا ہوں۔ کبھی کبھی وہ بہت اچھے Suggestions دیتی ہیں۔ اب تک ہم لوگوں نے زندگی کی پچاس بہاریں ساتھ گزاری ہیں۔

ہمارے سات بچے ہوئے تھے۔ جن میں دو بیٹے، دو بیٹیاں حیات ہیں۔ بڑی بیٹی شبانہ یونیورسٹی سے بی اے کر رہی تھیں۔ درمیان میں ہی ان کی شادی کر دی گئی۔ لڑکے پیدا ہوئے۔ تیسرے لڑکے کی پیدائش کے وقت اس کا انتقال ہو گیا۔ تیسرا بیٹا بھی فوت ہو گیا۔ داماد بھی ایک حادثے میں انتقال کر گئے۔ اس کے دو بیٹے، ہمارے دو نواسے ماشاء اللہ حیات ہیں۔ میرا بڑا نواسہ محمد کامران خان دہلی میں اچھی جگہ ملازم ہے۔ چھوٹا نواسہ محمد فیضان خان علی گڑھ میں ایک پلے اسکول چلاتا ہے ہیزل وڈ نام کا، بہت اچھا ہے۔

بڑے لڑکے ندیم عارف یونیورسٹی کے زیولوجی ڈیپارٹمنٹ میں ملازم ہیں۔ ان کی اہلیہ فوزیہ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ہی ایم اے (اردو) کیا ہے۔ اس کے بعد والی لڑکی ہما نے پولی ٹیکنک سے آفس اسسٹنٹ کا کورس کیا ہے۔ شادی ہو گئی ہے۔ داماد شمیم احمد کا اپنا بزنس ہے۔ اس لیے ہما ملازمت نہیں کرتی۔ ایک خوبصورت نواسی ہے جو چار سال کی عمر میں پوری پوری آیۃ الکرسی پڑھتی ہے اور بھی آیتیں یاد ہیں۔ انگلش میڈیم اسکول میں پڑھ رہی ہے۔ اس سے چھوٹی بیٹی عطیہ عارف ہے۔ اس نے یونیورسٹی سے بی ایس سی کیا ہے۔ اب مائیکرو بایولوجی میں ملازم ہے۔ اس کے شوہر عرب میں رہتے ہیں۔ ایک سات سالہ نواسہ حذیفہ عامر ہے جو البرکات میں پڑھتا ہے۔ بہت ذہین اور اسمارٹ ہے۔ چھوٹے لڑکے فیصل عارف البرکات میں لائبریری میں ہیں۔ ان کی اہلیہ سلمہ بی اے پاس ہیں۔ ایک اسکول میں ٹیچر ہیں۔ ایک خوبصورت ڈھائی سالہ پوتا ہے جو ابھی سے کلمہ، آیتیں وغیرہ پڑھتا ہے۔ میری چھوٹی بہو سلمہ عصر و مغرب کے درمیان میں گھر میں سب کو بٹھا کر حدیث سناتی ہیں۔ رات میں ہم سب لوگ مل کر ٹی وی پروگرام دیکھتے ہیں۔ قریبی عزیزوں میں ایک بیوہ بہن اور ایک بھائی آصف حسن ہیں جو ٹرانسپورٹر ہیں۔ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔

سوال: آپ کا حلقۂ احباب؟

جواب: میرے احباب میں ایک معزز ہستی اور مشہور و معروف افسانہ نگار سید محمد اشرف صاحب ہیں جو میرے محسن بھی ہیں۔ بشارت احمد (سابق ڈائریکٹر دوردرشن دہلی)، انیس مرزا، فاروق ارگلی، ڈاکٹر شکیل الرحمٰن اور ایک شاعر دوست حفیظ ہیں جن کا تخلص مرحوم ہے لیکن وہ بفضل خدا حیات ہیں۔ ’راشٹریہ سہارا‘ کے محمد احمد شیون ہیں، شاعر جمنا پرساد راہی اور ’احساس‘ کے ارشد غازی صاحب بھی میرے دوستوں میں ہیں۔

■

Faisa Arif 'Albarkaat', Anoop Shahar Road, Aligarh - 202002

عارف مارہروی

اصل نام: محمد عارف حسن

قلمی نام: عارف مارہروی اور راج ونش (ہندی)

پیدائش: 31 دسمبر 1942، علی گڑھ

والد: محمد ابن حسن مارہروی

ابتدائی تعلیم: سٹی ہائی اسکول علی گڑھ، انٹرمیڈیٹ علم نفسیات کے ساتھ

شوق: شاعری، مطالعہ

تصانیف: اردو اور ہندی میں سیکڑوں رومانی، جاسوسی ناول اور افسانے

فلم: ● ناول ’ایک کانٹا ایک پھول‘ کی کہانی کا سرقہ کر کے فلم ’جینے کی راہ‘ بنی جس پر مقدمہ کے بعد پرساد پروڈکشن نے مصالحت کر کے ایک ناول ’سہارا‘ فلمانے کے لیے خریدا ● 1969 میں فلم ساز ایس ڈی نارنگ نے ممبئی بلا لیا اور ناول ’کٹھ پتلی‘، سائن کیا۔ دو ناول ’دیوار‘ اور ’کامنی‘ محبوب فلم کمبائن نے سائن کیے۔ روپی نگاچ نے ان کی کہانیوں پر دو فلمیں ’سرکشا‘ اور ’سگندھ‘ بنائیں۔ شیبو وسانی نے فلم ’رفتار‘ بنائی۔ ناول ’نشانہ‘ پر روپی رہن نے ’پاپی‘ ادھیکار انٹرنیشنل نے ’اجالا ہی اجالا‘ بنائیں۔ ’حالات‘، ’گناہ‘، ’ملاقات‘، ’من کی بات‘ اور ’امنگ‘ نامکمل رہ گئیں۔

اعزاز: ● 1974 میں نائب صدر جمہوریہ جی ایس پاٹھک کے ہاتھوں گلشن نندہ و دینا ناتھ دنکر کے ساتھ ’راج ونش‘ کے نام پر ایوارڈ ملنے والا تھا مگر پبلشروں نے انھیں سامنے لانا مناسب نہیں سمجھا اور ایوارڈ گھر پہنچایا۔ ● 1971 میں ’جے سیز‘ کلب علی گڑھ نے ’راج ونش‘ کے نام سے ٹرافی دی۔

رابطہ: البرکات، انوپ شہر روڈ، علی گڑھ

شخصیت

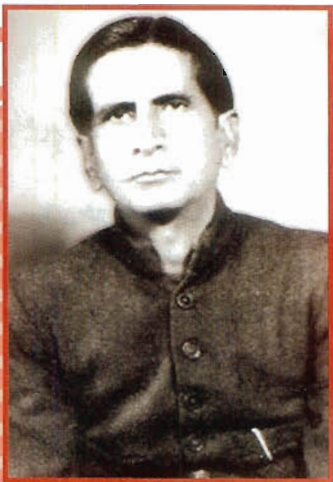

اسرارالحق مجاز

ایک زندہ دل شاعر

مدثر علی خاں

زندگی زندہ دلی کا ہے نام
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

زندہ دلی مجاز کی شخصیت کا ایک اہم پہلو تھی۔ مشاعروں میں مجاز کے اشعار سے اکثر لطیفے چھوٹا کرتے تھے۔ مجاز کے لطیفے سن کر سامعین کی ہنسی چھوٹ جاتی تھی۔ ان کے نزدیک زندگی کو ہنسی خوشی گزار دینا ہی زندگی جینے کا اصل مقصد تھا۔ وہ سنجیدہ حالات میں بھی اکثر طنز و مزاح کے چٹخارے چھوڑ دیتے تھے اور چند ہی لمحات میں پوری محفل کا رنگ تبدیل ہو جاتا تھا۔

اسرارالحق مجاز کی پیدائش 19 اکتوبر 1911 میں قصبہ ردولی میں ہوئی۔ وہ متوسط درجے کے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ جس عہد میں انھوں نے آنکھیں کھولیں۔ اس وقت انھیں اپنے گرد خوش حالی اور معاشی بے فکری نظر آرہی تھی۔

مجاز کے دادا چودھری احمد حسین (مرحوم) کی سات اولادیں ہوئیں۔ ان میں تین لڑکیاں اور چار لڑکے تھے۔ لڑکوں (نعمت رسول، معین الحق اور سراج الحق) میں سراج الحق مجاز کے والد تھے۔ سراج الحق اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ ان کی شادی محض چودہ سال کی عمر میں اپنی چچازاد بہن سے ہوگئی تھی۔ کم عمر میں شادی ہو جانے کے بعد بھی چودھری سراج الحق صاحب کی علم حاصل کرنے کی لگن اور جستجو ختم نہیں ہوئی بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ وہ اور بھی بڑھتی گئی۔ مجاز کے دادا چودھری احمد حسین نے سراج الحق کو بی اے کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے لکھنؤ بھیج دیا۔ وہ انھیں 15 روپے ماہوار بھیجتے رہے۔ اس زمانے میں سراج الحق کے ضروری اخراجات پورے کرنے کے لیے 15 روپے کی رقم بہت تھی۔ بی اے کرنے کے بعد انھوں نے ایل ایل بی کیا اور پھر سرکاری ملازم ہوگئے۔

سراج الحق صاحب قصبہ ردولی اور اپنے خاندان میں واحد شخص تھے جنھوں نے زمینداری کے اپنے آبائی پیشے کے علاوہ کسی دوسرے پیشے کو اختیار کیا۔

سرزمین اودھ میں ردولی، سندیلہ اور کاکوری وغیرہ قصبات فیض آباد اور لکھنؤ کی تہذیب، زبان، اخلاق، طرزِ گفتگو اور آداب و ملاقات کی یکسانیت کی وجہ سے کافی شہرت رکھتے تھے۔ فیض آباد چوں کہ اودھ کی سلطنت میں تھا اور ردولی سے محض 22-20 میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اس لیے فیض آباد کی تہذیب اور تمدن ردولی کی ثقافتی میراث ہو کر رہ گئی ہے۔ ردولی کے باشندوں کی زبان لکھنؤ کے باشندوں کی طرح نرم و نازک اور دلکش ہے۔ یہاں تک کہ آداب و سلام کے قاعدے اور طور طریقے بھی یکساں ہیں۔

مجاز کی والدہ اپنے والدین کی اکلوتی لڑکی تھیں۔ وہ تعلیم سے بالکل بے بہرہ تھیں۔ لیکن بہت ذہین اور زمانہ شناس تھیں۔ والدہ نے مجاز کو بڑی منتوں اور مرادوں سے پالا تھا۔ چودھری سراج الحق صاحب کی دو اولادیں (ایک ڈھائی سال کی عمر میں اور دوسری اٹھارہ سال کی عمر میں) انتقال کر چکی تھیں۔ لہٰذا والدین کا سارا لاڈ پیار مجاز کی طرف مائل ہوگیا۔ والدہ انھیں گھر سے باہر بغیر کسی نوکر کے جانے بھی نہیں دیتی تھیں۔ رات کو سوتے وقت روزانہ دو آنے مجاز کے سرہانے رکھنا اور صبح اٹھتے ہی دو رکعت شکرانے کے پڑھ کر اسے خیرات میں دینا ان کا معمول تھا۔ رات بھر جاگنے کی وجہ سے وہ اپنے خاندان میں جگن بھیا کے نام سے مشہور تھے۔ وہ نہایت شرارتی تھے۔ صفیہ بہن کو چھیڑنا، پریشان کرنا، بھائی انصار ہارونی سے لڑنا اور چھپ کر ان کے حصے کی مٹھائی اکیلے کھالینا، کھلونوں کو توڑنا، گلی ڈنڈا وغیرہ کے کھیل اُن کے پسندیدہ تھے۔

کھیل کود اور شرارت کے ساتھ مجاز بے حد ذہین اور حساس مزاج کے مالک تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم ردولی کے ایک مکتب سے شروع ہوئی۔ والد کے تبادلوں کی وجہ سے مجاز کی تعلیم مختلف شہروں میں ہوئی۔ ہائی اسکول انھوں نے امین آباد (لکھنؤ) سے پاس کیا۔ مجاز میں شاعرانہ صلاحیت بچپن سے نہیں تھیں۔ البتہ انھیں اوائلِ عمر میں تعلیم سے بھی کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ چوں کہ وہ حسن پرست تھے اسی لیے حسن کی سرمستی اور شوخی اُن کی شاعری میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے
شورشِ دوراں بھول گئے وہ زلف پریشاں
بھول گئے وہ دیدۂ گریاں بھول گئے اے شوق نظارہ
کیا کہیے! نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں اے ذوق
تصور کیا کہیے ہم صورت جاناں بھول گئے اب گُل سے
نظر ملتی ہی نہیں اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں اے فصل
بہاراں رخصت ہو ہم لطفِ بہاراں بھول گئے

مجاز کے اشعار میں انھیں خوابِ عشرت میں مبتلا اور عشق و سرمستی کا رنگ اختیار کرتے ہوئے دیکھیے:

عشق ہی عشق ہے دنیا میری
فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں
خوابِ عشرت میں ہیں اربابِ خرد
اور اک شاعر بیدار ہوں میں

مجاز کے والد سراج الحق صاحب کا تبادلہ اسسٹنٹ رجسٹرار کی حیثیت سے آگرہ ہوگیا۔ 1929 میں انھوں نے آگرہ کے سینٹ جانس کالج میں ایف ایس سی میں داخلہ لیا۔ یہیں سے مجاز کا ادبی ذہن تیار ہوا۔ فانی بدایونی ان کے پڑوسی تھے۔ مجاز کا ترانہ علی گڑھ یونیورسٹی کے طالب علم گنگناتے ہیں:

یہ میرا چمن ہے میرا چمن میں اپنے چمن کا بلبل ہوں

یہ ترانہ مجاز نے نذرِ علی گڑھ کے عنوان سے طالب علمی کے زمانے میں لکھا تھا۔ اس ترانہ پر ڈاکیومنٹری فلم بھی بن چکی ہے جس کے ڈائریکٹر اشتیاق خاں ہیں۔ ہندوستان میں علی گڑھ یونیورسٹی ایسی واحد یونیورسٹی ہے جس کے پاس اپنا ترانہ ہے۔

آگرہ کے سینٹ جانس کالج میں مجاز کے ساتھ آل احمد سرور، جذبی، میکش اکبرآبادی، حامد حسن قادری مرحوم زیرِ تعلیم تھے۔ ان تمام صاحبِ فکر ادیبوں اور

شاعروں نے آگرہ میں انجمن ترقی اردو کی ایک شاخ قائم کر رکھی تھی۔ ان لوگوں کے ربط اور میل جول سے مجاز کا ادبی ماحول، فطری رجحان اور دلچسپی شعر و شاعری کی طرف متوجہ ہوئی۔

1931 میں والد صاحب کے علی گڑھ تبادلے کے بعد مجاز ہاسٹل میں اکیلے رہ گئے۔ بس یہیں سے مجاز کی زندگی نے ایک نیا موڑ لیا۔ اپنے اکیلے پن کو دور کرنے کے لیے وہ کالج کے مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ انھوں نے شراب نوشی کو اپنے ساتھی کے طور پر انتخاب کیا۔ پان کھانا، شعر سنانا اور شعر کہنا، اُن کی رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ سالانہ امتحان میں بھی وہ فیل ہو گئے۔ اُن دنوں مجاز نے 'شہید' تخلص سے شاعری کی۔ جذبی جو ان کے ساتھی تھے وہ بھی ان دنوں 'ملا' تخلص سے شاعری کرتے تھے۔ کالج کے ایک مشاعرے میں آل احمد سرور، جذبی اور مجاز نے اپنی اپنی غزلیں پڑھیں۔ مجاز کو بہترین غزل کے لیے 'گولڈ میڈل' ملا۔ ان کی غزل کا مطلع غور فرمایئے:

یونہی بیٹھے رہو بس درد دل سے بے خبر ہو کر
بنو کیوں چارہ گر تم ،کیا کرو گے چارہ گر ہو کر

اکیلے پن اور آزاد خیال ہونے کی وجہ سے انھی دنوں مجاز طوائفوں میں بھی دلچسپی لینے لگے تھے۔ وہ جب بھی میکش اکبرآبادی کے یہاں جاتے۔ طوائفوں کے کوٹھوں کی جانب منہ کر کے بیٹھ جاتے۔ میکش اکبرآبادی کے گھر کے دونوں جانب طوائفیں رہا کرتی تھیں۔

انھی دنوں مجاز کے ایک ہم جماعت دوست کو عیسائی لڑکی سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ اسے اپنی طرف مائل کرنے کے لیے جیوتشی کے کہنے کے مطابق اُلّو کا دل اپنی عیسائی محبوبہ کو کھلانے کی غرض سے رات رات بھر مجاز کے ساتھ غلیل ہاتھ میں لیے الو کا شکار کرتے تھے۔ مجاز نے کیک (Cake) میں الو کا دل رکھ کر اپنے دوست کی عیسائی محبوبہ کو کھلایا لیکن وہ پھر بھی اُن کے قریب نہیں آئی۔

میکش اکبرآبادی کی قربت، صحبت اور شرفِ تلمذ کی وجہ سے مجاز کی ملاقات آگرہ میں فانی مرحوم سے ہوئی۔ جو اُن کے پڑوسی تھے۔ مجاز نے اپنی ابتدائی غزلوں کی اصلاح فانی مرحوم سے لی۔ غور فرمایئے:

قتل کر کے وہ مستیاں اُن کی
خونِ دل بھی شراب ہونا تھا

فانی مرحوم نے مجاز کی غزل کا پہلا مصرعہ بدل کر اس طرح کر دیا:

ہجر میں کیفِ اضطراب نہ پوچھ
خونِ دل بھی شراب ہونا تھا

دراصل ایک فنکار عام انسان سے کہیں زیادہ حساس ہوتا ہے۔ وہ اپنے جذبات، احساس، میلانات اور فطری رجحان کو یا کسی دیگر انسان کی گفتگو اور اعمال و افکار کو آسانی سے شعری پیکر میں ڈھالنے کے ہُنر سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ کسی شاعر کی شعری تخلیق اُس کے نجی جذبات، احساسات اور مادّی حالات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

ہر دور میں اردو شاعری کے خمیر میں عشق، محبت اور حسن کی تعریفی باتیں موجود ہیں۔ مجاز نے بھی اپنی شاعری میں رومانی عناصر کو قبول کیا۔ لیکن اُن کے کلام میں اُن کی محبوبہ میر، غالب وغیرہ کی طرح چاند تاروں کی مانند نہیں مثلاً حقیقی دنیا سے پرے آسمانی خواب کی طرح اُن کی محبوبہ خوبصورتی کی مثال نہیں بلکہ وہ اسی دنیا کی ایک عام لڑکی ہے۔ اُن کی شاعری میں اُن کی محبوبہ کوئی بدکردار، بداخلاق، بدچلن یا بدنام لڑکی نہیں بلکہ ان کی محبوبہ و محبت پاکیزہ ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

بتاؤں کیا تجھے اے ہمنشیں کس سے محبت ہے
میں جس دنیا میں رہتا ہوں وہ اس دنیا کی عورت ہے
سراپا رنگ و بو ہے پیکر حسن و لطافت ہے
بہشت گوش ہوتی ہیں گہرا افشانیاں اس کی
زبان پر ہیں ابھی تک عصمت و تقدیس کے نغمے
وہ بڑھ جاتی ہے اس دنیا سے اکثر اس قدر آگے
میرے تخیل کے بازو بھی اس کو چھو نہیں سکتے
مجھے حیران کر دیتی ہیں نکتہ دانیاں اس کی

اشعار کے مطالعے سے مجاز کے دل میں اپنی محبوبہ کے لیے ان کی محبت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے وہ اسے بے پردہ کرنے کے بجائے اُس کے حسن کو اپنے لفظوں اور جملوں سے تابانی عطا کر رہے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ مجاز کی محبوبہ نے انھیں چھوڑ کر کسی اور سے شادی کر لی تھی۔ بعد میں وہ انھیں کہیں ملی تو انھوں نے اس کی پاکیزگی برقرار رکھتے ہوئے یہ شعر کہا:

وہ گدازِ دل مرحوم کہاں سے لاؤں
اب میں وہ جذبۂ معصوم کہاں سے لاؤں
اب میں الطاف و عنایت کا سزاوار نہیں
میں وفادار نہیں ہاں میں وفادار نہیں
اب میرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو

مجاز کے اشعار سے ایک لمحہ بھی ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ انھوں نے اپنی قسمت کا رونا خدا کے آگے رویا یا زندگی کے آگے گھٹنے ٹیکے ہوں۔ زندگی میں ملی تمام مایوسیوں نے انھیں لڑنے اور آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا۔ اردو کے دیگر نامور شاعروں کی طرح انھوں نے آخری دم تک شکست نہیں مانی:

اپنے دل کو دونوں عالم سے اٹھا سکتا ہوں میں
کیا سمجھتی ہو کہ تم کو بھی بھلا سکتا ہوں میں
دل میں تم پیدا کرو پہلے مری سی جرأتیں
اور پھر دیکھو کہ تم کو کیا بنا سکتا ہوں میں
میں بہت سرکش ہوں لیکن اک تمہارے واسطے
دل بجھا سکتا ہوں میں آنکھیں بچھا سکتا ہوں میں

اردو شاعری میں میر، غالب، آزاد، حالی، آبرو، سودا، کلیم، نظیر، اقبال (مضمون میں تمام تر شاعروں کا نام نہ دے کر اہم شاعروں کے نام دیے گئے ہیں تاکہ مضمون مختصر ہو جائے) وغیرہ وغیرہ نے اپنی شاعری میں عورت کا جو تصور پیش کیا اس ڈگر سے ہٹ کر مجاز نے جتنا واضح عورت کا تصور اپنی شاعری میں پیش کیا۔ اردو کا کوئی دوسرا فنکار نہیں پیش کر سکا۔

محبوبہ یا عام عورت کے تصور، تعلیم نسواں کے علاوہ مجاز نے اپنے عہد کے حالات ایک انقلاب کی شکل میں اپنی شاعری میں پیش کیے۔ اس دور میں سیاسی اور سماجی انتشار تھا۔ کچھ طاقتیں معاشرہ اور انسان دوستی کو نقصان پہنچانے کی ناپاک کوششیں کر رہی تھیں۔ مجاز اپنے معاشرے کے حالات سے بخوبی واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا شاعرانہ اسلوب انقلابی ہے۔ انگریزی حکومت ہو یا سرمایہ دارانہ نظام، مجاز نے سبھی کے خلاف نغمہ و شعر کے ذریعے جہاد کیا۔

مجاز ترقی پسند تحریک سے بھی بے حد متاثر تھے۔ سرمایہ داروں کے مزدور طبقات پر ظلم ان کی برداشت سے باہر تھے۔ وہ کہتے ہیں:

ختم ہو جائے گا سرمایہ داری کا نظام
رنگ لانے کو ہے مزدوروں کا جوش انتقام

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مجاز کی شاعری میں اپنے عہد کی جھلک کے ساتھ ان کے ذاتی درد و غم، ان کی دلی کیفیت، معاشرہ اور تہذیبی قدروں کا پختہ شعور ہے۔ حسن و عشق کے پرستار ہونے کے سبب اُن کی شاعری میں رنگینی اور بانکپن ہے جو انھیں اپنے معاصرین اور دیگر شعرا سے منفرد بنا دیتا ہے۔

■

Mudassir Ali Khan, Purana Gunj, Moh. Ghair Togha, Rampur (U.P.)

اُردو تہذیب اور پنڈت نہرو

شفیع ایوب

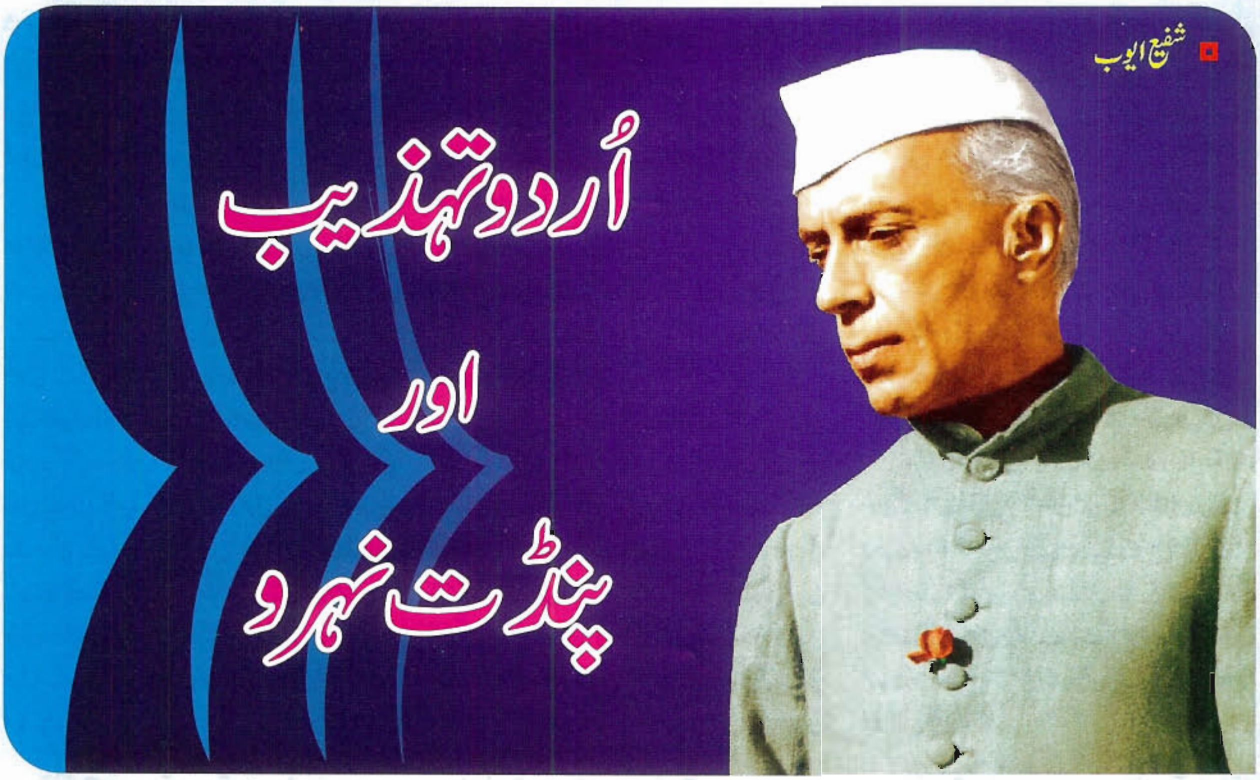

ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو انگریزی کے ادیب اور اردو کے عاشق تھے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں، وہ سیاسی رہنما تھے جنھیں راشٹر پتا مہاتما گاندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد کا بھرپور اعتماد حاصل تھا۔ وہ عام لوگوں کے لیے قابلِ صد احترام 'پنڈت جی' تھے اور بچوں کے لیے 'چاچا نہرو' قانون داں طبقہ انھیں ایک قابل بیرسٹر تصور کرتا تھا اور بہت سے اہلِ نظر انھیں سوشلزم کا مسیحا گردانتے تھے۔ انگریزی زبان پر قدرت رکھنے والے اکیلے قابلِ فخر ادیب کو جن کی کم از کم تین کتابیں انگریزی زبان وادب کا قیمتی سرمایہ ہیں، خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے اُردو کے پہلے گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ ممتاز شاعر فراق گورکھپوری اکثر کہا کرتے تھے کہ ہندوستان میں ان سے بہتر انگریزی صرف پنڈت جواہر لعل نہرو کو آتی ہے۔ 1919 میں سرکار انگریزی نے فراق گورکھپوری کو ڈپٹی کلکٹری کے لیے نامزد کیا، مگر اس وقت تک فراق گاندھی جی کے نظریات سے کافی حد تک متاثر ہو چکے تھے۔ اسی لیے انھوں نے اس عہدے سے استعفادے دیا۔ اب فراق مکمل طور پر جنگ آزادی میں شریک ہو چکے تھے۔ 1920 میں تحریک ترک موالات کے سلسلے میں کافی لوگ گرفتار کیے گئے جن میں پنڈت جواہر لعل نہرو بھی شامل تھے، بعد میں فراق گورکھپوری کی گرفتاری بھی عمل میں آئی۔ دو برس کی سزا پوری کر کے فراق جیل سے چھوٹ کر جب گھر آئے تو گھر کی حالت کافی نازک تھی۔ اس واقعے کا ذکر ڈاکٹر افغان اللہ خاں نے فراق پر لکھی اپنی کتاب میں اس طرح کیا ہے:

''اسی دوران پنڈت جواہر لعل نہرو گورکھپور تشریف لائے اور فراق صاحب کے مہمان ہوئے۔ فراق نے ان سے اپنی پریشانیوں کا ذکر نہیں کیا لیکن سیاست عالم کے قیافہ شناس نے بغیر کہے ہی سب کچھ سمجھ لیا۔ جواہر لعل نہرو نے ان کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ الہ آباد آئیں اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے انڈر سکریٹری کی حیثیت سے کام کریں۔ مولانا محمد علی جوہر کانگریس کے صدر تھے انھوں نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا اور فراق صاحب ڈھائی سو روپیہ پر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے مذکورہ عہدے پر کام کرنے لگے۔ اس حیثیت سے انھوں نے 1923 سے 1927 تک کام کیا، اسی دوران پنڈت جواہر لعل نہرو سیاستِ عالم کا مطالعہ کرنے یورپ چلے گئے۔ بقول فراق صاحب کے کہ اب کانگریس کے انڈر سکریٹری کے عہدے پر ان کے لیے کوئی کشش نہ تھی۔''

فراق کو پنڈت جی نے جس طرح نوازا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اردو اور اردو والوں سے محبت کرتے تھے۔ فراق جیسے انا پرست اور خطرناک حد تک اردو کے حامی شاعر کے لیے پنڈت نہرو کی شخصیت میں ایسی دلکشی تھی کہ پنڈت نہرو کے یورپ جانے کے بعد فراق نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے انڈر سکریٹری کی نوکری چھوڑ دی۔ فراق کے علاوہ جوش ملیح آبادی سے بھی پنڈت نہرو کے بڑے قریبی رشتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کا بے حد احترام کرتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ جوش صاحب کی جواہر لال نہرو نے جس طرح ناز برداری کی اس کی دوسری نظیر مشکل سے ملے گی۔ نہرو کی خواہش تھی کہ جوش ہندوستان چھوڑ کر نہ جائیں۔ اس کے لیے انھوں نے بار بار التجا کی مگر جوش اس کے باوجود پاکستان جا بسے۔ نہرو کی جگہ کوئی اور ہوتا تو زندگی بھر کے لیے جوش سے ناتا توڑ لیتا مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ نہرو فراق اور جوش اردو تہذیب کا ایک ایسا مثلث تھے جس پر اردو ہمیشہ ناز کرتی رہے گی۔

دراصل اردو جس مشترکہ تہذیب کی نشانی ہے اسی مشترکہ تہذیب کے پروردہ پنڈت نہرو بھی تھے۔ اس مشترکہ تہذیب اور اس کی زبان سے نہرو خاندان کا صدیوں پرانا رشتہ رہا ہے۔ ان کے جدامجد راج کول فارسی زبان کے بڑے عالم تھے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو کے پردادا لکشمی نرائن نہرو بھی فارسی کے بڑے عالم تھے۔ پنڈت نہرو کے دادا گنگا دھر نہرو دہلی میں کوتوال کے عہدے پر مامور تھے۔ گنگا دھر نہرو اس زمانے میں دہلی کے کوتوال تھے جب غالب بلی ماران کی گلی قاسم جان میں سکونت پذیر تھے۔ پنڈت گنگا دھر نہرو کو فارسی کے ساتھ

اردو پر بھی عبور حاصل تھا، پردادا اور دادا کے بعد جواہر لعل کے والد مکرم پنڈت موتی لال نہرو تو نہ صرف گھر کے اندر بلکہ باہر بھی عام بات چیت میں اردو فارسی کا استعمال کرتے تھے۔ 1928 میں کانگریس کے کلکتہ اجلاس میں پنڈت موتی لعل نہرو کانگریس صدر چنے گئے۔ اگلے برس 1929 میں لاہور اجلاس میں پنڈت جواہر لعل نہرو کو کانگریس کا صدر منتخب کیا گیا۔ تاریخی اعتبار سے یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا کہ اتنی بڑی سیاسی پارٹی کا صدر باپ کے بعد بیٹا منتخب ہوا تھا۔ اس تاریخی موقعے پر اپنے جذبات کے اظہار کے لیے موتی لعل نہرو نے فارسی کا یہ مقولہ پڑھا تھا کہ:

آں کہ پدرانہ تو اند پسر تمام کند

ان تمام باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پنڈت جواہر لعل نہرو کا رشتہ اردو زبان وتہذیب سے بہت پرانا تھا اور یہ کئی نسلوں سے چلا آرہا تھا۔ اردو کی مٹھاس بچپن سے ہی پنڈت نہرو کے کانوں میں پڑی تھی۔ اگرچہ وہ انگریزی کے بلند پایہ ادیب اور صحافی تھے لیکن اس بات پر فخر کیا کرتے تھے کہ اردو ان کی مادری زبان ہے۔ ان کی زندگی میں کئی ایسے موقعے آئے جب انھوں نے اپنی تقریر میں اس بات کا اعتراف کیا کہ انھوں نے اردو کی باقاعدہ تعلیم نہیں پائی لیکن گھر کا ماحول ایسا تھا جہاں اردو کی خوشبو رچی بسی تھی۔ پنڈت نہرو کی ذات میں جو نفاست تھی وہ اردو تہذیب کی پروردہ تھی۔ شیروانی، چوڑی دار پاجامہ اور گلاب کے پھول نے نہرو کے حسنِ ظاہر کو نکھارا جب کہ زبان اردو نے ان کی مکمل شخصیت کو سنوارا۔ اسی لیے وہ اکثر و بیشتر اس زبان کی تعریف و توصیف کیا کرتے تھے۔ 1958 میں انجمن ترقی اردو ہند کی کانفرنس میں نہرو نے یادگار تقریر کی تھی، انھوں نے کہا تھا:

"میں اردو پر فخر کرتا ہوں اور بدستور بولتا رہوں گا۔ اردو میرے صوبے کی زبان ہے اور اس بات پر مجھے فخر ہے۔"

پنڈت نہرو کی تمام تصانیف انگریزی میں ہیں۔ وہ انگریزی میں بہت اچھی تقریر کرتے تھے۔ اپنی انگریزی تقریر کے دوران بھی اردو کے اشعار پڑھتے تھے لیکن جب بھی اردو میں تقریر کرتے تو نفیس اردو بولتے تھے۔ ان کے بارے میں اکثر کہا جاتا کہ وہ انگریزی میں سوچتے اور اردو میں بولتے ہیں۔ فراق گورکھپوری کی طرح پنڈت نہرو بھی ہندی کے بھاری بھرکم سنسکرت آمیز جملوں سے گھبراتے تھے۔ ہری ونش رائے بچن ہندی کے مشہور شاعر تھے۔ مدھوشالہ کے شاعر کے طور پر ان کی پہچان ہے۔ ہری ونش رائے بچن کا نہرو خاندان سے تعلق تھا۔ اپنی خودنوشت 'کیا بھولوں کیا یاد کروں' میں ہری ونش رائے بچن نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ اس وقت کے صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کو ایک خطبہ دینا تھا۔ حکومت کی جانب سے یہ خطبہ انگریزی میں تیار ہوا۔ لیکن احباب کی رائے تھی کہ خطبہ ہندی میں پیش کیا جائے۔ پنڈت نہرو نے ہری ونش رائے بچن کو بلا کر یہ خطبہ ان کے حوالے کیا اور کہا کہ اس کا ہندی ترجمہ کر کے انھیں دکھالیں۔ ہری ونش رائے بچن جب ترجمہ کر کے نہرو جی کے پاس لے گئے تو دو چار جملے پڑھ کے نہرو جی کا موڈ خراب ہو گیا، انھوں نے جھلا کر ہری ونش رائے بچن سے پوچھا کہ آپ نے یہ کس زبان میں ترجمہ کر دیا ہے؟ ہری ونش رائے نے جواب دیا ہندی میں۔ نہرو جی نے وہ کاغذ ہری ونش رائے کو لوٹاتے ہوئے کہا کہ جائیے اس کا ترجمہ ہندوستانی زبان میں کر کے لائیے۔

دراصل اردو کے حوالے سے پنڈت نہرو بھی گاندھی جی کے نظریات کے قائل تھے۔ دوسرے قومی رہنماؤں کی طرح پنڈت نہرو بھی اردو یا ہندی کے بجائے ہندوستانی زبان کو قومی زبان بنائے جانے کے حامی تھے۔ ہندوستانی سے مراد وہ زبان تھی جس میں نہ سنسکرت کے بھاری بھرکم الفاظ ہوں اور نہ اس میں عربی فارسی کے مشکل اور بوجھل الفاظ کی کثرت ہو۔ وہ ہندی اور اردو کو ایک ہی زبان خیال کرتے تھے۔ وہ یہ ماننے کو تیار نہیں تھے کہ ہندی ہندوؤں کی زبان اور اردو مسلمانوں کی زبان ہے، پنڈت نہرو کا کامل یقین تھا کہ زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ انھوں نے بار بار اس بات پر زور دیا کہ اردو خالص ہندوستانی زبان ہے۔ 1940 کی دہائی میں جب اردو ہندی کا جھگڑا زیادہ بڑھا تو کچھ لوگوں نے اردو رسم الخط میں تبدیلی کی بات کی۔ لیکن پنڈت نہرو نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ رسم الخط کی تبدیلی سے ادب کا انمول خزانہ ضائع ہو جائے گا۔ اس خزانے سے ہماری ذہنی ترقی کی تاریخ وابستہ ہے۔

1947 میں ملک کی آزادی کے ساتھ تقسیم ہند کا سانحہ بھی پیش آیا، تقسیم ہند نے اردو کو غیر معمولی نقصان پہنچایا۔ اردو کے حامیوں کی ایک بڑی تعداد دہلی، لکھنؤ، پٹنہ، بھوپال، ٹونک اور حیدر آباد جیسے مقامات سے ہجرت کر کے پاکستان چلی گئی۔ لاہور اور کراچی کا اردو داں طبقہ پہلے ہی پاکستان کے حصے میں آچکا تھا۔ جو لوگ اردو کو تقویت پہنچانے والے تھے وہی نہ رہے، ستم بالائے ستم کہ اردو کو تقسیم کا ذمے دار ٹھہرانے کی کوشش کی گئی۔ ہر طرف ایک مایوسی اور ناامیدی کی فضا تھی۔ ایسے ماحول میں جب مہاتما گاندھی کو بھی قتل کر دیا گیا تو اردو کے عاشق اور حامی ہونے کے باوجود پنڈت نہرو اردو کے لیے بہت کچھ نہ کر سکے۔ لیکن اس وقت کے حالات کو ذہن میں رکھیں تو اندازہ ہوگا کہ پنڈت نہرو دور اندیش تھے۔ وہ پہلے حالات کو سازگار ہونے دینا چاہتے تھے تا کہ اردو کو ایک فطری ماحول میں پھلنے پھولنے کا موقع مل سکے۔ اس تاریک دور میں اردو کے حامیوں کو پنڈت نہرو اور ان کے رفیق مولانا ابوالکلام آزاد سے امیدیں تھیں لیکن حالات اس قدر خراب ہو چکے تھے کہ اردو کے ان دونوں عاشقوں سے کچھ خاص نہ بن پڑا لیکن اتنا ضرور ہوا کہ جب ہندوستان کے آئین کی تشکیل ہوئی تو اس کے آٹھویں شیڈول میں اردو کو بھی ایک قومی زبان کی حیثیت دی گئی۔ اس کے علاوہ آئین کی دفعہ (A) 30 کے تحت لسانی اقلیتوں کو اپنے تعلیمی اداروں کو چلانے کا حق دیا گیا تھا اور دفعہ 350 کے تحت ہندوستان کے ہر شہری کو اپنی مادری زبان میں عرض داشت پیش کرنے کا حق دیا گیا تھا۔ اس کے بعد اس غرض سے کہ ہندی کے ساتھ علاقائی زبانوں کو بھی فروغ حاصل ہو، سہ لسانی فارمولا پیش کیا گیا، ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ پنڈت جواہر لعل نہرو کو کچھ اور وقت ملا ہوتا تو وہ اردو کو اس کا جائز حق دلانے کی سمت میں بڑے اقدامات کرتے۔ لیکن موت نے انھیں مہلت نہ دی۔ پنڈت نہرو کی بیٹی اندرا گاندھی جب ہندوستان کی وزیر اعظم بنیں تو مرکزی حکومت اپنی کسی نہ کسی پالیسی کے تحت اردو کی بقا و فروغ کے لیے کچھ نہ کچھ اقدام کرتی رہی۔ اندرا گاندھی نے اپنے دورِ اقتدار میں 1972 میں اندر کمار گجرال کی صدارت میں ایک کمیٹی تشکیل دی تھی جس کا کام اردو کی ترویج کے امکانات کا جائزہ لینا تھا۔ ڈھائی سو صفحات پر مشتمل یہ رپورٹ 1975 میں 187 سفارشات کے ساتھ حکومت کو پیش کی گئی۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ پنڈت جواہر لعل نہرو کا اردو سے جذباتی رشتہ تھا۔ آج جب کہ ہندوستان کی ترقی کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی ترقی کے بھرپور مواقع مل رہے ہیں تو ہمیں پنڈت جی کی دور اندیشی کا قائل ہونا پڑے گا کہ نامساعد حالات کے باوجود انھیں جہاں موقع ملتا تھا وہ اردو کی حمایت و تعریف میں بولنے سے نہ چوکتے تھے اور اردو کی ترقی سے بہت خوش ہوتے تھے۔

■

Dr. Shafi Ayub, CIL/SLL & CS, JNU, New Delhi - 110067

نہرو پر جوش کی یادگار تحریر

میرا دوست نہرو!

جوش ملیح آبادی

وہ اپنی موہنی صورت کی جاذبیت، اپنے رنگ کی طلاقت، اپنی آنکھوں کی مروت، اپنے لہجے کی غدوبت، اپنے تکلم کی موسیقیت، اپنے تبسم کی حلاوت، اپنے خاندان کی وجاہت اپنے دل کی، آفاق در آغوش وسعت، اپنے مزاج کی بے نظیر شرافت اور اپنے کردار کی بے مثال نجابت کے اعتبار سے ایک ایسے انسان تھے، جو اس کرۂ خاکی پر، صدیوں بعد پیدا ہوئے اور جو یہ آواز بلند کر سکتے ہیں کہ:

مت سہل ہمیں سمجھو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ان کا وجود، ہندوستان کا افتخار، ایشیا کا وقار اور عالم انسانیت کا اعتبار تھا اور وہ اس عالم اجسام کے ایک ایسے ذی حیات تاج محل تھے، جس کو، شامِ اودھ کی ملاحت اور صبح بنارس کی صباحت نے الٰہ آباد کے 'معنیٰ خیز سنگم' پر 'گنگا جمنی چھینیوں سے تراش کر' تعمیر کیا تھا۔

اس سے پیش تر دو تین مواقع پر اُن کا تذکرہ کر چکا ہوں، اس لیے ان کے متعلق جو باتیں بیان کرنے سے رہ گئی ہیں، فقط وہی بیان کروں گا۔

ایک بار یہ سن کر کہ وہ 'کمبھ' کے میلے میں شریک ہونے کو الٰہ آباد گئے تھے، میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں غصے میں بھرا، اُن کے پاس گیا اور کہا ''اتو بروٹس''؟[1]

انھوں نے بڑی حیرت سے، پوچھا کیوں صاحب میں نے وہ کون ایسی خلافِ توقع بات کی ہے کہ آپ مجھ سے اتو بروٹس کہہ رہے ہیں۔ میں نے کہا پنڈت جی، آپ تو بہت بڑھ چڑھ کر یہ دعویٰ کیا کرتے تھے کہ دنیا کے کسی مذہب سے بھی میرا کوئی تعلق نہیں ہے اور اس کے باوجود، سنتا ہوں آپ کمبھ کے میلے میں، وہم کے شعلے کو ہوا دینے کی خاطر، الٰہ آباد تشریف لے گئے تھے۔ انھوں نے کہا اگر میں وہاں پجاری کی حیثیت سے جاتا تو آپ کو حق تھا کہ مجھ پر اعتراض کرتے لیکن میں تو وہاں پبلک مائنڈ (مزاجِ عوام) کے مطالعے کے واسطے گیا تھا۔ میں نے کہا، جی نہیں آپ وہاں گئے تھے، اپنے ووٹوں کی خاطر، رائے عامہ کو متاثر فرمانے کے لیے، ابھی وہ جواب دینے کے لیے اپنے لبوں کو جنبش دے ہی رہے تھے کہ ڈاکٹر کاٹجو آ گئے۔ پنڈت جی نے اُن سے کہا مسٹر کاٹجو مجھ پر جوش صاحب اعتراض کر رہے ہیں کہ میں کمبھ کے میلے کیوں گیا تھا، کاٹجو نے کہا یہ تو خیر، میلے کی بات ہے، ایک دن، مجھے پوجا کرتے دیکھ کر جوش صاحب نے مجھ سے یہاں تک کہا تھا کہ کاٹجو صاحب آپ بالغ ہو جانے کے باوجود پوجا کرتے ہیں اور جب میں نے ان سے پوچھا تھا کہ پوجا کرنا کوئی بری بات ہے؟ تو انھوں نے کہا تھا یہ ایسی بری بات ہے کہ اسے دیکھ کر کبھی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک صاحبِ فکر آدمی کے دل پر ایسی کاری ضرب لگ جائے کہ وہ فوراً تڑپ کر مر جائے۔ یہ سن کر، پنڈت جی نے قہقہہ مار کر، یہ کہا تھا جہاں تک پوجا کا تعلق ہے، میں بھی جوش صاحب کا ہم خیال ہوں اور اس پر کاٹجو کا منھ لٹک کر رہ گیا تھا۔

> اُن کو اردو زبان سے بھی بڑی محبت تھی۔ انھوں نے مجھ سے ایک دن کہا تھا کہ اردو کے بارے میں میری ذاتی رائے اور ہے، اور میری گورنمنٹ کی رائے اور ہے۔ لیکن میں گورنمنٹ پر اپنی رائے 'تھرسٹ' کرنا (ٹھونسنا) نہیں چاھتا۔ اس لیے کہ یہ عجل ڈیماکریسی (جمھوریت) کے خلاف ھے۔

تقسیم ہند کے فوراً بعد (دہلی میں) مسلمان لوٹے اور قتل کیے جا رہے تھے۔ اُس بھیانک دور میں اگر

1 شیکسپیئر نے، اپنے ڈرامے 'جولیس سیزر' میں لکھا ہے کہ سیزر نے جب یہ دیکھا کہ اس کا سب سے بڑا فلپئی دوست بروٹس بھی اُس پر قاتلانہ حملہ کرنے والوں کی صف میں کھڑا ہوا ہے، تو زمین اس کے پاؤں کے نیچے سے نکل گئی، اور فرطِ حیرت سے اُس نے اِتو بروٹس (یعنی تم بھی اے بروٹس) کا نعرہ لگا کر، اپنی تلوار پھینک دی، اور یہ خیال کر کے کہ جب میرا ایسا جگری دوست اور اس قدر مدبر انسان بھی، میرے خلاف ہو گیا ہے تو اس کے سوا اور کوئی معنیٰ ہو ہی نہیں سکتے کہ مجھ میں کوئی نہ کوئی ایسا زبردست عیب ضرور موجود ہے، جس سے میری قوم اور میرے ملک کو نقصان پہنچ سکتا ہے، اپنی گردن جھکا لی، اور اپنے کو قتل ہو جانے کے واسطے پیش کر دیا۔

جواہر لال کھل کر میدان میں نہ آجاتے، اور خوفناک گلیوں میں گھس گھس کر، اور ہندوؤں کے منہ پر تھپڑ مار مار کر اُس آگ کو نہ بجھا دیتے تو دہلی میں ایک مسلمان بھی زندہ نہ رہتا۔

اُن کو اردو زبان سے بھی بڑی محبت تھی۔ انھوں نے مجھ سے ایک دن کہا تھا کہ اردو کے بارے میں میری ذاتی رائے اور ہے، اور میری گورنمنٹ کی رائے اور ہے۔ لیکن میں گورنمنٹ پر اپنی رائے 'تھرسٹ' کرنا (ٹھونسنا) نہیں چاہتا۔ اس لیے کہ یہ عمل ڈیماکریسی (جمہوریت) کے خلاف ہے۔

ایک روز لکھنؤ اسٹیشن پر انھوں نے ریلوے حکام کو بلا کر، بہت بری طرح پھٹکار کر کہا تھا کہ آپ لوگوں نے مجھ کو نرا جاہل بنا رکھ دیا ہے، ہر طرف ہندی کے بورڈ لگے ہوئے ہیں۔ کچھ پتا نہیں چلتا کہ یہ کھانے کا کمرہ ہے یا بواٹری ہے۔

ایک بار، جب پاکستان سے رخصت لے کر میں جب دہلی میں اُن سے ملا تو انھوں نے بڑے طنز کے ساتھ مجھ سے کہا تھا کہ جوش صاحب، پاکستان کو اسلام، اسلامی کلچر اور اسلامی زبان یعنی اردو کے تحفظ کے واسطے بنایا گیا تھا لیکن ابھی کچھ دن ہوئے کہ میں پاکستان گیا اور وہاں، یہ دیکھا کہ میں تو شیروانی اور پاجامہ پہنے ہوئے ہوں لیکن وہاں کی گورنمنٹ کے تمام افسر، سوفی صد، انگریزوں کا لباس پہنے ہوئے ہیں۔ مجھ سے انگریزی بولی جارہی ہے، اور انتہا یہ ہے کہ مجھے انگریزی میں ایڈریس بھی دیا جارہا ہے۔ مجھے اس صورتِ حال سے بے حد صدمہ ہوا، اور میں سمجھ گیا کہ ''اردو، اردو، اردو کے جو نعرے، ہندوستان میں لگائے گئے تھے، وہ سارے اوپری دل سے، اور کھوکھلے تھے اور ایڈریس کے بعد، جب میں کھڑا ہوا تو میں نے اس کا اردو میں جواب دے کر، سب کو حیران و پشیمان کر دیا اور یہ بات ثابت کر دی کہ مجھ کو اردو سے ان کے مقابلے میں، کہیں زیادہ محبت ہے اور جوش صاحب معاف کیجیے، آپ نے جس اردو کے واسطے اپنے وطن کو تج دیا ہے اس اردو کو پاکستان میں کوئی منھ نہیں لگاتا اور جایئے پاکستان۔ میں نے شرم سے، آنکھیں نیچی کرلیں۔ اُن سے تو کچھ نہیں کہا، لیکن ان کی باتیں سن کر مجھے یہ واقعہ یاد آگیا۔ میں نے پاکستان کے ایک بڑے شاندار منسٹر صاحب کو جب اردو میں خط لکھا، اور ان صاحب بہادر نے انگریزی میں جواب مرحمت فرمایا تو میں نے جواب الجواب میں یہ لکھا تھا کہ جنابِ والا، میں نے تو آپ کو اپنی مادری زبان میں خط لکھا لیکن آپ نے اس کا جواب اپنی پدری زبان میں تحریر فرمایا ہے:

چو، کفر، از کعبہ برخیزد، کجا ماند مسلمانی

اب چند واقعات ان کی ادب نوازی، ان کی غیر معمولی شرافت، اور ان کی بے نظیر ناز برداری کے بھی سن لیجیے۔

جب سینٹرل حکومت کے محکمۂ اطلاعاتِ عامہ میں، میرا تقرر، سرکاری رسالے 'آج کل' میں ہوگیا تو میں نے ان کو خط لکھا کہ میرے پرچے کے واسطے اپنا پیغام جلد بھیج دیجیے۔ اگر آپ تساہل سے کام لیں گے تو میری آپ کی زبردست جنگ ہوجائے گی۔ ایک ہفتے کے اندر ان کا پیغام آگیا (جس کو 'آج کل' فائل میں دیکھا جاسکتا ہے)۔ اپنے پیغام کے آخر میں انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ میں جلدی میں پیغام اس لیے بھیج رہا ہوں کہ جوش صاحب نے مجھ کو دھمکی دی ہے کہ اگر دیر ہوگئی تو وہ مجھ سے لڑ پڑیں گے اور جب میں نے ان کے پیغام کے شکریے میں ان کو خط لکھا تو دبی زبان سے یہ شکایت بھی کردی کہ آپ نے میرے خط کا جواب خود اپنے ہات سے لکھنے کی عوض سکریٹری سے لکھوایا ہے۔ میرے ساتھ آپ کو یہ برتاؤ نہ کرنا چاہیے تھا اور ان کی شرافت دیکھیے کہ میری اس شکایت پر انھوں نے خود اپنے ہات سے مجھ کو یہ لکھا کہ مشاغل کے ہجوم کی بنا پر میں سکریٹری سے خط لکھانے پر مجبور ہوگیا تھا۔ آپ میری اس غلطی کو معاف کریں۔

ایک بار، میں اُن کے وہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہ دروازہ پر کھڑے، قدوائی صاحب سے باتیں کر رہے ہیں اور جیسے ہی میں نے برآمدے میں قدم رکھا اور ان

پنڈت جواہر لعل نہرو کا اردو رسم خط میں لکھا ہوا خط
مولوی مسعود علی ندوی ناظم دار المصنّفین اعظم گڑھ کے نام

از دہلی

10 جنوری، 57

پیارے بھائی مسعود علی۔

تمہارا 6 جنوری کا خط ملا۔ اُسمیں کچھ بھوپال کے چناو کے بارے میں لکھا ہے۔

میں پرسوں دہلی سے باہر جارہا ہوں اور قریباً ایک ہفتہ باہر رہونگا۔ پھر ایک دو دن کیلیے آکر فوراً باہر چلا جاؤنگا۔ اِس لیے میرا کسی ڈیپوٹیشن سے ملنا مشکل ہے۔ علاوہ اِس کے میں نے اِس چناؤ کے معاملے میں بہت کم دلچسپی لی ہے۔ نہ مجھے وقت ہے اِس کیلیے اور نہ کچھ طبیعت ہی پسند کرتی ہے۔

میں تمہارا خط لال بہادر شاستری کو بھیج دیتا ہوں۔ وہ ان کاموں میں لگے ہیں اور کافی محنت کر رہے ہیں۔

میں نے ابھی اُن تیس ناموں کو دیکھا ہے جو کہ انگریزی کے خط میں لکھتے ہیں اُن میں سے دو صاحبوں سے میں واقف ہوں۔ اور کچھ بہت زیادہ اُن کے حق میں میری رائے نہیں ہے۔ کچھ میں ان کے خلاف بھی نہیں ہوں۔

مجھے یہ سن کر افسوس ہوا کہ تمہاری طبیعت اچھی نہیں رہتی۔ جب کبھی دہلی آؤ تو ضرور ملنے آنا۔

تمہارا

جواہر لعل نہرو

بشکریہ 'ایوانِ اردو'، بحوالہ ہفت روزہ 'ہماری زبان' سے منقول

سے آنکھیں چار ہوئیں تو وہ ایک سیکنڈ کے اندر روپوش ہوگئے۔

میں نے قدوائی صاحب سے کہا میں تو اب یہاں نہیں ٹھہروں گا، آپ پنڈت جی سے کہہ دیجیے گا کہ لیڈری اور پرائم منسٹری کو لیڈری اور پرائم منسٹری تک محدود رکھیں، اور اس کو اس قدر نہ بڑھائیں کہ (بادشاہی) سے ٹکر لینے لگے، قدوائی صاحب نے مسکرا کر، پوچھا کس بات پر آپ اس قدر بگڑ گئے ہیں، میں نے کہا ارے آپ ابھی تو خود دیکھ چکے ہیں کہ میرے آتے ہی وہ روپوش ہوگئے ہیں، مزاج پرسی تو بڑی چیز ہے، انھوں نے مجھ سے صاحب سلامت تک نہیں کی۔ اتنے میں جواہر لال آگئے، میں منہ موڑ کر کھڑا ہوگیا۔ انھوں نے کہا جوش صاحب معاملہ کیا ہے، قدوائی صاحب نے سارا ماجرا بیان کردیا، وہ میرے قریب آئے اور مجھ سے کان میں کہا کہ مجھے اس قدر زور سے پیشاب آگیا تھا کہ اگر ایک منٹ کی بھی تاخیر ہوجاتی، تو پائجامے ہی میں نکل جاتا اور یہ عذر سن کر، میں نے انھیں گلے لگالیا۔

ایک مرتبہ کنور مہندر سنگھ بیدی نے مجھ سے کہا، میرے وزیر شری سچر نے یہاں سے میرا تبادلہ کردیا ہے۔ تو میں آپ سے یہ کہنے آیا ہوں کہ آپ اور بیگم پٹودی دونوں مل کر، پنڈت جی کے پاس جائیں اور میرا تبادلہ رکوادیں۔

دوسرے ہی دن ہم دونوں، پرائم منسٹر ہاؤس پہنچے، اپنے آنے کی اطلاع کی۔ بیگم پٹودی کو فوراً بلا لیا گیا اور میں منہ دیکھتا رہ گیا۔ جواہر لال کی اس بدوضعی پر مجھے تاؤ آگیا، اور یہ سوچ کر کہ میں وہاں سے اُسی وقت چلا جاؤں، کہ اُن سے پھر کبھی نہ ملوں، میں اٹھا ہی تھا کہ ان کے سکریٹری، غالباً پیارے لال صاحب آگئے۔ انھوں نے میری طرف نگاہ اٹھا کر کہا، کیا بات ہے جوش صاحب، اس قدر زور سے پانی برس رہا ہے، اور آپ آگ بگولا بنے کھڑے ہیں، میں نے ان سے سارا ماجرا بیان کرکے کہا اب میں یہاں نہیں ٹھہرنے کا۔ پیارے لال صاحب نے کہا آپ فقط دو منٹ، میری خاطر سے، ٹھہر جائیں۔ میں ٹھہر گیا۔ وہ سیدھے ان کے کمرے میں داخل ہوگئے اور دو منٹ کے اندر اندر، میں نے یہ دیکھا کہ وہ مسکراتے چلے آرہے ہیں، میرے قریب آتے ہی انھوں نے کہا جوش صاحب آپ کے تشریف لانے کی مجھے کسی نے اطلاع نہیں دی۔ آپ نے کس سے اطلاع دینے کو کہا تھا، میں نے کہا، بملا کماری جی کو، انھوں نے بملا کماری کو بلا کر پوچھا تم نے جوش صاحب کے آنے کی مجھ کو اطلاع کیوں نہیں دی۔ بملا کماری نے کہا میں نے 'لیڈیز فرسٹ' (پہلے خواتین) کے خیال سے جوش صاحب کا نام نہیں لیا، پنڈت جی نے ڈانٹ کر کہا 'نان سینس' Non Sence اور میرا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئے، اور کہا آپ بھی کنور مہندر سنگھ کا تبادلہ رکوانے کے خواہشمند ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں۔ انھوں

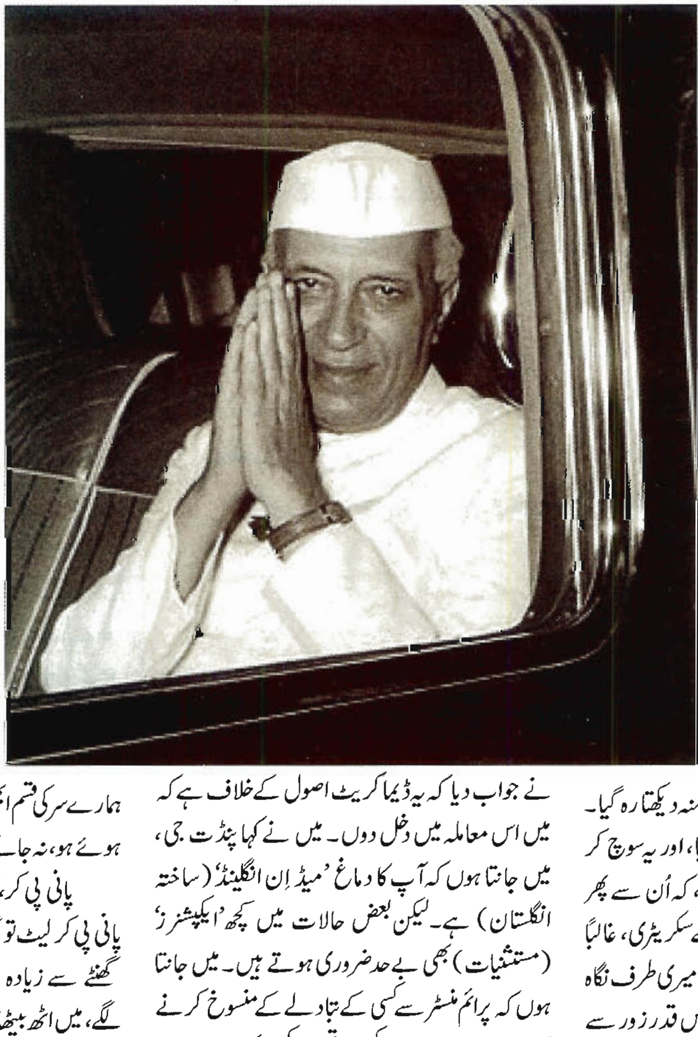

نے جواب دیا کہ یہ ڈیماکریٹ اصول کے خلاف ہے کہ میں اس معاملہ میں دخل دوں۔ میں نے کہا پنڈت جی، میں جانتا ہوں کہ آپ کا دماغ 'میڈ اِن انگلینڈ' (ساختہ انگلستان) ہے۔ لیکن بعض حالات میں کچھ 'ایکپشنز' (مستثنیات) بھی بے حد ضروری ہوتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ پرائم منسٹر سے کسی کے تبادلے کے منسوخ کرنے کا مطالبہ ایسا ہے جیسے ہم کسی ہاتی سے کہیں کہ میز سے ذرا ہماری دیا سلائی اٹھا لا لیکن آج تو میں ہاتی سے دیا سلائی اٹھوا کر دم لوں گا۔ وہ ہنسنے لگے اور تبادلہ منسوخ کردیا۔

اس کے بعد ان کے محکمے کے وزیر نے بہت زور مارا، لیکن پنڈت جی اپنی ضد پر قائم رہے۔

ایک مرتبہ میں، گرمی کی تعطیل منانے کے لیے شملے گیا ہوا تھا۔ تین چار روز کے بعد معلوم ہوا کہ پنڈت جواہر لال بھی آگئے ہیں۔ میں نے ان کی جائے قیام پر فون کیا۔ بدقسمتی سے رسیور اٹھایا ان کے ایک ایسے نووارد سکریٹری نے جو لہجے سے مدراسی معلوم ہورہا تھا۔ میں نے اس سے اپنا نام بتا کر کہا میں پنڈت جی سے ملنا چاہتا ہوں، اور آپ ان سے وقت مقرر کرکے، مجھے مطلع کریں، اس گنوار نے کبھی میرا نام سنا ہی نہیں تھا، اس نے بار بار مجھ سے میرا نام پوچھا میں نے کہا جوش ملیح آبادی، لیکن اُس کی سمجھ میں نہیں آیا، آخر کار میں نے جھلا کر کہا 'جے او اس ایچ' اس نے کہا مسٹر 'جاش' آپ کے 'پارٹیکلرز' (خصوصیات) کیا ہیں، میں نے کہا جو شخص میرے پارٹیکلرز نہیں جانتا، اس کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ ہندوستان میں رہے۔ یہ سن کر اس نے کہا۔ اوہ ایسے بولے گا، میں نے کہا اس سے زیادہ بولے گا۔ اس نے کہا آپ ہولڈ کیے رہیں، ہم پنڈت جی سے پوچھ کر بتائے گا اور وہ دو منٹ کے بعد اس نے کہا پنڈت جی ایسا بولتا ہے کہ ہم یہاں مجھے (مزے) کرنے آیا ہے، آپ ڈلی میں ملو۔''

یہ جواب سن کر، میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے ام الشعرا سے کہا، وزیر اعظم بن جانے کے بعد پنڈت جی کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ میں ابھی ان کو ایسا خط لکھوں گا کہ وہ تگنی کا ناچ ناچنے لگیں گے۔ بیوی نے کہا ہمارے سر کی قسم ابھی خط نہ لکھو، اس وقت غصے میں بھرے ہوئے ہو، نہ جانے کیا کیا لکھ مارو گے۔

پانی پی کر، تھوڑی دیر لیٹ جاؤ۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ پانی پی کر لیٹ تو گیا۔ مگر دل کی آگ بھڑکتی رہی۔ آدھ گھنٹے سے زیادہ لیٹ نہیں سکا۔ بستر پر انگارے دہکنے لگے، میں اٹھ بیٹھا، اور ایسا خط لکھا کہ اگر اُس قسم کا خط کسی تھانے دار تک کو لکھ بھیجتا، تو وہ بھی تمام عمر مجھے معاف نہ کرتا۔

خط روانہ کردینے کے دوسرے دن اندرا گاندھی کا فون آیا کہ آج تین بجے سہ پہر کو میرے ساتھ چائے پیجیے، میں نے کہا بیٹی وہاں تمھارے باپ موجود ہوں گے، میں ان سے ملنا نہیں چاہتا، انھوں نے کہا میں پتا جی

کو اپنے کمرے میں بلاؤں گی ہی نہیں۔ میں تیار ہو گیا۔

شام کو جب برآمدے میں پہنچا، ایک چپراسی نے اندرا کے کمرے کی طرف اشارہ کر دیا اور جب میں ان کے کمرے کی طرف بڑھا تو پیچھے سے آکر پنڈت جی نے میرا ہات پکڑ کر کہا۔ آیئے میرے کمرے میں۔ میں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ انھوں نے میرا ہات کھینچا، اور مروت کے دباؤ میں آکر، میں ان کے ساتھ ہو گیا۔

ان کے کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ میرے بزرگوں کے ملنے والے سر مہاراج سنگھ بیٹھے ہوئے ہیں، پنڈت جی نے کہا۔ مہاراج سنگھ یہ وہی جوش صاحب ہیں، جنھوں نے مجھ کو ایسا گرم خط لکھا کہ شملے کی ٹھنڈک میں پسینہ آ گیا، مہاراج سنگھ نے کہا، غنیمت سمجھیے کہ یہیں تک نوبت آئی، ان کے بزرگوں سے آپ واقف نہیں۔ وہ جس پر گرم ہو جاتے تھے۔ اسے ٹھنڈا کر دیا کرتے تھے، پنڈت جی ہنسنے لگے۔ گھنٹی بجائی۔ اُس مدراسی سکریٹری کو بلایا، اور جیسے ہی اس نے کمرے میں قدم رکھا وہ اس پر برس پڑے کہ تم نے مجھ سے پوچھے بغیر جوش صاحب کو ایسا بیہودہ جواب کیوں دیا۔ میں ابھی تمھارا ٹرانسفر کیے دے رہا ہوں، کل تم منسٹری آف کامرس میں چلے جانا۔

ان کا یہ برتاؤ دیکھ کر میں پانی پانی ہو گیا اور اُن کی بے مثال رواداری و شرافت پر نگاہ کر کے، میں ان کو گلے لگا کر، رونے لگا۔

اب اُن کی آخری شرافت و قدر شناسی کا ایک اور واقعہ سن لیجیے۔

اُن کے انتقال سے چند ماہ پیش تر، میں ہندوستان گیا اور اُن سے درخواست کی تھی کہ آپ کسی دن میری جائے قیام پر آکر میرے ساتھ کھانا کھائیں۔ ہر چند میں اُن کا دل توڑ کر، پاکستان آ گیا تھا لیکن اس کے باوجود، میری دعوت قبول کر کے وہ میری قیام گاہ پر آئے، کھانا کھایا اور دو گھنٹے سے زیادہ بیٹھے رہے۔ اس دعوت میں اُن کی آواز کے ضعف اور ان کے تبسم کے پھیکے پن سے یہ اندازہ کر کے میرا دل بیٹھنے لگا کہ اب وہ اپنی زندگی کے دن پورے کر چکے ہیں۔ چنانچہ وہی ہوا، اور میرے پاکستان سے واپس آ جانے کے دو تین ماہ بعد وہ آسمانِ شرافت کا آفتاب ڈوب گیا اور ہندوستان ہی میں نہیں سارے ایشیا میں تیرگی پھیل گئی:

آسماں راحق بود گر خوں ببادرد، برز میں

انگلستان کے شاہِ شطرنج کو چھوڑ کر، اس وقت کرۂ ارض پر جس قدر بھی منسٹر پریسیڈنٹ، ڈکٹیٹر اور بادشاہ سلامت ہیں وہ اپنے اپنے ملکوں میں اس قدر مغضوب و مبغوض ہیں کہ عامۃ الناس کے روبرو، جب ان کا نام لیا جاتا ہے تو وہ اس خوف سے اِدھر اُدھر دیکھ کر، کہ کہیں حکومت کا کوئی پٹھو تو قرب و جوار میں نہیں ہے، ان کے نام پر بے تحاشہ صلواتیں بھیجنے لگتے ہیں اور یہ اربابِ اقتدار جب اپنے ملک سے باہر جاتے ہیں یا باہر سے اپنے ملک آتے ہیں، تو چھوٹے چھوٹے، خوشامد خورے لیڈروں کی دھمکیوں اور بے ضمیر پولیس کے ڈنڈوں کی ضربوں سے لوگوں کو لاریوں میں، زبردستی، بھر بھر کر، ریلوے اسٹیشنوں کے پلیٹ فارموں اور ہوائی جہازوں کے میدانوں میں اس لیے جمع کر دیا جاتا ہے کہ وہ اُن اربابِ اقتدار پر، انگارے برسانے کی تمنائی باتوں سے جھوٹے پھول برسائے اور در پردہ انھیں کوسنے دینے والی زبانوں سے ان کے حق میں 'زندہ باد' کے کھوکھلے نعرے لگانے لگیں اور مٹھائی کے وعدے سے ایک پھسلا ہوا بچہ ان کی گردن میں ہار ڈال دے اور فروخت شدہ اخباروں میں اس شاندار استقبال کی، بڑی بڑی تصویریں، شائع فرما دی جائیں۔

اور ان میں سے جب کوئی معزول ہو جاتا یا مر جاتا ہے تو لوگ اس کی معزولی و موت پر مٹھائی بانٹتے، اور شکرانے کے سجدے ادا کرتے، اور پھر دو روز کے بعد اس کو اس طرح فراموش کر دیتے ہیں گویا اس کی ماں نے اسے کبھی جنا ہی نہیں تھا۔ لیکن جواہر لال کا معاملہ اس کے قطعی برعکس تھا، چند جن سنگھی لیڈروں کو چھوڑ کر، ہندوستان کا بچہ بچہ ان کی محبت کا دم بھرتا تھا اور ان کے انتقال کے بعد بھی دلوں پر ان کی محبوبیت کا اس قدر سکہ بیٹھا ہوا تھا کہ جس جگہ وہ جلائے گئے تھے وہاں میں نے خود ان آنکھوں سے دیکھا تھا کہ صبح، دوپہر اور شام کے وقت ہر عمر اور ہر طبقے کے زائرین کا اس قدر ہجوم رہتا تھا کہ سڑک رک رک جایا کرتی تھی اور لوگوں کی آہ و بکا سے فضا کانپتی رہتی تھی۔ اسے کہتے ہیں حقیقی محبوبیت اور اسے کہتے ہیں سچی لیڈری۔ نہرو میں خود کامی و کمینگی نہیں تھی۔ وہ برے آدمی بن ہی نہیں سکتے تھے اور اسی خطا پر کہا جاتا ہے کہ وہ اچھے سیاست داں نہیں تھے۔

بات یہ ہے کہ دراصل سیاست، پیغمبری کا ایک دوسرا نام ہے اور حقیقی سیاست وہ ہوتی ہے جو نوعِ انسان کو، پھولوں کی سیج پر لٹانے کے لیے خود خار اشگاف کانٹوں پر چلتی اور اللہ کے بندوں کا پیٹ بھرنے کے واسطے خود اپنے پیٹ پر پتھر باندھ کر، کام کرتی ہے۔ لیکن آج کی سیاست، اس قدر مسخ ہو چکی ہے کہ وہ نوعِ انسانی کو کانٹوں پر چلا کر، خود پھولوں کی سیج پر لیٹتی، اور اللہ کے کروڑوں بندوں کے پیٹوں پر پتھر بندھوا کر، فقط اپنا، اور اپنے چہیتوں کا پیٹ بھرتی ہے اور نہرو کی سیاست چونکہ موجودہ سیاست کے قطعی برعکس تھی، اس لیے جب یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اچھے سیاست داں نہیں تھے۔ میں اس کی تائید کرتا ہوں اس لیے کہ آج کے 'اچھے' سیاست داں کے واسطے یہ ایک لازمی شرط ہے کہ اصولِ خدمت و انسانیت کے اعتبار سے وہ ناقابلِ برداشت حد تک برا آدمی ہو۔ (اے لافانی جواہر لال، روحِ انسانیت کا سجدہ قبول کر)!!

■

ماخذ: یادوں کی برات، مصنف: جوش ملیح آبادی، اشاعت: 1982، ناشر: شالیمار بکس، کوچہ چیلان، نئی دہلی 2

■ جواہر لعل نہرو

میرا بچپن

خوش حال ماں باپ کا اکلوتا بچہ، خصوصاً ہندوستان کے گھرانوں میں، اکثر لاڈ پیار میں بگاڑ دیا جاتا ہے اور جب گیارہ برس کی عمر تک اس کے کوئی بھائی بہن نہ ہو، پھر تو وہ بگڑنے سے بچ ہی نہیں سکتا۔ میری دونوں بہنیں مجھ سے بہت چھوٹی ہیں اور ان میں بھی کئی سال کا فرق ہے اس لیے میرا بچپن تنہائی میں گزرا اور مجھے اپنی عمر کا کوئی ساتھی نہیں ملا، یہاں تک کہ اسکول کے بچوں کی صحبت سے بھی محروم رہا، کیونکہ مجھے کنڈر گارٹن یا کسی اور مکتب میں داخل نہیں کیا گیا، بلکہ گھر پر استانیاں اور اتالیق رکھ کر تعلیم دلائی گئی۔

ہمارے گھر میں تنہائی نہیں بلکہ خوب چہل پہل تھی، میرے رشتے کے بھائی بہن اور قریبی عزیز ملا کر بہت بڑا کنبہ تھا اور یہ سب ہندو خاندان کے دستور کے مطابق ایک ہی جگہ رہتے تھے، مگر میرے بھائی مجھ سے عمر میں بہت بڑے تھے، ان میں کچھ اسکول میں اور کچھ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے اور مجھے بچہ سمجھ کر اپنے کام میں اور کھیل میں شریک نہیں کرتے تھے۔ غرض میں اتنے بڑے گھرانے میں اپنے آپ کو بالکل اکیلا پاتا تھا اور زیادہ تر اپنے خیالات میں ڈوبا رہتا تھا یا کہیں الگ بیٹھ کر کھیلا کرتا تھا۔

ہم لوگوں کا اصلی وطن کشمیر ہے۔ اب سے کوئی سوا دو سو برس پہلے، اٹھارہویں صدی کے شروع میں، ہمارے پردادا کے باپ کشمیر کی پہاڑی وادی کو چھوڑ کر دولت اور شہرت کی تلاش میں نیچے کے زرخیز میدان میں آئے یہ وہ زمانہ تھا کہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد سلطنت مغلیہ کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ فرخ سیر ہندوستان کا بادشاہ تھا۔ ہمارے بزرگ جن کا نام راج کول تھا کشمیر میں سنسکرت اور فارسی کے عالم کی حیثیت سے امتیاز رکھتے تھے۔ جب فرخ سیر کشمیر گیا تو اس کی نظر عنایت راج کول پر پڑی اور غالباً اسی کے حکم سے وہ 1761 کے لگ بھگ ترکِ وطن کر کے دلی آ گئے۔ بادشاہ نے انھیں جاگیر عطا کی جس میں ایک مکان بھی تھا۔ یہ مکان نہر کے کنارے واقع تھا، جس کی وجہ سے راج کول نہرو کہلانے لگے۔ اب خاندان کا نام 'کول' کی جگہ 'کول نہرو' قرار پایا۔ آگے چل کر کول تو اڑ گیا اور صرف نہرو باقی رہ گیا۔

اس کے بعد جو بدامنی کا زمانہ آیا اُس میں ہمارے خاندان کو تقدیر نے بہت سے نشیب و فراز دکھائے۔ ہماری جاگیر گھٹتے گھٹتے بالکل ختم ہوگئی۔ میرے پردادا لکشمی نرائن نہرو نے 'سرکار کمپنی' کی ملازمت اختیار کی اور اس کی طرف سے دلی کے برائے نام دربار میں وکیل بن کر بھیجے گئے۔ میرے دادا گنگا دھر نہرو 1857 کی شورش سے پہلے کچھ دن دلی کے کوتوال رہے تھے۔ 1861 میں 34 برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔

1857 کے ہنگامے میں ہم لوگوں سے دلی ہمیشہ کے لیے چھٹ گئی اور ہمارے پرانے خاندانی کاغذات اور دستاویزیں بھی اسی گڑبڑ میں تلف ہوگئیں۔ ہمارا خاندان اپنی ساری املاک کھوکر اور بہت سے لوگوں کی طرح جو دلی کو چھوڑ کر بھاگ رہے تھے، آگرے پہنچا۔ میرے والد اس وقت تک پیدا نہیں ہوئے تھے مگر میرے دونوں چچا خاصے جوان تھے۔ ان کو تھوڑی بہت انگریزی بھی آتی تھی جس کی بدولت چھوٹے بھائی نے اپنے آپ کو اور اپنے خاندان والوں کو ناگہانی اور ذلت کی موت سے بچا لیا۔ وہ چند عزیزوں کے ساتھ جن میں ان کی ننھی سی بہن بھی تھی دلی سے جا رہے تھے۔ یہ لڑکی بعض کشمیری بچوں کی طرح بہت صاف رنگ کی تھی۔ رستے میں گورے ملے جنھیں شبہ ہوا کہ یہ کسی انگریز کی لڑکی ہے جسے میرے چچا چرا کر لیے جا رہے ہیں۔ ان دنوں الزام لگانا، سرسری تحقیقات کرنا اور سزا دینا یہ سارے مرحلے چند

منٹ میں طے ہوجاتے تھے اور کچھ تعجب نہیں تھا کہ میرے چچا اور دوسرے عزیزوں کو سب سے قریب کے درخت پر پھانسی دے دی جاتی۔ مگر خوش قسمتی سے چچا جان کی انگریزی دانی کام آ گئی اور تھوڑی سی مہلت مل گئی۔ اتنے میں کوئی شخص جوان لوگوں سے واقف تھا ادھر سے گزرا اور اس نے انھیں رہائی دلائی۔

چند سال ہمارا خاندان آگرے میں رہا اور اسی شہر میں 6 مئی 1861 کو میرے والد پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش سے تین مہینے پہلے دادا جان کا انتقال ہوچکا تھا، ان کی ایک قلمی تصویر ہمارے یہاں اب تک موجود ہے وہ مغل دربار کا لباس پہنے ہیں اور ان کے ہاتھ میں ایک خمدار تلوار ہے۔ ان کا چہرہ مہرہ بالکل کشمیری ہے پھر بھی یہ گمان ہوتا ہے کہ کسی مغل امیر کی تصویر ہے۔ اب خاندان کی پرورش کا بوجھ میرے دونوں چچاؤں پر پڑا جو عمر میں والد سے بہت بڑے تھے۔ بڑے چچا بنسی دھر نہرو حکومتِ برطانیہ کے محکمۂ عدالت میں نوکر ہوکر ایک جگہ سے دوسری جگہ تبدیل ہوتے رہے اور ان کا تعلق ایک حد تک خاندان سے قطع ہوگیا۔ چھوٹے چچا نند لال نہرو نے ایک ہندوستانی ریاست کی ملازمت اختیار کی اور دس برس تک راجپوتانے کی ریاست کھیتری میں دیوان رہے۔ اس کے بعد انھوں نے قانون سیکھا اور آگرے میں وکالت کرنے لگے۔

میرے والد نے انھیں کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے اور ان کے تعلقات میں برادرانہ الفت نے باپ بیٹے کی سی محبت کے ساتھ مل کر ایک عجیب شان پیدا کردی تھی۔ والد اپنے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے اس لیے ظاہر ہے کہ وہی اپنی ماں کے لاڈلے تھے۔ دادی جان اپنے ارادے کی پکی تھیں اور مجال نہ تھی کہ کوئی ان کی بات کو ٹال دے۔ ان کی وفات کو پچاس برس ہوگئے مگر ابھی تک بوڑھی کشمیری خواتین ان کا ذکر کرتی ہیں کہ وہ بڑے طنطنے کی بی بی تھیں اور اگر کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف ہوتو آفت مچادیتی تھیں۔

میرے چچا ہائی کورٹ میں جو نیا نیا قائم ہوا تھا، وکالت کرنے لگے اور جب وہ آگرے سے الہ آباد منتقل ہوا تو ہمارا خاندان بھی وہیں چلا گیا۔ اس وقت سے الہ آباد ہمارا وطن ہوگیا اسی شہر میں ایک مدت کے بعد میں پیدا ہوا۔ میرے چچا کا کام رفتہ رفتہ بہت بڑھ گیا اور ان کا شمار ہائی کورٹ کے چوٹی کے وکیلوں میں ہونے لگا۔ اس عرصے میں میرے والد کانپور اور الہ آباد میں اسکول اور کالج کی تعلیم کی منزلیں طے کررہے تھے۔ ابتدا میں انھوں نے صرف عربی فارسی پڑھی اور انگریزی کہیں بارہ چودہ برس کی عمر میں جاکر شروع کی۔ اس کم سنی میں وہ فارسی کی بہت اچھی استعداد رکھتے تھے۔ مگر اسکول اور کالج کے زمانے میں ان کی شہرت زیادہ تر ان کی شرارتوں کی وجہ سے تھی۔ وہ کوئی قابلِ تقلید طالب علم نہ تھے۔ پڑھنے لکھنے سے زیادہ انھیں کھیل کود اور من چلے پن کی حرکتوں سے دلچسپی تھی۔ کالج میں وہ فسادی لڑکوں کے سرغنہ سمجھے جاتے تھے۔ انھیں مغربی لباس اور مغربی تہذیب کا بہت شوق تھا حالانکہ اس وقت تک کلکتہ، بمبئی جیسے شہروں کے سوا اور جگہ ہندوستانیوں میں ان چیزوں کا رواج بہت ہی کم تھا۔ ان کی شوخیوں کے باوجود انگریز پروفیسر ان پر مہربان تھے اور اکثر ان مشکلوں میں ان کی مدد کرتے تھے جن میں وہ اپنی شرارت کی وجہ سے پھنس جاتے تھے۔ ان میں سے ایک میور سنٹرل کالج الہ آباد کے پرنسپل مسٹر ہیریسن بھی تھے۔ ان کا ذکر میرے والد آخر عمر میں ہم لوگوں کے سامنے بڑی محبت سے کیا کرتے تھے اور اپنی طالب علمی کے زمانے کا ایک خط جوان بزرگ نے انھیں لکھا تھا، انھوں نے بڑی احتیاط سے رکھ چھوڑا تھا۔

یونیورسٹی کے ابتدائی امتحانوں میں انھوں نے کوئی خاص امتیاز تو حاصل نہیں کیا مگر پاس ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ بی اے کے امتحان کی نوبت آئی اس کے لیے انھوں نے بہت کم محنت کی تھی اور پہلے پرچے کے جواب جو انھوں نے دیے، ان کے خیال میں بالکل ناقابلِ اطمینان تھے۔ یہ سمجھ کر کہ پہلا پرچہ بگڑ گیا ہے وہ کامیابی سے مایوس ہوگئے اور امتحان چھوڑ چھاڑ تاج محل کی سیر کرنے لگے (اُن دنوں یونیورسٹی کے امتحان آگرے میں ہوتے تھے) بعد میں ان کے پروفیسر نے انھیں بلا کر بہت ڈانٹا اور کہا کہ تمھارا پہلا پرچہ اچھا خاصا ہوگیا تھا۔ تم نے سخت حماقت کی کہ دوسرے پرچوں میں شریک نہیں ہوئے۔ بہرحال میرے والد کی یونیورسٹی کی تعلیم یہیں ختم ہوئی۔ بی اے انھوں نے پاس نہیں کیا۔

ان کے دل میں ترقی کی امنگ تھی اور وہ کوئی علمی پیشہ اختیار کرنا چاہتے تھے، ظاہر ہے کہ ان کی نظر قانون کے پیشے پر پڑی کیونکہ ان دنوں ہندوستان میں یہی ایک پیشہ تھا جس میں قابل آدمی کھپ سکتے تھے اور جسے اس میں کامیابی حاصل ہوجائے اس کے پوبارے تھے۔ پھر ان کے سامنے بھائی کی مثال بھی تھی چنانچہ انھوں نے ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان دیا اور اس میں اوّل نمبر پر پاس ہوکر سونے کا تمغہ حاصل کیا۔ اب انھیں اپنی پسند کا کام مل گیا یا یوں کہیے کہ جو کام ایک بار اختیار کرلیا اس میں کامیابی حاصل کرنے پر تل گئے۔

انھوں نے کانپور میں ضلع کی عدالتوں میں وکالت شروع کردی۔ ترقی کی دُھن میں انھوں نے خوب محنت کی اور تھوڑے ہی دنوں میں ان کا کام چل نکلا مگر کھیل تماشوں کے شوق کا وہی حال تھا اور اب بھی ان کا تھوڑا بہت وقت اس میں صرف ہوتا تھا۔ سب سے زیادہ دلچسپی انھیں کشتی سے تھی۔ کانپور کے دنگل اس زمانے میں مشہور تھے۔

کانپور میں تین سال کے کام سیکھنے کے بعد وہ الہ آباد آگئے اور ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد ان کے بھائی پنڈت نند لال نہرو کا یکا یک انتقال ہوگیا۔ یہ صدمہ میرے والد کے لیے بہت سخت تھا ایک طرف تو یہ غم کہ وہ پیارا بھائی جس نے بیٹے کی طرح پالا تھا جدا ہوگیا۔ دوسری طرف یہ فکر کہ خاندان کا سردار اور سب سے زیادہ کمانے والا فرد اٹھ گیا۔ اُس دن اسے ایک بہت بڑے کنبے کی پرورش کا بہت سا بوجھ اس کم عمری میں میرے والد پر پڑ گیا۔

انھوں نے دل میں ٹھان لی کہ وکالت میں کامیابی حاصل کرکے رہیں گے اور کئی مہینے تک اور سب کچھ چھوڑ کر اسی میں محو رہے۔ چچا کے قریب قریب کل مقدمے انھیں کو ملے اور چونکہ انھوں نے اس کام کو بری عمدگی سے انجام دیا اس لیے ان کی وکالت خوب چمکی اور وہ بات جس کی انھیں دلی تمنا تھی حاصل ہوگئی یعنی انھیں کام بھی زیادہ ملنے لگا اور آمدنی بھی بڑھ گئی۔ نوجوانی میں کامیاب وکیل ہوجانے کا خمیازہ انھیں یہ بھگتنا پڑا کہ ان کے محبوب پیشے نے جسے اپنی محبت میں شرکت گوارا نہیں، ان کی ساری زندگی پر قبضہ کرلیا۔ انھیں اور کسی ذاتی یا قومی کام کا وقت ہی نہیں ملتا تھا اور چھوٹی بڑی تعطیلوں کا زمانہ بھی وکالت ہی کی نذر ہوجاتا تھا۔ انھیں دنوں نیشنل کانگریس انگریزی جاننے والے اوسط طبقے کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کررہی تھی۔ میرے والد بھی اس کے بعض جلسوں میں شریک ہوئے اور اصولی طور پر اس کے حامی بن گئے۔ مگر اس زمانے میں انھیں اس کے کام سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ ایک تو انھیں اپنے پیشے سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ دوسرے وہ سیاسی مسئلوں اور قومی کاموں میں کچھ اٹکل بھی نہیں رکھتے تھے۔ انھوں نے ابھی تک ان چیزوں کی طرف توجہ نہیں کی تھی اور ان سے بالکل ناواقف تھے۔ وہ کسی ایسی تحریک یا انجمن میں شریک نہیں ہونا چاہتے تھے جس میں انھیں دوسرے کی پیروی کرنی پڑے۔ ان میں جو خود سری بچپن اور نوجوانی میں تھی، وہ بہ ظاہر دب گئی تھی،

مگر اصل میں اس نے ایک نئی یعنی طلب وقت کی شکل اختیار کرلی تھی۔ یہی چیز تھی جس نے انھیں ان کے پیشے میں کامیاب کیا اور ان کے دل میں خودداری اور اعتمادِ نفس کے جذبات پیدا کیے۔ انھیں لڑنے کا خصوصاً زبردست سے مقابلہ کرنے کا شوق تھا۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس زمانے میں وہ سیاسی میدان کے قریب تک نہ آتے تھے۔ سچ پوچھیے تو اس وقت تک نیشنل کانگریس کی سیاست میں لڑائی کو دخل بھی نہ تھا۔ بہرحال وہ اس کوچے سے نابلد تھے اور ان کے دل میں ہر وقت اپنے کٹھن پیشے کا خیال بسا رہتا تھا۔ انھوں نے ترقی کے زینے پر مضبوطی سے قدم جما لیا تھا اور ایک ایک سیڑھی کرکے اوپر چڑھتے چلے جاتے تھے۔ انھیں اس پر فخر تھا کہ اس میں کسی کے احسان یا عنایت کو دخل نہیں بلکہ یہ خود ان کے دماغ اور ارادے کا کرشمہ ہے۔

گو وہ ایک معنی میں قوم پرست تھے مگر انگریزوں کو اور ان کے طور طریقے کو بہت پسند کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہم ہندوستانیوں کا اخلاق اس قدر پست ہوچکا ہے کہ جو برتاؤ ہمارے ساتھ ہوتا ہے ہم ایک حد تک اس کے مستحق ہیں۔ وہ ان سیاسیوں کو کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے جو باتیں بہت بناتے ہیں اور کرتے کچھ نہیں حالانکہ وہ خود بھی نہیں جانتے تھے کہ آخر اور کیا کیا جائے۔ پھر ان کی ذاتی کامیابی نے ان کے دل میں یہ خیال بھی پیدا کردیا تھا کہ سب تو نہیں مگر بہت سے لوگ جب اور پیشوں میں ناکام رہتے ہیں تو سیاست کو لے بیٹھتے ہیں۔

آمدنی میں روز بروز اضافہ ہونے سے ہمارا زندگی کا طریقہ بہت کچھ بدل گیا۔ اِدھر آمدنی بڑھتی گئی اُدھر خرچ بڑھتا گیا۔ روپیہ جمع کرنے کو میرے والد اپنی کمانے کی قوت کی توہین سمجھتے تھے۔ انھیں بھروسا تھا کہ میں جب چاہوں اور جتنا چاہوں پیدا کرسکتا ہوں۔ کھیل تماشے کے شوق اور عیش وعشرت کے ذوق میں جو کچھ ملتا سب اڑا دیتے۔ رفتہ رفتہ ہمارے طرزِ زندگی میں مغربی رنگ گہرا ہوتا چلا گیا۔

یہ تھا ہمارے گھر کا نقشہ جو میں نے اپنے بچپن میں دیکھا۔

میرا بچپن دنیا کے بکھیڑوں سے محفوظ اور واقعات سے خالی تھا۔ میں اپنے رشتے کے بھائیوں کی بات چیت، جو میرے سن سے اونچی تھی سنا کرتا تھا اور بہت سی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ یہ لوگ اکثر اس کا ذکر کیا کرتے تھے کہ انگریز اور کرانی ہندوستانیوں سے حقارت کا برتاؤ کرتے ہیں اور ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ اس ذلت کو چپ چاپ نہ سہے بلکہ ڈٹ کر مقابلہ کرے۔ حاکم اور محکوم میں آئے دن اس طرح کے جھگڑے ہوا کرتے تھے اور ان کے قصے ہمارے گھر میں چھڑے رہتے تھے۔ یہ چرچا عام تھا کہ جب کبھی انگریز ہندوستانی کو مار ڈالتا ہے، اس کے ہم قوموں کی جیوری اُسے بری کردیتی ہے۔ ریلوں میں کچھ ڈبے انگریزوں

پنڈت جواہر لعل نہرو کی شادی کا دعوت نامہ

دعوت نامہ پنڈت موتی لعل نہرو کی طرف سے ہے اور اُردو میں ہے۔ اس کی اصل الہ آباد میوزیم کے نہرو سیکشن میں محفوظ ہے:

تمنا ہے کہ بتقریبِ شادی برخوردار جواہر لال نہرو، ساتھ دخترِ پنڈت جواہرمل کول، بمقام دہلی، بتاریخ 7 فروری 1916، تقاریبِ مابعد، تواریخ 8,9 فروری 1916، جناب مع عزیزان شرکت فرما کر مسرت و افتخار بخشیں۔

پنڈت موتی لال نہرو
آنند بھون، الہ آباد
منتظرِ جواب

اردو ایک جاندار زبان : نہرو

15، 16، 17 فروری 1958 کو انجمن ترقی اردو (ہند) کی طرف سے افتتاحی اجلاس میں پنڈت جواہر لال نہرو کی تقریر جو انھوں نے کرنل بشیر حسین زیدی کی خیر مقدمی تقریر کے بعد کی تھی۔ تقریر درج کی جارہی ہے۔

جنابِ صدر اور حضرات!

زیدی صاحب نے اپنی تقریر میں مجھے معلم کا خطاب دیا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے یہ کہنا ہے کہ میں خود کو اس خطاب کا حقدار نہیں سمجھتا ہوں۔ میں نے تو اردو باقاعدہ کسی اسکول میں بھی نہیں پڑھی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اردو میرے گھر کی زبان تھی جسے میں نے آنکھ کھول کر سنا اور بولا۔ پچھلے دو سال میں زبان کے معاملے میں کافی شور وغل ہوا ہے۔ کہیں کہیں دنگا فساد بھی ہوا اور عجیب فضا پیدا ہوگئی۔ جنوبی ہند میں تو ہندی کے خلاف باقاعدہ تحریک شروع ہوگئی ہے حالانکہ آئین میں چودہ زبانوں کو قومی زبان تسلیم کیا گیا ہے اور ہندی کو سرکاری زبان تسلیم کرلینے سے تامل یا کسی اور زبان کو نقصان نہیں پہنچتا۔ جنوبی ہند میں تو یہ مطالبہ شروع کردیا گیا ہے کہ انگریزی کو سرکاری زبان بنا دیا جائے۔ مجھے انگریزی زبان سے مخاصمت نہیں بلکہ میں نے اس زبان میں تعلیم حاصل کی اور اس سے محبت کرتا ہوں۔ میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ انگریزی یا کوئی اور بیرونی زبان دنیا کی رفتار سے باخبر رہنے کے لیے ہم کو معلوم رہنی چاہیے۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو بین الاقوامی ارتقا میں ہم پیچھے رہ جائیں گے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود میں انگریزی زبان کو ہمیشہ کے لیے سرکاری و قومی زبان نہیں مان سکتا۔ زبان کے معاملے میں کافی جوش وخروش پایا جاتا ہے اور غصہ چڑھ آتا ہے لیکن زبانیں حکومت کے مدد نہ کرنے سے ختم نہیں ہوسکتیں اور نہ اس کی مدد سے اونچی ہوسکتی ہیں۔ تاریخ میں مثالیں موجود ہیں کہ مضبوط زبانیں ہمیشہ قائم رہتی ہیں۔ زبان کو ایسی حیثیت حاصل ہوجاتی ہے جیسا کہ مذہب کی حیثیت ہوتی ہے کیا تشدد سے مذہب ختم کیا جاسکتا ہے؟ اسی طرح تشدد سے زبانیں ختم نہیں ہوتیں اور نہ انھیں دبایا جاسکتا ہے بلکہ اس سے تو ان میں نئی جان پیدا ہوجاتی ہے۔ ماضی میں بیسیوں برس تک پولینڈ کی زبان کو دبانے کی کوشش کی گئی لیکن اس کے باوجود پولینڈ کی زبان قائم رہی اور وہ آج یورپ کی بڑی زبانوں میں سے ایک ہے۔ زبان ہمیشہ اپنی کوششوں سے ہی بڑھتی ہے۔ سرکاری کوششوں سے اس میں جان نہیں پڑتی۔ ہاں اس سے اس کی ترقی کا راستہ صاف ہوجاتا ہے۔ پس اردو میں اگر جان ہے اور میں سمجھتا ہوں اس میں جان ہے تو یہ یقیناً بڑھے گی اور ترقی کرے گی چاہے اس میں رکاوٹیں پیش آئیں۔

ابھی میں نے یہاں کی نمائش کو دیکھا جس میں وہ کتابیں رکھی گئی ہیں جو گزشتہ دس برسوں میں آزادی کے بعد لکھی گئی ہیں۔ مجھے بتایا گیا ان کتابوں کی تعداد ساڑھے تین ہزار ہے۔ میں نہیں جانتا کہ دوسری زبانوں میں کتنی کتابیں چھپتی ہیں لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اکثر زبانوں میں اس سے کم ہی چھپی ہوں گی۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ایک زبان نے ترقی کی تو دوسری کو اس سے نقصان پہنچ جائے گا۔ سوچنے کا یہ طریقہ غلط ہے اور اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے جب

کے لیے محفوظ ہوتے تھے اور چاہے گاڑی میں کتنی ہی بھیڑ ہو (ان دنوں بھیڑ ہوتی بھی بہت تھی) کسی ہندوستانی کی مجال نہ تھی کہ ان ڈبوں میں گو وہ خالی ہی کیوں نہ ہوں سفر کر سکے، یہی نہیں بلکہ انگریز غیر محفوظ ڈبے پر بھی قبضہ کر لیتا تھا اور کسی ہندوستانی کو اس میں قدم رکھنے نہیں دیتا تھا۔ اسی طرح پارک وغیرہ میں بھی یورپیوں کے لیے محفوظ بنچیں ہوتی تھیں۔ مجھے بدیسی حاکموں کی ان بیہودہ حرکتوں پر بڑا غصہ آتا تھا اور جب کوئی ہندوستانی کلّہ بہ کلّہ جواب دیتا تھا تو میں بہت خوش ہوتا تھا۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ خود میرے بھائیوں یا ان کے دوستوں میں سے کسی کی جھڑپ انگریز سے ہو جائے۔ پھر تو ظاہر ہے کہ ہم سب کو بڑا جوش آتا تھا۔ میرے ایک رشتے کے بھائی جو گھر بھر میں سب سے مضبوط تھے، اربدا کر انگریزوں سے اور اس سے زیادہ کرانیوں سے لڑ بیٹھتے تھے، اس لیے کہ کرانی، شاید یہ دکھانے کو کہ ہم بھی حاکم قوم میں سے ہیں، انگریز عہدہ داروں اور تاجروں سے زیادہ بدتمیزی کرتے تھے۔ یہ جھگڑے خاص طور پر ریل کے سفر میں پیش آتے تھے۔

اگر چہ مجھے بدیسی حاکموں کا ہونا اور ان کا یہ برتاؤ بہت برا لگتا تھا لیکن جہاں تک یاد ہے، افراد کی حیثیت سے مجھے انگریزوں سے کوئی کد نہیں تھی۔ میں میم استانیوں کی نگرانی میں رہ چکا تھا اور اباجان کے انگریز دوستوں کو گھر میں آتے جاتے دیکھا کرتا تھا سچ پوچھیے تو میں دل میں انگریزوں کو اچھا سمجھتا تھا۔

شام کو والد سے ملنے بہت سے دوست آجاتے تھے۔ وہ اس بوجھ کو جو دن بھر دل پر رہتا تھا اُتار پھینکتے تھے اور سارا گھر ان کے قہقہوں کی آواز سے گونج اٹھتا تھا۔ ان کی ہنسی سارے الہ آباد میں مشہور تھی۔ بعض اوقات میں پردے کے پیچھے سے جھانک کر انھیں اور ان کے دوستوں کو دیکھتا تھا اور اس سوچ میں رہتا تھا کہ یہ بڑے بڑے لوگ آپس میں کیا باتیں کیا کرتے ہیں۔ اگر کسی نے مجھے دیکھ لیا تو میں پکڑ کر باہر لایا جاتا تھا۔ والد مجھے کچھ دیر اپنے گھٹنے پر بٹھا لیتے تھے اور میں ذرا سہما ہوا بیٹھا رہتا تھا۔ ایک بار میں نے انھیں کلیرٹ یا کوئی اور لال رنگ کی شراب پیتے ہوئے دیکھا۔ وِھسکی کو تو میں پہچانتا تھا اس لیے کہ میں نے والد

انگریزی حکومت کے زیر سایہ اردو ہندی کی بحث چلا کرتی تھی اور ایک دوسرے کے خلاف اس وقت کی حکومت کو درخواستیں دی جایا کرتی تھیں۔ ابھی تک ہمارے ذہنوں میں یہی جذبہ موجود ہے۔

اردو کو آئین میں تسلیم کر لیا گیا ہے لیکن اس پر اس طرح عمل نہیں ہوا جس طرح میں سمجھتا ہوں کہ ہونا چاہیے تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ اردو کو خاص کر ان صوبوں میں جہاں اس کے بولنے والوں کی کثرت ہے محبت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا ہے۔ زبانوں کی اس کشاکش میں ایک عجیب بات ہمارے ملک میں پیدا ہوگئی ہے۔ ایک صاحب اعتراض کرتے ہوئے کہیں گے ''کیا سنسکرت کے الفاظ تقریر میں بھر دیے ہیں۔ ہماری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔'' دوسرے صاحب فرمائیں گے ''اس قدر عربی فارسی کے الفاظ استعمال کیے ہیں کہ میری فہم سے بالاتر ہیں۔'' گویا ناواقفیت بھی ایک فخر کی بات ہے۔ یورپ میں لوگ اس طرح چیخ چیخ کر اپنی جہالت کا اعلان نہیں کرتے۔ اگر کسی نے تقریر میں فرنچ یا لاطینی الفاظ استعمال کیے ہیں تو سننے والے یہ ظاہر کریں گے کہ انھوں نے سب سمجھ لیا ہے۔ خواہ نہ بھی سمجھے ہوں۔ اس مثال سے یہ نہ سمجھیے کہ میں زبان کو دشوار بنانے کا حامی ہوں۔ زبان جتنی بھی سادہ اور عام فہم ہو بہتر ہے لیکن ان اعتراضات میں ایک منفی ذہنیت کارفرما ہے۔

زیدی صاحب نے جن عملی مشکلات اور رکاوٹوں کی طرف اشارہ کیا وہ دور ہونی چاہئیں۔ ووٹر لسٹ، اطلاع نامے اسی لیے ہوتے ہیں کہ پبلک انھیں پڑھے۔ انھیں اردو میں بھی چھپنا چاہیے۔ اگر کسی جگہ دو زبانیں ہیں تو وہ دو زبانوں میں چھاپے جائیں۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ چودہ زبانوں میں یہ سب چھپیں لیکن ایسا ممکن نہیں۔ پھر بھی جن صوبوں میں ایک دو زبانیں چلتی ہیں ان میں وہ چھپنے چاہئیں۔ میرے اپنے سکریٹریٹ میں حتی الوسع یہ کوشش رہتی ہے کہ جس زبان میں خط آئے اسی زبان میں جواب بھی دیا جائے۔ عدالتوں اور دوسرے شعبوں میں مسلیں وغیرہ تو دو زبانوں میں رکھنا غلط ہوگا۔ لیکن درخواستیں وغیرہ اردو میں ضرور لینی چاہئیں۔ اگر اس میں رکاوٹ پیدا کی جاتی ہے تو غلط ہے۔

جہاں تک بچوں کی تعلیم کا سوال ہے انھیں مادری زبان میں ہی تعلیم ملنی چاہیے۔ کیونکہ مادری زبان ہی میں بچوں کی بہترین نشو و نما ہوتی ہے۔ بمبئی کلکتہ اور دوسرے شہروں کے کارپوریشنوں کو چاہیے کہ بچوں کو ان کے گھر کی زبان میں تعلیم دلانے کی کوشش کریں خواہ ان کی تعداد دس ہی کیوں نہ ہو۔ اردو ایسی چھوٹی موٹی زبان تو نہیں کہ اس میں اتنے بچے بھی نہ ہو سکیں۔ یوپی دہلی اور پنجاب کے متعلق تو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں وہاں اردو والوں کی بہت بڑی تعداد ہے۔ اتر پردیش میں غالباً عملی طور پر اردو کی طرف توجہ نہیں دی جاتی لیکن ہمارا طرز مخالف کا نہیں ہونا چاہیے بلکہ دوستی کا، اس سے ہر ایک کا فائدہ ہے۔

مجھے اردو کے بارے میں بالکل فکر نہیں، وہ ایک جان دار زبان ہے اسے دبانا یا ختم کرنا ناممکن ہے لیکن تنگ دلی کے مظاہرے پر مجھے اکثر افسوس ہوتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ اردو ترقی کرے، پھلے پھولے۔ میں نے اردو کے سلسلے میں شکایات کے متعلق زیادہ نہیں کہا ہے وہ تو اپنی جگہ پر ہیں۔ میں نے اس موقعے پر یہ بتانے کی زیادہ کوشش کی ہے کہ زبانوں کے بارے میں ہمیں کس قسم کا طریقۂ کار اختیار کرنا چاہیے۔

◘

ماخذ: ماہنامہ'ایوانِ اردو'دہلی، مدیر: سید شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی، سنہ اشاعت: دسمبر 1989۔

کو اور ان کے دوستوں کو اکثر اسے پیتے ہوئے دیکھا تھا مگر اس نئی سرخ چیز کو دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میں نے دوڑ کر اماں جان سے کہا کہ ابا جان خون پی رہے ہیں۔

میرے دل میں والد کی بے حد عظمت تھی۔ میں انھیں قوت، ہمت اور عقل کا پتلا جانتا تھا اور جتنے آدمی میں نے دیکھے تھے سب سے برتر سمجھتا تھا۔ مجھے آرزو تھی کہ میں بھی بڑا ہو کر ان جیسا ہو جاؤں۔ مگر عظمت اور محبت کے ساتھ میرے دل میں ان کا ڈر بھی بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے انھیں نوکروں وغیرہ پر خفا ہوتے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ مجھے بہت ڈراؤنے معلوم ہوتے تھے اور میں خوف سے اور کبھی کبھی طیش سے کانپنے لگتا تھا کہ نوکروں کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ ان کا غصہ واقعی بہت برا تھا اور میں نے اس وقت کیا اس کے بعد بھی اس کی ٹکر کا غصہ نہیں دیکھا مگر یہ اچھا تھا کہ ان میں ظرافت کا مادّہ تھا اور ارادے کے بہت مضبوط تھے اس لیے عام طور پر ضبط سے کام لیتے تھے۔ عمر کے ساتھ ساتھ یہ ضبط کی قوت بڑھتی گئی اور آخر عمر میں شاید ہی کبھی انھیں پہلا سا غصہ آیا ہو۔

مجھے بچپن کی جو سب سے پہلی باتیں یاد ہیں اُن میں والد کا غصہ بھی ہے اس لیے کہ یہ مجھی پر نازل ہوا تھا۔ میں ان دنوں کوئی پانچ چھ سال کا ہوں گا۔ والد کی کام کی میز پر دو 'سوت قلم' (فاؤنٹین پین) رکھے ہوئے دیکھ کر میرا دل للچا گیا۔ میں نے کہا انھیں ایک ساتھ دو قلموں کی تو ضرورت ہونے سے رہی۔ اس لیے ایک میں نے لے لیا۔ بعد میں جب یہ دیکھا کہ اس قلم کی زور شور سے تلاش ہو رہی ہے تو میں بہت ڈرا مگر میں نے اقرار نہیں کیا۔ آخر پتہ چل گیا اور میرے جرم کا ڈھنڈورا پٹ گیا۔ والد بے حد خفا ہوئے اور میری خوب مرمت کی۔ میں درد کی تکلیف اور ذلت کے رنج سے بے تاب سیدھا ماں کے پاس پہنچا اور کئی روز تک میرے چھوٹے سے دُکھتے ہوئے جسم پر طرح طرح کے روغنوں کی مالش ہوتی رہی۔

مجھے یاد نہیں کہ اس سزا کی وجہ سے مجھے والد سے کوئی شکایت پیدا ہوئی ہو۔ غالباً میرا یہی خیال تھا سزا اچھی تو بالکل بجا، مگر حد سے بڑھ گئی تھی لیکن باوجود اس کے کہ میرے دل میں ان کی عظمت اور محبت اُسی طرح قائم رہی، اب میں ان سے ڈرنے بھی لگا۔ البتہ والدہ سے میں بالکل نہیں ڈرتا تھا کیونکہ یہ معلوم تھا کہ چاہے میں کچھ بھی کروں وہ درگزر سے کام لیں گی۔ ان کی بے اندازہ محبت کی وجہ سے میں ان کے ساتھ کسی قدر تحکم کا برتاؤ کرنے لگا تھا۔ والد سے تو کبھی کبھی ملنا ہوتا تھا اور ان کا ہر وقت کا ساتھ تھا اس لیے ان سے میں زیادہ مانوس تھا اور اپنے دل کی بات جو والد سے کبھی نہ کہتا ان سے کہہ دیا کرتا تھا۔ وہ چھریرے جسم اور چھوٹے سے قد کی تھیں اور تھوڑے دن میں میرا قد ان کے لگ بھگ جا پہنچا اس لیے میرے دل میں عمر کے فرق کا احساس کم ہو گیا اور وہ مجھے اپنے برابر کی معلوم ہونے لگیں۔ مجھے ان کی پیاری صورت اور ننھے منے ہاتھ پاؤں بہت بھلے لگتے تھے۔ وہ ایک نو وارد کشمیری گھرانے کی تھیں جسے اپنا وطن چھوڑے دو ہی پشتیں گزری تھیں۔

میرے دوسرے ہمراز والد کے ایک محرر منشی مبارک علی تھے۔ وہ بدایوں کے ایک آسودہ حال خاندان سے تھے، 1957 کی شورش میں ان کا گھر اجڑ گیا اور انگریزوں کی فوج نے ان کے خاندان کو قریب قریب ختم کر دیا۔ مصیبت نے ان کے قلب میں رقت اور درد پیدا کر دیا تھا اور وہ سب سے، خصوصاً بچوں سے بڑی نرمی سے پیش آتے تھے میرے لیے ان کا دامن جانا بوجھا امن کا ٹھکانا تھا۔ جب کبھی اُداس یا پریشان ہوتا انھیں کے پاس پہنچتا۔ ان کی شاندار سفید داڑھی کو دیکھ کر میں بچپن کی سادگی سے یہ سمجھتا تھا کہ یہ پراچین وقتوں کے آدمی ہیں جنھیں کئی جگ کی باتیں یاد ہیں۔ ان کے گود میں بیٹھ کر حیرت سے آنکھیں پھیلائے میں ان کی بے شمار کہانیوں میں سے الف لیلہ اور دوسری کتابوں کے قصے یا 57 اور 58 کے حالات سنا کرتا تھا۔ منشی جی کا انتقال بہت برسوں کے بعد میری جوانی کے زمانے میں ہوا۔ وہ مجھے اب تک یاد ہیں، اور ان کی یاد کو میں دل و جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔

میری والدہ اور چچی ہندوؤں کی دیومالا کی کہانیاں اور رامائن اور مہابھارت کی داستانیں سنایا کرتی تھیں۔ میری چچی یعنی پنڈت نند لال کی بیوہ کو ہندوستان کی پرانی کتابوں پر عبور تھا اور انھیں اس طرح کے ہزاروں قصے یاد تھے۔ اس لیے میری معلومات ہندوستان کی دیومالا اور کتھا مالا میں بہت بڑھ گئی۔

مذہب کا میرے دل میں محض ایک دھندلا سا تصور تھا۔ میں اسے عورتوں کا معاملہ سمجھتا تھا۔ والد اور میرے چچیرے بھائی مذہبی امور کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے اور ہنسی میں ٹال دیا کرتے تھے۔ گھر کی عورتیں طرح طرح کی رسمیں مناتی تھیں اور پوجا پاٹ کیا کرتی تھیں۔ مجھے یہ باتیں بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ اگر چہ میں اپنے بڑوں کی تقلید میں کسی حد تک بے پروائی کا اظہار کرتا تھا۔ کبھی کبھی میں والدہ کے ساتھ گنگا اشنان کو جایا کرتا تھا۔ بعض اوقات وہ مجھے الہ آباد، بنارس اور دوسری جگہوں کے مندروں میں یا ان سنیاسیوں کی خدمت میں جو بڑے مہاتما سمجھے جاتے تھے، لے جاتی تھیں مگر میرے دل پر ان چیزوں کا کوئی مستقل اثر نہیں پڑا۔

پھر بڑے بڑے تہوار تھے جیسے ہولی جس میں سارا شہر رنگ رلیاں مناتا تھا اور ہم ایک دوسرے پر خوب پانی چھینکتے تھے یا دیوالی جس میں ایک ایک مکان میں ہزاروں دیے بارے جاتے تھے۔ جنم اشٹمی میں آدھی رات کو کرشن کے قید خانہ میں پیدا ہونے کی خوشی منائی جاتی تھی۔ ہم لوگوں کے لیے آدھی رات تک جاگنا بہت مشکل تھا، دسہرے اور رام لیلا میں رام چندر جی کے لنکا جیتنے کی پرانی کہانی جلوس اور سوانگ کی شکل میں دہرائی جاتی تھی اور تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے تھے۔ ہم سب بچے محرم کا جلوس دیکھنے بھی جایا کرتے تھے جس میں علموں کے ریشمی پھریرے لہراتے تھے اور حسنؓ حسینؓ کی شہادت کا ماتم ہوتا تھا۔ دونوں عیدوں کو منشی جی اچھے اچھے کپڑے پہن کر عیدگاہ میں نماز پڑھنے جاتے تھے اور میں اُن کے گھر جا کر سویاں اور دوسرے لذیذ کھانے اڑاتا تھا۔ ان کے علاوہ ہندوؤں کے بہت سے چھوٹے چھوٹے تہوار جیسے رکھشا بندھن، بھیا دوج وغیرہ۔

ہم کشمیریوں کے بعض خاص تہوار بھی تھے جو اور ہندوؤں میں نہیں منائے جاتے تھے۔ ان میں سب سے بڑا نوروز یعنی ہمارے سمت کے شروع ہونے کا تہوار تھا۔ یہ ہم لوگوں کے لیے خاص خوشی کا دن ہوتا تھا۔ گھر بھر نئے کپڑے پہنتا تھا اور بچوں کو نقدی ملتی تھی۔

مگر ان سب تہواروں سے زیادہ مجھے اُس تقریب سے دلچسپی تھی جو ہر سال خاص میرے لیے ہوا کرتی تھی یعنی میری سالگرہ۔ اس دن میرے جوش کو کچھ نہ پوچھیے۔ صبح تڑکے میں ایک بڑی ترازو میں گیہوں وغیرہ سے تلتا تھا اور یہ چیزیں غریبوں کو بانٹ دی جاتی تھیں پھر نئی پوشاک پہن کر میں لوگوں سے تحفے لیتا تھا اور شام کو دعوت ہوتی تھی جس میں بہت سے لوگ جمع ہوتے تھے۔ اپنے آپ کو اِس برات کا دولہا سمجھ کر میں فخر سے پھولا نہ سماتا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ شکایت یہ تھی کہ میری سال گرہ بہت دن کے بعد آتی ہے بلکہ میں نے بہت کچھ شور بھی مچایا کہ یہ تقریب سال میں کئی بار ہوا کرے۔ اس وقت میں نہیں جانتا تھا کہ ایک دن وہ آئے گا جب سالگرہ بڑھتی ہوئی عمر کی نشانی بن کر ناگوار ہوا کرے گی۔

◘

ماخذ: ماہنامہ 'ایوانِ اردو' دہلی، مدیر: سید شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی، سنہ اشاعت: دسمبر 1989۔

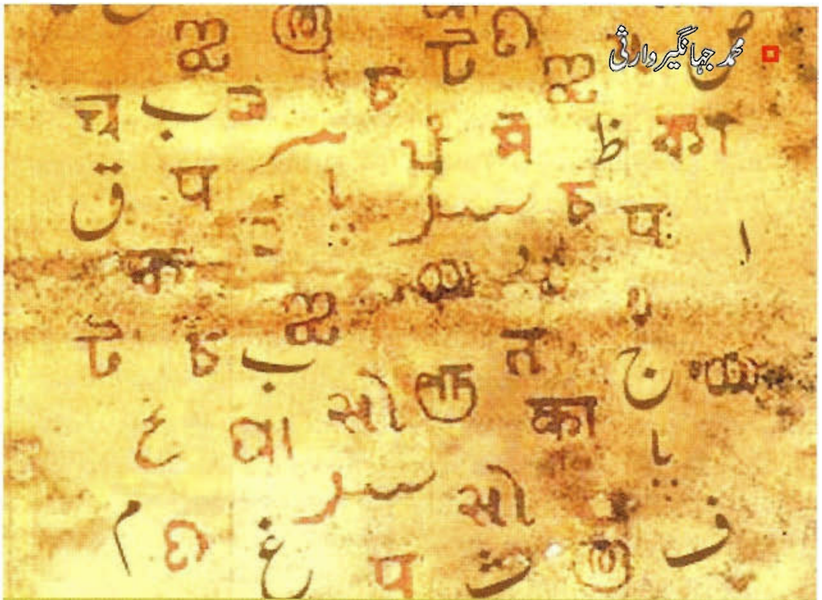

محمد جہانگیر وارثی

متھلانچل

میں اردو سے ملتی جلتی ایک بے نام بولی

آج کے بدلتے عالمی منظرنامے میں دنیا کی تمام تر زبانیں اب انسانی ترسیل کے عالمی نظام میں ایک دوسرے سے مربوط اور ہم آہنگ ہوتی جا رہی ہیں۔ آج دنیا کو جس نئے انداز سے زبانوں کے مسلسل نیٹ ورک کے طور پر دیکھ سکتے ہیں وہی انداز نئی نسل کو یہ باور کرانے میں مددگار ہوگا کہ ہم تمام لوگ ایک عالمی برادری کا حصہ ہیں اور اس نئے نظام میں انسانوں کی بنیادی حیثیت انفرادی معاشروں یا مملکتوں کی جگہ مجموعی طور پر عوامی ہونی چاہیے۔ ہندوستان جیسے کثیر لسانی ملک میں قوم کی سماجی و اقتصادی، ثقافتی و سیاسی زندگی میں زبان بہت اہم کردار نبھاتی ہے۔ زبان کا کثیر جہتی جذباتی مطالعہ ہمیشہ ہی ہندوستانی سیاست میں نمایاں رہا ہے۔ لسانی امور سے تعلق رکھنے والی تحریکیں ہندوستانی عوام کے جذبات کو ہمیشہ ہی برانگیختہ کرتی رہی ہیں۔ اپنی لسانی تحریک بھی ہماری تاریخ کا حصہ ہیں جن کے دوران نیم خواندہ اور ناخواندہ لوگ اپنی زبان کے دفاع میں یا اس کی اہمیت بڑھانے میں اپنی جان تک دینے کو آمادہ رہتے ہیں۔ آج معاشرے میں چھوٹی لسانی برادریاں بھی اس خطے کی سیاست میں نمایاں کردار نبھا رہی ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عہد جدید میں زبان کے فروغ کے لیے سیاست اتنی ہی اہم ہے جتنی اہم سیاست کی ترقی کے لیے زبان ہے۔

ملکی معیشت کو عالمی معیشت سے ہم آہنگ کرنے کے عمل کے ساتھ نقل وطن بھی بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے اور ایسے میں زبان اور تہذیب کے تحفظ کی طرف رغبت بھی بڑھی ہے۔ جنوبی ایشیا جغرافیائی لحاظ سے بھی ایک بہت اہم علاقہ ہے آج کے نئے عالمی نظام میں اس کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ اس خطے میں مختلف تہذیبوں، ثقافتوں اور زبانوں کا اجتماع ہے اس خطے کی ثقافتی، مذہبی اور لسانی کثرت دنیا بھر کے اسکالروں کو اپنی طرف متوجہ کرتی اور کھینچتی ہیں۔ اردو زبان اور تہذیب اس خطے میں دلکشی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ آج ہندوستان میں تین سو سے زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں ان میں سے بہت سی زبانیں اصل زبان سے نکلی ہوئی بولیاں ہیں۔

دراصل کسی بھی زبان کا فروغ اس کے استعمال سے ہوتا ہے اور یوں جب کوئی زبان اپنے ارتقا کے مرحلے سے گزر کر ایک باقاعدہ تحریری شکل اختیار کر لیتی تو وہ اس معاشرے کے لوگوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ بن جاتی ہے اور اپنے عہد کے لوگوں کی کیفیات اور احساسات کی عکاسی بھی کرتی رہتی ہے۔ ہر ملک کی زبان و ثقافت وہاں رہنے والے عوام کے دلوں کو آپس میں جوڑنے کا کام کرتی ہے۔ کسی بھی تہذیب اور ثقافت کا آئینہ وہاں کی زبانیں اور بولیاں ہوتی ہیں۔ زبان کی نہ کوئی سرحد ہوتی ہے اور نہ ہی زبان کسی سرحد کی محتاج ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی علاقے یا خطے کی بولیوں کو ہم زبان کا درجہ اس وقت تک نہیں دے سکتے جب تک کہ اس کا اپنا رسم الخط اور اس کا اپنا ادبی لٹریچر دستیاب نہ ہو۔ بولیاں کسی مخصوص علاقے کے رابطے کی زبان ہوتی ہیں اور اس خطے کی تہذیب اور ثقافت کا اس پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ جب اس میں ادب تخلیق ہونے لگتا ہے تو دھیرے دھیرے یہی بولی زبان کے طور پر اپنی پہچان قائم کر لیتی ہے۔ دراصل زبان آزادانہ طور پر ہی اپنے استعمال کے ذریعے ترقی پاتی ہے۔ آج عالمی سطح پر تقریباً چھ ہزار سے زیادہ بولیاں بولی جاتی ہیں اور انھیں بولیوں میں سے کئی بولیاں آج زبان کے طور پر اپنی پہچان بنا چکی ہیں۔ ہندوستان میں بولی جانے والی کچھ بولیوں کو زبان کا درجہ دے کر آئین میں جگہ دی گئی ہے۔ کسی بھی بولی کو زبان کی سطح پر تسلیم کیا جانا اس بولی کے بولنے والوں کی کاوش اور کامیابی کی پہچان ہوتی ہے۔

آج جہاں عالمی سطح پر اس تیز رفتار زندگی اور بڑھتے تکنیکی نظام نے جہاں ایک طرف عوام کی زندگی کے ہر پہلو کو اثر انداز کیا ہے وہیں دوسری جانب نئی نئی تحقیق سے مختلف بولیوں کی نشاندہی بھی ہو رہی ہے۔ کچھ عرصہ قبل بیرونی ملک کے محققین نے اروناچل پردیش میں ایک نئی بولی کی دریافت کی تھی جسے ماہرین لسانیات نے سراہا تھا۔ جہاں ایک طرف گلوبلائزیشن کی وجہ سے عام طور پر یہ مانا جا رہا ہے کہ زبانیں اپنا وجود کھوتی جا رہی ہیں ایسے میں ایک نئی بولی کی شناخت یقیناً ایک خوش آئند بات ہے۔

میری تحقیق بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے چوں کہ لسانیات کا طالب علم ہونے کے ناتے اکثر میرے ذہن میں یہ بات رہتی تھی کہ بہار کا وہ خطہ جو جغرافیائی اعتبار سے دربھنگہ، مدھوبنی، سمستی پور، بیگوسرائے اور مظفر پور پر مشتمل ہے اور یہاں پر کثیر تعداد میں مسلم اقلیتی فرقہ آباد ہے جن کی شناخت ایک الگ بولی بولنے کی حیثیت سے ہے۔ یہاں کے تعلیم یافتہ لوگ جب آپس میں بات کرتے ہیں تو یقینی طور پر اردو کا استعمال کرتے ہیں لیکن جب کوئی مسلمان دیہی علاقے میں جا کر بات کرتا ہے تو اس کی زبان تبدیل ہو جاتی ہے اور وہ وہاں کی علاقائی

بولی کا استعمال آپسی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ میں کافی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہے کہیں یہ بولی اس خطے میں اکثریت سے بولی جانے والی زبان میتھلی کی ذیلی شاخ تو نہیں، جب میں نے دونوں زبانوں کا موازنہ کیا تو پتہ چلا کہ دونوں زبانوں میں جملے کی ترتیب میں 'فعل' کا استعمال بالکل الگ طریقے سے کیا جاتا ہے، جو اردو کے بہت قریب ہے۔ یہاں ایک دلچسپ چیز جو میں نے محسوس کی جسے میں واضح بھی کر دینا چاہتا ہوں کہ اس خطے کے مسلم عوام کسی میتھلی بولنے والے سے جب گفتگو کرتے ہیں تو بالکل میتھلی میں کرتے ہیں، پھر جب کسی پڑھے لکھے انسان سے گفتگو کرتے ہیں تو یہ یا تو اردو میں بات کرتے ہیں یا پھر ہندی میں کرتے ہیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ یہ لوگ 'ہندوستانی' زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ ہاں جب اس خطے کے مسلم عوام آپس میں ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں تو ان کے بات کرنے کا انداز بالکل مختلف ہوتا ہے اور لہجہ بھی اردو اور ہندی سے بالکل الگ ہو جاتا ہے۔ یہ ایسی زبان بولتے ہیں جس کا کوئی نام اب تک نہیں ہے اور نہ ہی کوئی تحقیقی کام اب تک اس ضمن میں کیا گیا ہے اب لسانی اعتبار سے اس پر کام کر کے اس کے صرفی اور نحوی نظام تیار کرنے کی ضرورت ہے۔

دراصل اس بولی میں لکھا ہوا کوئی دستاویزی ثبوت بھی نہیں کہ اس کی ابتدا کی کوئی تواریخ کا پتہ چلے اور شاید اس وجہ سے ماہر لسانیت کی توجہ اب تک اس خطے کی طرف نہیں گئی۔ میں چوں کہ مقامی ہوں اور اتفاق سے لسانیات کا طالب علم بھی اس لیے میرے ذہن میں اس الگ بولی کو لے کر تجسس تھا اسی تجسس کو دور کرنے کے لیے میں نے کام کرنے کا ارادہ کیا۔ جب میں نے ہندی، اردو، میتھلی اور اس نئ 'بولی' کے جملوں کا موازنہ کیا تو معلوم ہوا کہ اس بولی کے 'فعل' کی ترتیب ہندی، اردو اور میتھلی سے بالکل الگ ہے۔ اس مختصر مضمون میں تفصیل کی گنجائش تو نہیں ہے لیکن اندازے کے لیے یہاں کم از کم جملے کی سطح پر ایک مثال سے فرق واضح ہو جائے گا۔

اردو جملہ	**میتھلی جملہ**
ہم جارہے ہیں	ہم جایۂ رہل چھی
ہندی جملہ	**نئی بولی**
ہم جارہے ہیں	ہم جار ہلیہ

دیے گئے جملوں سے یہ بات صاف طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ اس 'نئ بولی' کے جملوں کی بناوٹ ہندی، اردو اور میتھلی سے بالکل الگ ہے۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ ہندوستانی لسانی اعتبار سے دنیا کے سب سے دولت مند ملک ہونے کے باوجود اس ضمن میں کوئی تحقیقی کام کیوں نہیں ہوا۔ ہندوستانی زبانوں کے حوالے سے زیادہ تر کام بیرون ممالک کے یونیورسٹیوں میں کیا جاتا ہے یا پھر بیرون ملک کے ماہر لسانیات ہندوستانی زبانوں پر تحقیق کر رہے ہیں۔ شاید ان کے لیے یہ بات بہت دلچسپ ہے کہ آبادی کے حساب سے ہندوستان چین کے بعد دوسرا سب سے بڑا ملک ہے اور اتنی بڑی آبادی مختلف زبانوں کے بولنے کے باوجود کس طرح ایک ساتھ مل جل کر رہتی ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کو سمجھتی بھی ہیں اور بآسانی ایک دوسرے کے ساتھ ترسیل بھی کرتی ہیں۔

بہار حکومت کو بھی چاہیے کہ صوبائی سطح پر مسلمانوں کے لیے فلاحی اسکیمیں چلائے اور ان کے لسانی ورثے کو تحفظ فراہم کرے۔ ایسے میں مسلمانوں کے ذریعے بولی جانے والی 'نئی بولی' جو کہ شمالی بہار کے کئی اضلاع کے مسلمان آپس میں بڑے پیمانے پر بولتے ہیں ان کا ڈوکومینٹیشن (Documentation) ہونا چاہیے تاکہ اس نئی بولی کو کوئی نیا نام دیا جاسکے۔

60 کی دہائی میں کیا گیا لنگوسٹک سروے آف انڈیا 'Linguistic Survey of India' بھی ایک بیرون ملک ماہر لسانیات جارج گریرسن (George Grearson) نے کیا تھا جو آج تک رفرنس کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن ایک خوش آئند بات حالیہ دنوں میں یہ ہوئی کہ ہندوستانی حکومت نے پہلی بار ایک جامع لنگوسٹک سروے کروانے کا فیصلہ کیا ہے اور اس سروے پر کام بھی شروع ہو چکا ہے۔ ہماری کوشش اب یہ ہونی چاہیے کہ اس 'نئ بولی' کا کوئی نام دے کر اس سروے میں شامل کیا جائے تاکہ آئندہ آنے والے دنوں میں اس پر لسانی اعتبار سے کچھ کام کیا جائے۔

لسانیات کا طالب علم ہونے کے ناتے میرا یہ فرض بنتا ہے کہ اس خطے کے دانشور حضرات، ماہرین اور باشعور انسان کو اس 'نئ بولی' سے آگاہ کر دیا جائے اور ساتھ ہی ایک لائحہ عمل تیار کیا جائے تاکہ اس ضمن میں کوئی مثبت کام کیا جا سکے اور سرکاری سطح پر بھی اس بولی کو بچانے کے لیے کوئی پالیسی تیار کی جا سکے ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ عالم گیری کے اس بدلتے منظرنامے سے ایک خطے میں بولی جانے والی یہ 'نئ بولی' گم نہ ہو جائے۔

ایک طرف جہاں سچر کمیٹی میں یہ بات واضح طور پر سامنے آئی ہے کہ مسلمان اپنی زندگی کے ہر شعبے میں کافی پیچھے ہیں اور تعلیم کا معاملہ تو اور بھی زیادہ سنگین ہے، جب تک تعلیمی اعتبار سے مسلمانوں کی حالت بہتر نہیں ہوگی اس وقت تک ہم مجموعی طور پر قومی دھارے سے نہیں ہم آہنگ ہو سکتے۔ مرکزی حکومت کو چاہیے کہ سچر کمیٹی کی رپورٹ پر پوری طرح عمل درآمد کرے تاکہ ہندوستانی مسلمان معاشی، تعلیمی، سماجی اور لسانی سطح پر کچھ آگے بڑھ سکیں۔ اگر ان میں تعلیمی بیداری آئے گی تو وہ اپنی ذمے داریوں کو سمجھیں گے زندگی میں آگے بڑھنے کی کوشش کریں گے۔

بہار حکومت کو بھی چاہیے کہ صوبائی سطح پر مسلمانوں کے لیے فلاحی اسکیمیں چلائے اور ان کے لسانی ورثے کو تحفظ فراہم کرے۔ ایسے میں مسلمانوں کے ذریعے بولی جانے والی 'نئ بولی' جو کہ شمالی بہار کے کئی اضلاع کے مسلمان آپس میں بڑے پیمانے پر بولتے ہیں ان کا ڈوکومینٹیشن (Documentation) ہونا چاہیے تاکہ اس نئی بولی کو کوئی نیا نام دیا جا سکے۔

اب وقت آ گیا ہے کہ ماہر لسانیات، دانشور حضرات اور عوام کو آگے آ کر اپنی زبان اور تہذیب کے تحفظ کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ ایک لائحہ عمل تیار کر کے حکومت کی توجہ اس جانب مبذول کرائی جائے تاکہ حکومتی سطح پر بھی زبان کے سروے کا کام شروع کیا جا سکے اور ایک نئی زبان کی پہچان کی طرف آگے بڑھ سکیں۔ اس 'نئ بولی' کو نیا نام دینا بظاہر ایک مشکل کام لگتا ہے لیکن میرے خیال میں اگر ماہر لسانیات اور دانشور حضرات اگر ایک ساتھ بیٹھ کر غور و فکر کریں تو شاید یہ مشکل بھی آسان ہو جائے گی۔ اگر ہم مصمم ارادے کے ساتھ اور حکومت کے تعاون سے اس ضمن میں قدم اٹھائیں تو مجھے پورا یقین ہے کہ اس خوبصورت اور میٹھی 'نئ بولی' کو ایک نئی پہچان ضرور مل پائے گی۔

■

Dr. Jahangir Warisi, Washington University, USA

بچوں کا ادب اور اردو

ابن کنول

پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا تھا:

''بچے باغیچہ کی کلی کی طرح ہیں۔ ان کو احتیاط اور پیار کے ساتھ پالنا پوسنا چاہیے کیونکہ وہ قوم کا مستقبل اور کل کے عوام ہیں۔''

یہ آواز صرف جواہر لال نہرو کی نہیں بلکہ باشعور اور دور اندیش ہر شخص کی ہے۔ عمارت کی خوبصورتی اور پائیداری کا دار و مدار اس کی بنیاد پر ہے۔ اگر بنیاد میں کجی ہوگی تو عمارت بظاہر خوبصورت ہونے کے بھی اپنے وجود کو قائم نہیں رکھ سکے گی۔ بچے کسی بھی ملک اور تہذیب کی بنیاد ہوتے ہیں۔ ملک کے مستقبل اور تہذیب کے تحفظ کا انحصار بچوں کی تربیت اور پرورش پر ہے۔ محض دنیاوی آرام و آسائش یعنی عمدہ غذا، بیش قیمت لباس، عالی شان رہائش گاہ فراہم کرنے سے بچوں کے تئیں ہماری ذمے داریاں پوری نہیں ہو جاتیں بلکہ ان کی صحیح ذہنی تربیت ہماری بڑی ذمے داری ہے اور آج کی سمٹی ہوئی دنیا میں یہ بہت بڑا چیلنج ہے، الیکٹرانک میڈیا نے دنیا کو بہت چھوٹا کر دیا ہے اور بچوں کو وقت سے پہلے بڑا۔ آج سے تین چار دہائی قبل کے نوجوان کو جس بات کا علم نہیں تھا آج کا سات آٹھ سال کا بچہ اُسے جانتا ہے۔ اس تیز رفتاری میں بچوں کا بچپن کھوتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ تیز رفتاری ترقی کو ظاہر ضرور کرتی ہے لیکن بعض معاملات میں اس کے منفی اثرات بھی دکھائی دیتے ہیں۔ کچی عمر کے ناسمجھ اور نادان ذہن اچھے یا برے اثرات کو جلد قبول کرتے ہیں۔ ہمیں اپنے بچوں کو نئی سوچ اور نئے نظریات کے ساتھ ساتھ مشرقی تہذیب کی اُن اقدار سے بھی روشناس کرانا ہوگا جو مغربی تہذیب کی آندھی میں کھوتی جا رہی ہیں، پنچ تنتر اور الف لیلیٰ کے مشرقی قصوں کی جگہ ہیری پوٹر کی کہانیاں لے رہی ہیں۔ یہ ہمارے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بچوں کے لیے ایسا ادب تخلیق کیا جائے کہ وہ پڑھنے کے لیے مجبور ہوں۔ الیکٹرانک میڈیا کی چمک دمک سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن کتاب کی اہمیت کو ہر زمانے میں اوّلیت حاصل رہی ہے، الیکٹرانک میڈیا سے بچے وقتی طور پر محظوظ ہو سکتے ہیں لیکن کتاب کو اچھے دوست کی طرح ہر وقت اپنے ساتھ رکھا جاسکتا ہے اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جب کتاب میں ایک مقناطیسی قوت پیدا کی جائے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ھے کہ بچو ں کا ادب تخلیق کرنا بچوں کا کھیل ھے اور سنجیدہ تخلیق کار جب چاھے بچو ں کے لیے کہانیاں یا نظمیں تخلیق کرسکتا ھے لیکن یہ محض خوش فہمی ھے، بچو ں کا ادب تخلیق کرنا انتہائی مشکل عمل ھے، اسی لیے بہت کم تخلیق کار اس میدان میں جوھر دکھاتے ہوئے نظر آتے ھیں۔ بچو ں کا ادب تخلیق کرتے وقت بچوں کی پسند اور ان کی سطح پر اترنا پڑتا ھے، اپنی سوچ کو بچو ں کی سوچ سے ھم آھنگ کرنے کے بعد ھی بچو ں کے لیے ادب تخلیق کیا جاسکتا ھے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کا ادب تخلیق کرنا بچوں کا کھیل ہے اور سنجیدہ تخلیق کار جب چاہے بچوں کے لیے کہانیاں یا نظمیں تخلیق کر سکتا ہے لیکن یہ محض خوش فہمی ہے، بچوں کا ادب تخلیق کرنا انتہائی مشکل عمل ہے، اسی لیے بہت کم تخلیق کار اس میدان میں جوہر دکھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بچوں کا ادب تخلیق کرتے وقت بچوں کی پسند اور ان کی سطح پر اترنا پڑتا ہے، اپنی سوچ کو بچوں کی سوچ سے ہم آہنگ کرنے کے بعد ہی بچوں کے لیے ادب تخلیق کیا جاسکتا ہے۔ دراصل عام طور پر بڑے ادیب بچوں کے ادب کی تخلیق کی جانب اس لیے متوجہ نہیں ہوتے کہ بچوں کے لیے تخلیق کردہ ادب کو سنجیدہ یا معیاری ادب کے مقابلے میں کوئی قدر و قیمت حاصل نہیں ہوگی، اس کی حیثیت پرائمری درجہ کی نصابی کتابوں کی طرح سمجھی جائے گی جن میں شامل تخلیقات کو ناقدین ادب تنقید کے لائق بھی نہیں سمجھتے لیکن بڑے ادیب یہ بھول جاتے ہیں کہ اعلیٰ یا معیاری ادب کی طرف رغبت دلانے کے لیے بچپن ہی سے ذہنی تربیت کرنی ہوگی۔ کتاب سے محبت کرنا سکھانا ہوگا اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جب اس کی دلچسپی کو ملحوظ رکھ کر کتابیں قلمبند کی جائیں گی۔

یوں تو بچوں کی دلچسپی کے موضوعات بے شمار ہیں کہانیاں، قصے، ڈرامے، شاعری، لطیفے، کامکس وغیرہ۔ بچے اسکول کی نصابی کتابوں کے مطالعے سے فارغ ہو کر کچھ ایسا تفریحی ذریعہ چاہتے ہیں جو نصابی کتابوں کے مطالعے سے بوجھل ہونے والے دماغ کو سکون پہنچا سکے۔ جب بچوں کو اچھی اور دلچسپ کتابیں دستیاب نہیں ہوتیں تو وہ فلم اور ٹی وی کے معیاری اور غیر معیاری پروگراموں میں اپنی دلچسپی کا سامان ڈھونڈتے ہیں۔ آج کل ٹی وی کے بچوں کے پروگراموں کی بھی اخلاقی سطح دن بہ دن گرتی جا رہی ہے۔ چوبیس گھنٹے چلنے والے ٹی وی چینلز اپنے تمام پروگراموں کو معیاری نہیں رکھ پاتے،

یہاں تک کہ نیوز چینلز کی بھی سنجیدگی برقرار نہیں رہتی، کبھی کامیڈینس کو لاکر کھڑا کردیتے ہیں اور کبھی بھوت پریت کے بے بنیاد قصے بیان کرنے لگتے ہیں۔ بچوں کے ادیبوں اور شاعروں کو ایسا کچھ پیش کرنے کی ضرورت ہے کہ جو نہ صرف بچوں کو اخلاقی درس دے بلکہ تفریح کا سامان بھی مہیا کرے۔ بچوں کے لیے لکھی گئی تخلیقات کا مقصد تفریح برائے تفریح نہیں ہونا چاہیے بلکہ کیپسول کی طرح اس کے اندر ایسی دوا بھی پوشیدہ ہو جو ذہنی نشو ونما کو صحیح سمت عطا کرے۔ اس مقصد کے تحت بچوں کے لیے ایسی کہانیاں، مضامین یا نظمیں لکھی جاسکتی ہیں جن میں زندگی کے مختلف شعبوں کی عکاسی کی گئی ہو، ان میں نیکی اور بدی، اچھائی اور برائی، ہمدردی پیار اور شفقت کی صفات کو نمایاں کیا جاسکتا ہے۔ کائنات میں پھیلی چیزوں مثلاً چاند، ستارے، آسمان، بادل، پہاڑ، مختلف اقسام کے چرند پرند اور موسم کو اس طرح تخلیقات کا حصہ بنایا جائے کہ وہ تخلیق بچوں کے لیے نہ صرف تفریح کا ذریعہ بنے بلکہ معلومات بھی فراہم کرے قصے کہانیاں اپنے عہد کی تہذیب کا عکس ہوتے ہیں۔ دادی نانی کی زبانی بیان ہونے والے قصے بچوں کو تفریح کا سامان ہی مہیا نہیں کرتے تھے بلکہ آداب زندگی اور تہذیبی اقدار سے بھی روشناس کراتے تھے، ادیبوں کے لیے لازم ہے کہ وہ قدیم قصوں کو آج کے بچوں کے مزاج کے مطابق ڈھال کر پیش کریں۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں بے شمار ایسے قصے موجود ہیں جو بچوں کو اپنی طرف متوجہ کرسکتے ہیں، انھیں نئے اسلوب میں لکھنے کی ضرورت ہے، عموماً بچے حیرت انگیز اور تجسس سے بھرپور کہانیاں پسند کرتے ہیں ہمارے قدیم ادب میں ایسے قصے موجود ہیں جن میں دیو، جن، پری جیسی مخلوق موجود ہے، مغرب میں یہی قصے نئے زمانے کے سانچوں میں ڈھل کر مقبولیت حاصل کررہے ہیں۔

موجودہ عہد میں بچوں کا ادب تخلیق کرنے سے قبل بچوں کی دلچسپی دیکھنی ہوگی، نصابی کتابوں کے علاوہ کوئی بھی کتاب بچے اپنی دلچسپی کے بغیر پڑھنا پسند نہیں کریں گے۔ نصابی کتاب پڑھنا مجبوری اور ضرورت ہے لیکن دیگر کتب کو پڑھوانے کے لیے انھیں پرکشش بنانا ہوگا اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جب تخلیق کار بچوں کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھتا ہو، بچوں کا ادب لکھنے کے لیے ان کا ہم عمر بننا ہوگا، ایک اچھا فنکار ہر طرح کی تخلیق لکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اگر اُسے زبان وبیان پر قدرت حاصل ہے تو ہر عمر کے قاری کے لیے ہر طرح کے موضوعات کو قلمبند کرسکتا ہے۔ ایک قلمکار کے پاس مختلف قلم ہوتے ہیں کبھی وہ بزرگ بن کر لکھتا ہے اور کبھی جوانوں کے احساسات کو تحریر کرتا ہے۔ وہی قلمکار بچوں کی ذہنی سطح پر اتر کر انھیں ایسا روپ فراہم کرسکتا ہے جو انھیں Disney Land کی سیر کراسکے۔ بچہ ایسی تخلیقات چاہتا ہے جن میں کھوکر وہ اطراف کی زندگی سے بے نیاز ہوجائے۔ ایسا ادب تخلیق کرنے کے لیے بچوں کو قریب سے دیکھنا اور سمجھنا ہوگا ان کی پسند اور ناپسند کو جاننا ہوگا۔ اچھا ادب انسانی زندگی اور معاشرے میں انقلاب پیدا کردیتا ہے۔ وہی ادب اطفال عظیم کہلائے گا جو بچوں کی ذہنی تربیت میں معاون بھی ثابت ہو کیونکہ زمانے کی امیدیں اور خواب انھیں سے وابستہ ہیں۔ ملک، قوم اور معاشرے کے مستقبل کا انحصار بچوں ہی پر ہے۔ اگر ہمیں اپنے ملک، قوم اور معاشرے کو سنوارنا ہے تو صحت مند ادب تخلیق

ایک قلمکار کے پاس مختلف قلم ہوتے ھیں کبھی وہ بزرگ بن کر لکھتا ھے اور کبھی جوانوں کے احساسات کو تحریر کرتا ھے۔ وھی قلمکار بچوں کی ذھنی سطح پر اتر کر انھیں ایسا روپ فراھم کرسکتا ھے جو انھیں DisneyLand کی سیر کراسکے۔ بچہ ایسی تخلیقات چاھتا ھے جن میں کھوکر وہ اطراف کی زندگی سے بے نیاز ھوجائے۔ ایسا ادب تخلیق کرنے کے لیے بچوں کو قریب سے دیکھنا اور سمجھنا ھوگا ان کی پسند اور ناپسند کو جاننا ھوگا۔ اچھا ادب انسانی زندگی اور معاشرے میں انقلاب پیدا کردیتا ھے۔ وھی ادب اطفال عظیم کھلائے گا جو بچوں کی ذھنی تربیت میں معاون بھی ثابت ھو کیونکہ زمانے کی امیدیں اور خواب انھیں سے وابستہ ھیں۔

کرکے اُن کی صحیح تربیت کرنی ہوگی لیکن کچھ اس طرح کہ انھیں یہ احساس نہ ہو کہ ہمیں اخلاقی درس دیا جارہا ہے، اگر انھیں یہ احساس ہوگیا تو پھر وہ ان کتابوں کے ساتھ بھی وہی سلوک کریں گے جو نصابی کتابوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

بچوں کے لیے لکھی جانے والی علمی کتابوں میں بھی تفریحی عناصر شامل کرنے ہوں گے۔ بچوں کو وہ تمام علم دینا ہوگا جو صدیوں سے سینہ بہ سینہ چلا آرہا ہے۔ ضروری ہے کہ وہ تاریخ سے بھی واقف ہوں اور دنیائے جغرافیہ سے بھی۔ انسانی ایجادات کا بھی انھیں علم ہو اور اہم شخصیات کے کارناموں سے بھی واقفیت ہو، کائنات میں پھیلی ہوئی قدرتی چیزوں سے بھی آشنائی ہو اور ان کے فوائد اور نقصانات سے بھی واقف ہوں لیکن ان علوم کی کتابوں کو بچوں کے لیے تیار کرتے وقت بہت ہوشیاری اور احتیاط ضروری ہوگی۔ خشک موضوعات کو کہانی یا شاعری کی ہیئت میں ڈھال کر تر کرنا ہوگا۔

اردو میں یوں تو بچوں کے ادب کی روایت امیر خسرو کی پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں سے ہی سے شروع ہوجاتی ہے، لیکن باقاعدہ بہت کم ادیبوں اور شاعروں نے خاص طور سے بچوں کے لیے لکھا ہے، نظیر اکبرآبادی کی بعض نظمیں ایسی ہیں جنھیں بچے ذوق وشوق سے پڑھ سکتے ہیں۔ میر، (موہنی بلی)، غالب (قادرنامہ)، حالی (مرغی اور اس کے بچے) شبلی (صبح امید) آرزو (طالب علم) کے علاوہ اقبال کے یہاں بچوں کے لیے کئی قابل ذکر نظمیں موجود ہیں۔ بچوں کا ادب تخلیق کرنے والوں میں اسمٰعیل میرٹھی اکبرالہ آبادی، حفیظ جالندھری، چکبست، ذاکر حسین، کرشن چندر، امتیاز علی تاج، عصمت چغتائی، شفیع الدین نیر، جیسے نام شامل ہیں یہاں فہرست سازی میرا مقصد نہیں ہے۔ بیشتر ادیبوں اور شاعروں نے ایک ایک دو دو کہانیاں یا نظمیں بچوں کے لیے تخلیق کی ہیں اپنے آپ کو بچوں کے لیے وقف کردینے والے ادیب یا شاعر بہت کم ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کیا اُردو میں موجود بچوں کا ادب اس شکل میں موجود ہے کہ بچے اُس کی کشش سے اس کی طرف متوجہ ہوں، زمانہ چمک دمک کا ہے ہر چھوٹا بڑا خوبصورت چیز کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے اگر ہمیں بچوں کی توجہ حاصل کرنی ہے تو کتابوں کو تصویروں کے ساتھ خوبصورت شکل میں پیش کرنا ہوگا۔ اردو زبان میں بچوں کے اردو کے فروغ کے لیے لازمی ہے کہ اردو میں موجود بچوں کے ادب کو اس شکل میں پیش کیا جائے کہ بچہ کتاب کی خوبصورت دیکھ کر اٹھانے کے لیے مجبور ہو اور تصویریں دیکھ کر پڑھنے کے لیے اس کا دل چاہے اردو میں بچوں کے لیے جو کچھ موجود ہے اگر اسے بچوں کی ضرورت اور خواہش کے مطابق پیش کردیا جائے تو شاید اردو والوں کے بچے دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو پڑھنے کے لیے بھی آمادہ ہوجائیں۔

■

Prof. Ibne Kanwal, Deptt of Urdu, Delhi University, Delhi - 110007

وسیم بیگم

آج کی تانیثی شاعری کا منظرنامہ

اردو شعر و ادب میں تانیثی شاعری کا آغاز تو اٹھارویں صدی میں ہو چکا تھا اور کلاسیکی شاعرات نے غزل، نظم، مثنوی، قطعات، رباعیات، سلام اور سہرے لکھ کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ ان میں وہ تخلیقی قوت موجود ہے، جس کے ذریعے وہ اپنے خیالات نیز جذبات واحساسات کا اظہار موثر انداز سے کر سکتی ہیں۔ یہ وہ دور تھا جب عورت گھر کی چہار دیواری میں قید تھی اور اس کا گھر سے باہر نکلنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت عورت کو تعلیم سے بھی دور رکھا گیا کیونکہ مرد کو یہ خوف تھا کہ کہیں عورت تعلیم یافتہ ہو کر اپنے حقوق کی مانگ نہ کرنے لگے اس پس منظر میں ان خواتین کا شاعری کرنا ایک اہم ادبی کارنامہ ہے آہستہ آہستہ وقت گزرنے کے ساتھ شاعرات کی سوچ میں تبدیلیاں رونما ہوئیں اور انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے ایک عام عورت کے ذہن کو بدلنے کی کوشش کی اور ان کو گھر کی چہار دیواری سے باہر نکلنے نیز تعلیم حاصل کرنے پر اکسایا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ہر عورت میں ایسا شعور پیدا ہو کہ وہ خود صحیح اور غلط کا فیصلہ کر سکے اور اپنے اوپر ہونے والے ظلم وتشدد کے خلاف آواز اٹھائے نیز اپنی عزت نفس اور اپنی آبرو کی حفاظت کرتے ہوئے آزاد فضا میں سانس لینے کے قابل بنے۔ اس طرح اٹھارویں اور انیسویں صدی کی شاعرات نے بیسویں صدی کی شاعرات کے لیے راہ ہموار کی نیز ان کو ایک سازگار ماحول عطا کیا۔ اس دور کی شاعرات نے اپنی شاعری میں گاہ بہ گاہ تانیثی مسائل کو ضرور پیش کیا ہے لیکن اردو شعر و ادب میں تانیثیت نے باقاعدہ ادبی تحریک کی شکل بیسویں صدی کے نصف آخر میں اختیار کی جب کہ مغربی ممالک میں تانیثی تحریک (Feminist Movementle) کا آغاز تقریباً ایک صدی پہلے ہو چکا تھا اور اس دوران کئی اہم فیمنسٹ خواتین ادیبہ بھی سامنے آئیں۔ ان میں ایک اہم نام ورجینا وولف کا ہے جس نے اپنی اہم تصنیف "A Room of Ones Own" کے ذریعے خواتین میں اپنے حقوق حاصل کرنے کا جذبہ پیدا کیا اور ان کے تہذیبی تشخص پر اصرار کیا نیز ان کے سامنے آزادانہ سوچنے کا ایک نیا تصور قائم کیا جسے نسائی نقطۂ نظر سے تعبیر کیا گیا اس کے ذریعے عورت نے اپنے تشخص اور برابری کی حیثیت پر زور دیا۔ ورجینا وولف کے بعد دوسرا اہم نام فرانسیسی مفکر خاتون سیمون دی بوائر کا ہے انھوں نے نسائی تحریک کو مقبول عام بنانے میں ایک اہم رول ادا کیا مصنفہ نے اپنی کتاب "The Second Sex" میں خواتین کے احتجاج کو ایک فلسفیانہ سمت دی اس میں مساوات اور امتیازی سلوک پر اصرار کیا گیا اسی کے ساتھ جب ادب میں مابعد جدیدیت کا آغاز ہوا تو اس درمیان بہت سی خواتین نے تانیثیت پر قلم اٹھایا ان میں سب سے اہم اور معتبر نام ژولیا کرسٹوا کا ہے جو فرانسیسی دانشور ادیبہ ہیں۔ انھوں نے Women Time کا تصور دے کر نسائی تحریک کو مابعد جدید عہد میں داخل کیا ان کے علاوہ کئی دوسری مغربی خواتین نے بھی تانیثیت پر کئی اہم کتابیں لکھیں ان میں ایلین مورس کی "Literary Women" (1976) ایلین شوالٹر کی "A Literature of Virgin" (1974) میری جیکولین کی "Women Writing & Waiting about women" خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

ہندوستان میں جب 80 کے بعد مابعد جدیدیت باقاعدہ طور پر اردو شعر وادب میں داخل ہوئی اور اس کے زیر اثر یہاں 90 کی دہائی سے نسائی تحریک نے بھی زور پکڑا نیز تانیثیت کو شاعری و فکشن میں بے باکی اور احتجاجی لے کے ساتھ پیش کیا جانے لگا پچھلے پندرہ بیس سالوں میں خواتین کی تخلیقات میں نسائی تحریک کی گونج کو صاف سنا جا سکتا ہے اگرچہ اس کا احساس تو بہت پہلے سے ملتا ہے خصوصیت سے رشید جہاں اور عصمت چغتائی کی تحریروں میں لیکن بطور ادبی تحریک اس کے نقوش بعد میں نمایاں ہوئے۔

مابعد جدیدیت نے دراصل مرکزیت کا خاتمہ کر دیا تھا وہ مرکزیت جو صرف مرد سے جڑی ہوئی تھی اسی لیے اس خاتمے کو 'مرکزیت' کا خاتمہ تسلیم کیا گیا اسی کے ساتھ فیمنزم کی تحریک کو جلا ملی۔

خواتین کے سامنے دو بڑے مسائل تھے ایک تو ان پرانے تصورات کی نفی کرنا تھا جن میں عورت صدیوں سے پھنسی ہوئی تھی، یعنی عورت وہ حوا نہیں ہے جن کو جنت سے نکال دیا گیا بلکہ اسی کے ساتھ ایک نیا تصور بھی قائم کرنا تھا کہ حوا کے باعث ہی آدم کو بھی جنت سے نکلنا پڑا یعنی جنت میں جو بھی گناہ سرزد ہوا 'حوا' اکیلی اس کی ذمے دار نہیں تھی بلکہ 'آدم' بھی تھا اسی لیے دونوں کو سزا کا مستحق ٹھہرایا گیا اور دونوں کو جنت سے باہر نکلنے کا حکم صادر ہوا۔ دوسرے اردو شعر وادب کے کلاسیکی سرمایے کو ڈکنسٹرکٹ کر کے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

مرد کی جانب سے ہونے والے ظلم واستحصال کا شکار عورت ہمیشہ سے رہی ہے صرف اس کی شکلیں بدلتی رہی ہیں چودہویں صدی عیسوی میں بھی کئی ایشیائی ممالک میں والدین اپنی بیٹیوں کو زندہ زمین میں دفن کر دیا کرتے تھے اور اکیسویں صدی میں ان کو رحم مادر میں قتل کر دیا جاتا ہے والدین لڑکیوں کی تعلیم پر اس لیے خرچ کرنا نہیں چاہتے کیونکہ ان کے نزدیک لڑکی تو پرائی ہے اس کو دوسرے کے گھر جانا ہے اس لیے وہ تعلیم یافتہ ہو کر بھی کیا کرے گی یہ ظلم وستم یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ اور بڑھتا جاتا ہے جب وہ شادی ہو کر اپنی سسرال جاتی ہے اور ان کی فرمائشوں کو پورا نہیں کر پاتی تو شوہر اور سسرال والے مل کر اس کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں، اگر کسی وجہ سے ان کا منصوبہ فیل ہو جاتا ہے تو پھر شوہر اپنی زوجہ کو بہ آسانی طلاق دے دیتا ہے اور ہمیشہ کے لیے اس سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے ملک ہندوستان میں لڑکی بچپن سے لے کر جوانی تک بلکہ بڑھاپے تک مردوں کی ہوس کا شکار رہتی ہے اس کو صرف بے آبرو ہی نہیں کیا جاتا بلکہ ثبوت مٹانے کے لیے اس کا قتل بھی کر دیا جاتا ہے اس کے علاوہ آج کل مرد معصوم، مظلوم و بے بس خواتین کی خرید وفروخت بھی کر رہے ہیں اور ان کو غیر ممالک میں فروخت کر کے خوب دولت بٹور رہے ہیں۔

دور حاضر میں انھیں تانیثی مسائل کی طرف شاعرات نے توجہ دی ہے اپنی شاعری کے ذریعے یہ شاعرات پورے معاشرے کو ان مسائل پر غور وفکر کرنے کی دعوت دیتی ہیں تا کہ سماج سے ان سب برائیوں کو دور کیا جا سکے۔ مرد عورت کو کبھی برابری کا درجہ نہیں دیتا وہ ہمیشہ عورتوں پر اپنی بالادستی قائم رکھنا چاہتا ہے اس کے لیے وہ عورتوں کو قرآن پاک کی سورۂ نسا پڑھنے کا حکم دیتا ہے وہ عورتوں کو صرف ان کے فرائض یاد دلاتا ہے اور پورے قرآن پاک میں جہاں عورتوں کے حقوق کی بات آتی ہے ان کو نظر انداز کر دیتا ہے عذرا پروین نے اپنی نظم سپلائر II میں اس طرف معنی خیز اشارے کیے ہیں:

''کہ اے عورتو! ہم نے تم پر قائم کیا مردوں کو/ ...
بس یہی ہماری حاکمیت کا اعلان ہے ہم تو بس یہی جملہ

پڑھ کر سیر ہوئے/ چلے ہم/ خدا حافظ ... پڑھوتم ... / ... اور مومن چلے گئے/ گھروں میں سورۂ نسا پڑھتی ہوئی عورتیں چھوڑ کر/ ... ان کی نیت 'خالص مردانہ' / اور ان لکشمن ریکھاؤں کی سپلائر/ افغانستان سے ہندوستان تک پھیلے ہوئے ہیں!/ طرح طرح سے ہمیں لکشمن ریکھاؤں میں بٹھا کر'' (سپلائر/ اپارہ قباؤں کی سہیلی، صفحہ 120)

مرد ہمیشہ عورتوں کی اصلاح کی بات کرتے ہیں اپنی ہر تبلیغ میں عورت ہی ان کا موضوع ہوتی ہے، عورت کے لیے تمام احکام خداوندی میں فتوی اور سزائیں بھی اور جن مردوں کی وجہ سے یہ عورت بگڑ رہی ہے اور جن کی وجہ سے یہ سماج اور معاشرہ جس میں بہت سی برائیاں پیدا ہوچکی ہیں، ان خرابیوں کے پیدا کرنے والے کو کوئی سزا نہیں۔ سزا تو صرف عورت کے لیے ہے۔ عورتوں پر تو لکشمن ریکھائیں مقرر کردی ہیں اور خود ان کے سپلائر بن گئے۔ لیکن افسوس ان سپلائروں کے لیے کوئی سزا مقرر نہیں، یہ آزادی کے ساتھ پورے ملک میں گھوم رہے ہیں، ان مردوں کو ان کے کرموں کی سزا دینے والا کوئی نہیں۔ اس نظم کے دونوں حصوں میں شاعرہ نے مرد اساس معاشرے پر بھرپور طنز کیا ہے اپنی بات کو اور زیادہ قوی بنانے کے لیے انھوں نے قرآن پاک کی آیتوں کا بھی سہارا لیا ہے جس کی آڑ لے کر ہمارے مرد (مومن) عورت پر صدیوں سے ظلم کرتے آئے ہیں یہ نظمیں ہندوستانی معاشرے کی جیتی جاگتی تصویر ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں لیکن ان کا عنوان 'سپلائر' وہ شعری تاثیر نہیں رکھتا اردو شاعری جس کا تقاضہ کرتی ہے نیز ہماری سماعت پر گراں گزرتا ہے۔

جب ہم تانیثیت کی بات کرتے ہیں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ پہلے سے تیار شدہ نسائی سانچوں کو ماننے پر اصرار کیا جارہا ہے بلکہ نسائی ادب کے مطالعے میں نسائی جذبات واحساسات، تجربات ومشاہدات نیز نسائی شعور کارفرما ہوتا ہے جو مرد ادیب سے قدرتی طور پر مختلف ہوگا کیونکہ خواتین کے سوچنے کا ڈھنگ، ان کا رہن سہن، ان کی زبان ان کی جمالیات، سب مردوں سے مختلف ہوتی ہے، جس طرح سماجی اقدار سے خواتین جڑی ہوتی ہیں اس طرح مردان سے قربت نہیں رکھتے جب بھی تانیثی شعور کی بات آتی ہے تو مرد ناقدین کا سوال یہ ہوتا ہے کہ خواتین اس تانیثی ادب کو تخلیق کیوں کررہی ہیں؟ ان کو یہ سارا پروپیگنڈا کرنے کی کیا ضرورت ہے اور یہ مغرب سے آئی ہوئی تحریک ہے جس کو صرف فیشن کے طور پر اپنایا جارہا ہے۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے کہ عورت کا اپنا ایک نسائی شعور ہوتا ہے اس کے جذبات واحساسات ہوتے ہیں اس کے اپنے سماجی، معاشرتی، تہذیبی، ذہنی اور جنسی مسائل ہوتے ہیں اگر وہ ان مسائل کو اپنی تخلیقات میں پیش نہیں کرے گی تو اردو شعر و ادب ایک قابل قدر سرمایے سے محروم ہوجائے گا۔

تانیثی مسائل اپنے مختلف معنی ومفاہیم اور شناخت رکھتے ہیں جن پر سنجیدگی سے غور وفکر کی ضرورت ہے جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے کہ ہندوستان میں جہیز کی برائی ایک بڑا سماجی مسئلہ ہے اس سلسلے میں نسرین نقاش کی نظم 'جہیز' کے چند مصرعے دیکھیے:

جب ہم تانیثیت کی بات کرتے ہیں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ پہلے سے تیار شدہ نسائی سانچوں کو ماننے پر اصرار کیا جارہا ہے بلکہ نسائی ادب کے مطالعے میں نسائی جذبات و احساسات، تجربات و مشاہدات نیز نسائی شعور کارفرما ہوتا ہے جو مرد ادیب سے قدرتی طور پر مختلف ہوگا کیونکہ خواتین کے سوچنے کا ڈھنگ، ان کا رہن سہن، ان کی زبان ان کی جمالیات، سب مردوں سے مختلف ہوتی ہے، جس طرح سماجی اقدار سے خواتین جڑی ہوتی ہیں اس طرح مردان سے قربت نہیں رکھتے جب بھی تانیثی شعور کی بات آتی ہے تو مرد ناقدین کا سوال یہ ہوتا ہے کہ خواتین اس تانیثی ادب کو تخلیق کیوں کررہی ہیں؟ ان کو یہ سارا پروپیگنڈا کرنے کی کیا ضرورت ہے اور یہ مغرب سے آئی ہوئی تحریک ہے جس کو صرف فیشن کے طور پر اپنایا جارہا ہے۔

''اپنے دیش میں اکثر، صرف لکڑیاں، نہیں پارو لڑکیاں بھی جلتی ہیں/ ہم جو ابنِ آدم ہیں یعنی حضرت انساں/ اپنے گھر کی بہوؤں کو/ بینک کی عطا کردہ چیک بک سمجھتے ہیں/ ... اور جہیز کا نسخہ/ کارگر نہ ہونے پر/ انتقام کی مشعل لے کر اپنے ہاتھوں میں/ بے زبان کلیوں کو/ آگ کے جہنم میں زندہ جھونک دیتے ہیں/ اور ہمیں اس پر/ شرم بھی نہیں آتی۔ (جہیز دشتِ تنہائی، ص136)

یہ نظم جہیز کی اس لعنت کو ہمارے سامنے پیش کررہی ہے جو بہت تیزی سے ہمارے معاشرے میں بڑھ رہی ہے کیا اس تشدد کے خلاف آواز اٹھانا جرم ہے؟

فاطمہ حسن جو پاکستان سے تعلق رکھتی ہیں انھوں نے تانیثی تحریک کو جلا بخشنے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ ان اشعار میں شاعرہ نے خواتین کو بڑی مہارت اور چابکدستی کے ساتھ مرد حضرات کے برابر لا کھڑا کیا ہے:

آنکھوں میں نہ زلفوں میں نہ رخسار میں دیکھیں
مجھ کو مری دانش مرے افکار میں دیکھیں
پوری نہ ادھوری ہوں نہ کمتر ہوں، نہ برتر
انسان ہوں انسان کے معیار میں دیکھیں

ان شعروں میں شاعرہ نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ مرد کی طرح عورت بھی انسان ہے اس لیے اس کو بھی برابری کا درجہ دیا جائے، عورت کو اس کے حسن اور نسوانی خصوصیات میں نہ تلاش کیا جائے بلکہ اس کی ذہانت اور اس کی فکر سے پہچانا جائے، اس خدا کی نظر میں جب کوئی بڑا یا چھوٹا، کم تر یا برتر نہیں، سب برابر ہیں تو انسان نے مرد اور عورت میں یہ تفریق کیوں پیدا کردی؟ عورت کی تخلیقات کو قدر و منزلت کی نگاہ سے کیوں نہیں دیکھا جاتا؟ مرد ہمیشہ عورت کو حقارت کی نگاہ سے کیوں دیکھتا ہے، اس کو آج اکیسویں صدی میں بھی مساوی حقوق سے کیوں محروم رکھا جارہا ہے؟ خواتین تخلیق کاروں کے اور سماجی سروکار بھی ہیں سب سے بڑی سماجی بے انصافی اور سماجی ظلم تو نصف بہتر آبادی پر ہی ہوتا ہے، سماجی کارکردگی میں عورت کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ وہی بچوں کو جنم دیتی ہے، وہی پرورش کرتی ہے اس کی بیداری آنے والی نوجوان نسل اور پوری انسانیت کی بیداری ہے گویا نسائی احساس آگے چل کر گوناگوں سماجی مسائل اور بڑے پیمانے پر سماجی انصاف سے جڑ جاتا ہے۔

آج کی تانیثی شاعری کا منظرنامہ یہی ہے کہ پچھلے پندرہ بیس سالوں میں خواتین شعرا نے اپنی شاعری کے ذریعے ہرممکن کوشش کی ہے کہ عورت کو اس کے جائز حقوق ملیں، اس کو سماجی، سیاسی، معاشرتی اعتبار سے مرد کے برابر کا درجہ ملے۔ وہ اب مرد کے ظلم وستم کو خاموشی سے برداشت نہ کرے بلکہ اس کے خلاف احتجاج کرے۔ عورت بلند حوصلے کے ساتھ سر اٹھا کر جیے اور ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ عورت کا ذہن بدل رہا ہے اب وہ مرد کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر جینے کی متمنی ہے نیز تعلیم حاصل کرکے بڑے سے بڑے عہدے پر فائز ہورہی ہے، لیکن ابھی ملک میں اس قسم کی خواتین دس فی صد ہوں گی ابھی نوے فی صد عورتوں کو اپنے حق کی لڑائی لڑنی ہے یہ جنگ لمبی ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں۔

■

Dr. Waseem Begum, E/141, Street No 21, Zakir Nagar, Okhla, New Delhi - 110025

شائستہ فاخری

ہندوستانی ادب میں دلت کہانیاں

تانیثیت کی تحریک اور دلت تحریک کا علمی سطح پر قریب قریب ایک ساتھ اٹھنا یہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ دبے کچلے اور معاشرے کے روندے ہوئے لوگوں کی حمایت میں ایک آواز اٹھی اور اٹھ کر پھیلتی چلی گئی۔ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ یہ آواز ان روندے ہوئے لوگوں کی جانب سے اٹھائی گئی یا پھر ان تمام دانشوروں اور معاشرے کے نظام سے غیر مطمئن لوگوں کی طرف سے اٹھی جو ایک نئے نظام اور اس کی تبدیلیوں کے حامی رہے ہیں۔ بلکہ ہم تو یہی کہیں گے کہ جب تک اپنے اوپر ہونے والے ظلم کے خلاف ہم خود نہیں کھڑے ہوں گے تب تک ہماری حمایت میں کی جارہی کوئی بھی جنگ پورے طریقے سے کامیاب نہیں ہوسکتی۔

تانیثیت کی تحریک کی شروعات فرانس کی سیمون دی بوار کی آمد کے ساتھ ہوئی— جب اس نے پہلی بار یہ اعلان کیا کہ عورت اور مرد کو ایک پلیٹ فارم پر آنا چاہیے۔ ایک خاتون کی آواز نے عالمی سطح پر ہر زبان، ہر ادب اور تہذیب میں ایک ایسا صور پھونک دیا جس کے اثرات سے بچنا ناممکن ہوگیا۔ بحثوں، مباحثوں، تحریروں کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ پھر اس نے تھمنے کا نام نہیں لیا— مختلف طریقوں سے مردوں کے ذریعے سے عورتوں کا کم وبیش ہر جگہ کسی نہ کسی شکل میں استحصال ہوتا رہا ہے۔ کم سے کم ایشیائی ملکوں کے لیے یہ بات تو کہی ہی جاسکتی ہے۔

شودر، داس، نیچ، تچھ، چھوٹا طبقہ، ہلکا طبقہ، سوری طبقہ اور نہ جانے کتنے کلمات ہیں جو دلتوں کے لیے استعمال کیے جاتے رہے ہیں۔ دلت کا تصور ہر ملک میں اپنے طریقے، اپنے نظریے اور قوم کے حالات کے اعتبار سے الگ الگ رہا ہے۔ ہم یہاں صرف ہندستانی تہذیب کے پس منظر میں دلتوں کی بات کریں گے۔ اگر ہندستانی تہذیب کی بات کرتے ہیں تو ہمیں بھارتیہ سنسکرتی کی جڑوں تک پہنچنا ہوگا کیونکہ انھیں جڑوں کی بنیاد میں دلتوں کا ماضی سویا ہوا ہے۔ دلت پر تاڑنا یعنی دلت استحصال کی کہانی ایک دو سال کی نہیں، ایک دو صدی کی نہیں بلکہ ہزاروں سال پرانی ہے۔

تاریخ کے ورق پلٹتے ہیں تو رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اس قوم کے نصیب کو روندنے اور کچلنے کے لیے اعلیٰ ذاتوں کی ایک دو نہیں پوری تین طاقتیں تھیں جنھوں نے اپنے بھاری بھرکم قدموں کے نیچے دلتوں کی گردن کو رکھ کر مسلا ہے— کچلا ہے— پھر بھی جینا تو تھا ہی۔ دلتوں نے خود کو کیچوے جیسا بنالیا۔ زندہ رہنے کے لیے ان کا یہ شعوری عمل تھا۔ اور یہی وہ عمل تھا جس نے ہزاروں سال کا سفر کرتے ہوئے اکیسویں صدی میں آکر نیا رنگ دکھایا۔ ان دلتوں نے نہ صرف ان طاقتوں کو بے دم کردیا بلکہ اپنے کینچوے کی کھال کو چھوڑ کر کچھوے کی چال کو اپنا لیا۔ مجھے افسوس ہے کچھوے کی چال، لفظ کا استعمال کرتے ہوئے۔ مگر کیا کریں کہ اپنی فکر اس لفظ کو سوچنے کے لیے ہمیں مجبور کرتی ہے۔ مگر میرے اس لفظ پر تیوریاں چڑھانے والوں کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ خرگوش اور کچھوے کی دوڑ میں جیتا کون تھا۔

اس سے قبل کہ ہم اردو فکشن میں دلت لٹریچر کی بات کریں، ہمیں ہندستانی تہذیب کے پس منظر میں دلتوں کی تاریخ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنی ہوگی۔

ویدک کلچر میں جاکر جب ہم پرانوں کے صفحے پلٹتے ہیں تو وشنو پران میں ان کا ذکر ملتا ہے— وشنو کے منہ سے برہمن، باہو (بازو) سے چھتری، جانگھ سے ویشیہ اور چرنوں (پیروں) سے شودر پیدا ہوئے۔ جنھیں چتر وڑ کہا جاتا ہے۔

त्वन्मुरवाद बाहमणास्त्वस्तो बाहोः क्षत्रमजायत
वैश्यास्तवोरुजाः शुद्रास्तव पदभ्यां समुद्रताः—
विष्णु युराज

یہاں برہمن، چھتری، ویشیہ، دلتوں کے لیے کسی بھاری بھرکم ہاتھی سے کم نہ تھے۔ منواسمرتی میں کہا گیا ہے کہ برہما نے اس کارخانۂ جہاں کو چلانے کے لیے اپنے جسم سے ان چار وانوں کو جنم دیا۔

پوڑانک مت ہے کہ جب ایک دور ختم ہورہا ہوتا ہے اور دوسرے عہد کی شروعات ہونے والی ہوتی ہے تو معاشرے میں افراتفری پھیلتی ہے۔ اس افراتفری کو روکنے کے لیے ہی نئے نظام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ معاشرے کو اس طرح تقسیم کرنا وقت کی ضرورت

> دلت کہانیاں فن اور ٹکنک کو نہیں بلکہ زندگی کے کڑوے سچ کو ہو بہ ہو رکھنے کے عمل میں لگی رہی ہیں۔ سپاٹ زمین پر لکھی ان کہانیوں میں غیر ارادتاً آئی ہوئی علامتیں چونکانے والی لگتی ہیں۔ جیسے ہو والا کی کہانی میں 'ویاجی' کا مکان جلنے اور پھر بننے کی جو جدوجہد ہے وہ علامتی پیرائے میں بیان کی گئی لگتی ہے۔ ویاجی کا مکان بنتے ہی اونچی ذات والوں کے ذریعے جلادیا جاتا ہے۔ ابھی ویاجی کی چتا بھی نہیں جل پائی تھی کہ اس کا بیٹا مکان کی بنیاد کھودنا شروع کردیتا ہے اور اس بار وہ برساتی والے مکان کی نہیں بلکہ دومنزلہ پکے مکان کی بنیاد کھودتا ہے۔ کیونکہ بیٹے کو اپنے باپ کا خواب پورا کرنا تھا۔ مکان یعنی تحفظ حاصل کرنے کا خواب محض دو آنکھوں کا نہیں بلکہ پوری دلت برادری کا ہے۔

تھی۔ یہیں پر ایک بات اور صاف طور پر کہی گئی ہے کہ برہ مڑ کرت یوگ کے چھتری، تریتا یوگ کے ویشیہ، دواپر یوگ کے شودر کلیگ کے ہیں۔

اگر وایواور براہمن پران کی اس بات کو مانا جائے تو موجودہ عہد جسے ہم کلیگ کہہ رہے ہیں، دلتوں کا یگ ہے— پوڑانک کال میں ہی یہ بات بھی واضح کردی گئی کہ آلام ومصائب پچھلے جنم کے اعمال کا ہی نتیجہ ہیں۔ اس سوچ نے شودروں کو اور بھی شرم سار کیا۔ وہ داس کہلائے جانے لگے۔ جو غلام ہے اسے آزاد زندگی جینے کا حق نہیں۔ یہ ہم نہیں ہمارے معاشرے کی سوچ کہتی ہے۔

غلامی کا یہی وہ نظریہ تھا جس نے دلتوں کے مقدر کی تحریر میں سیاہ رنگ بھر دیا۔ بدلتے وقت اور عہد کے حساب سے سیاہی بھی بڑھتی گئی۔ بیسویں صدی کے شروعاتی پچاس سالوں تک اس کا چہرہ بد سے بدتر ہوتا رہا۔

آزادی کے بعد دلت تحریک نے کروٹ لی۔ ریزرویشن کی روپ ریکھا تیار کرنے کے لیے کالیلکر کمیٹی بنائی گئی۔ سیاسی سرپرستی کی بات آگئی تو دلتوں نے اپنا پرچم آپ اٹھایا۔ بابا بھیم راؤ امبیڈکر اور جیوتی با پھولے جیسے مسیحا سامنے آئے۔ تحریک نے زور پکڑا— منڈل کمیشن بنا اور اب اس کی رپورٹ کو لاگو ہونے کے بھی 21 سال پورے ہو چکے ہیں۔ اس کمیشن کے بعد سے ہندستانی سیاست، ہندستانی معاشرہ اور اس کے نظام کا چہرہ بدلنا شروع ہوا۔

کسی بھی ملک کے جب سیاسی پس منظر بدلتے ہیں تو اس کا سیدھا اثر اس ملک کے ادب پر پڑتا ہے۔ ہندستانی زبانیں اور ان کے ادب بھی اس تحریک سے متاثر ہوئے۔ یہاں یہ بات بھی واضح کرنا بہت ضروری ہے کہ جہاں ہندستان کی دوسری زبانوں اور لٹریچر میں دلت تحریک بہت نمایاں ہو کر سامنے آئی وہیں اردو ادب میں اس تحریک کا اثر ہوا لیکن لہجہ شائستگی کا رہا۔ اس کی بھی وجہ ہے مگر ہم اس وجہ کی تفصیل میں نہ جا کر سیدھے دلت ساہتیہ کے پیرائے میں ہندستانی ادب کی بات کرتے ہیں۔

شاید پہلی دلت کہانی کا تخم اسی دن پڑ گیا تھا جب دلت کو داس کہا گیا۔ دلت لٹریچر کی خاص بات یہ ہے کہ ان کی کہانیوں میں جمالیات تلاش کرنے والوں کو مایوسی ہوگی کیونکہ جن کی زندگی میں جمالیات کا تصور نہ ہو ان کے چہرے اور عمل میں جمالیاتی حسن کیسے آسکتا ہے۔ ایک دلت کی زندگی اذیت، تکالیف، غیظ وغضب اور جدوجہد کی حسیت سے بھرپور ہے۔ ایک دلت کو محبت کرنے کا اختیار نہیں تھا۔ جہاں عشق نہیں وہاں جمالیات کا تصور ہی بے معنی ہو جاتا ہے۔

ہندی زبان میں دلت کہانیاں لکھنے والوں میں اوم پرکاش بالمیکی کا نام اہم ہے۔ سورج پال چوہان نے اپنی آپ بیتی ''سن تپت'' میں اپنی زندگی کا سارا درد انڈیل کر رکھ دیا۔ یہ درد ان کی کہانیوں میں بھی نظر آتا ہے۔ ان کی کہانی سازش ہی دیکھ لیجیے۔ دلتوں کے خلاف کی جانے والی سازش اس کہانی کا موضوع ہے۔ بینک منیجر شرما ہیڈ کلرک ستیش بھاردواج کو کچھ یوں سمجھا رہا ہے۔

''مستقبل میں دھیان رکھنا کوئی بھی نیچ ذات کا نوجوان اپنا دھندہ شروع کرنے کے لیے بینک سے قرضے کے لیے عرضی دیتا ہے تو اس کے خاندانی دھندے میں ہی لگنے کے لیے اصرار کرنا ہے۔ اسے ایسا یقین دلاؤ کہ وہ اپنا خاندانی دھندہ چھوڑ کر دوسرے دھندوں کا تصور

بھی نہ کرے...... اگر یہ اچھوت اپنا خاندانی دھندہ بند کر کے کوئی نیا دھندہ کرنے لگیں گے تو آنے والی نسلیں ہمارے گھروں کی گندگی کیسے صاف کریں گی۔ اس حالت میں گھر کی گندگی کیا تم خود صاف کرو گے؟''

موہن داس نیمش رائے کی دلت کہانی 'اپنا گاؤں'، شیوراج سنگھ بے چین کی کہانی 'ہڈیوں کے الفاظ'، پربلاد چندر داس کی 'لٹکی ہوئی شرط' پریم کپاڈیا کی 'ہریجن'، پرشوتم ستیہ پریمی کی لکھی ہوئی کہانی 'بدلہ' کا شمار بھی اچھی دلت کہانیوں میں ہوتا ہے۔

مراٹھی دلت کہانی نویس یوگی راج باگھ مارے کی کہانی 'گزرے سیر' میں اس المیہ کو واضح کیا گیا کہ انسانی لاشوں کے ڈھانچے فروخت کر کے زندہ رہنا ہی ایک خاص طبقے کی مجبوری ہے۔ لیکن وہ آپس میں مل جل کر دکھ درد بانٹ لینے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ وہ ہار نہیں تسلیم کرتے۔ زندہ رہنے کی خواہش ان کے اندر مضبوطی سے پر پھیلائے ہوئے ہے۔

بابوراؤ باگل کی کہانی 'جب میں نے ذات چھپائی' میں دلتوں کے دلوں میں جمی اس ذلت کا کلیان ہے جو انھیں سچے من سے زندگی جینے نہیں دیتی۔ اس طرح دیا پوار کی کہانی 'صلیب'، انا بھاؤ ساٹھے کی 'شمشان میں سونا'، وامن ہووال کی 'منزلوں والا مکان'، ارجن ڈانگلے کی 'بدھ ہی مرا پڑا ہے' یہ سب مراٹھی ادب کی چند ایک اہم کہانیاں ہیں۔

دلت کہانیاں فن اور تکنک کو نہیں بلکہ زندگی کے کڑوے سچ کو ہو بہو رکھنے کے عمل میں لگی رہی ہیں۔ سپاٹ زمین پر لکھی ان کہانیوں میں غیر ارادتاً آئی ہوئی علامتیں چونکانے والی لگتی ہیں۔ جیسے ہو والا کی کہانی میں 'ویاجی' کا مکان جلنے اور پھر بننے کی جو جدوجہد ہے وہ علامتی پیرائے میں بیان کی گئی لگتی ہے۔ ویاجی کا مکان بنتے ہی اونچی ذات والوں کے ذریعے جلا دیا جاتا ہے۔ ابھی ویاجی کی چتا بھی نہیں جل پائی تھی کہ اس کا بیٹا مکان کی بنیاد کھودنا شروع کر دیتا ہے اور اس بار وہ برساتی والے مکان کی نہیں بلکہ دومنزلہ پکے مکان کی بنیاد کھودتا ہے۔ کیونکہ بیٹے کو اپنے باپ کا خواب پورا کرنا تھا۔ مکان یعنی تحفظ حاصل کرنے کا خواب محض دو آنکھوں کا نہیں بلکہ پوری دلت برادری کا ہے۔

ارجن ڈانگلے کی کہانی 'اور وہ مر گیا' دلتوں میں پھیلی ہوئی قدیم دقیانوسی تہذیب پر گہری چوٹ کرنے والی کہانی ہے۔

تیلگو ادب میں بھی دلت کہانی خوب خوب لکھی جا رہی ہے اور اچھی لکھی جا رہی ہے۔ دلوں میں گہرے بیٹھے دکھ درد کا اظہار کرتی یہ کہانیاں خاموشی سے بہت کچھ سمجھا جاتی ہیں۔ آچاریہ کو لک لوری اپناک کی کہانی 'گاؤں کا کنواں'، پی۔ رام کرشنا ریڈی کی کہانی 'وہ کیوں نہیں بولے' تلمر لاکلاندھی کی لکھی دلت کہانی 'سمجھوتہ' اسی نظام سے نکلی کہانیاں ہیں۔

گجراتی ادب بھی دلت کہانیوں سے بھرا پڑا ہے۔ ہریش منگلم کی ذاتی، دلپت چوہان کی 'ٹھنڈا خون'، موہن پرمار کی 'بے داغ'، اروند ویگڑا کی 'جھولا'— یہ بھی کہانیاں آپ بیتی یا درد کا اظہار ہیں۔

جب کوئی تحریک شروع ہوتی ہے تو ہر زبان کے ادب میں یہ تحریک خوشبو کی طرح چھا جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کہیں کم کہیں زیادہ اثر ہوتا ہے۔ پنجابی ادب بھی اس سے متاثر ہوا۔ اتروجیت کی کہانی 'بچھو' میں اونچی ذات کے مزدور کی آنکھوں کی چمک ایک دلت وکیل اندر سنگھ کٹاریا کو پریشان کرتی ہے۔ نام ایک انسان کی کتنی

بڑی پہچان ہوتی ہے— بچھو کہانی میں دلتوں نے اپنا نام ہی بدل کر اونچے کل کے نام رکھ لیے— چوپڑہ اور کٹاریہ میں ایک بات تو مشترک تھی کہ دونوں نے اپنی اصلی ذات برادری کی ڈھول اپنے اوپر سے جھاڑ دی تھی اور اپنے نام کے ساتھ اونچی ذاتوں کے نام 'چوپڑہ' اور کٹاریہ چپکا لیے تھے۔ چوپڑہ مہتر اور کٹاریہ چمار ماں باپ کی اولاد تھے۔

کیا اسے ایک خاموش بغاوت نہیں کہی جاسکتی—؟ ہاں کچھ بغاوتیں ایسی ہی ٹھنڈی ہوتی ہیں مگر رفتار تیز ہوتی ہیں۔

ملیالم کہانی میں ہم نارائن کی دلت کہانی 'واعظ کا جنم' کا ذکر کرنا چاہیں گے۔ ''انسان ہمیشہ سے پاپی رہا ہے۔ گناہوں سے ہوکر اس کا جو دائمی سفر ہے وہ نجات کے لیے ہے کیا—؟ کہانی کی شروعات انہیں جملوں سے ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ اپنی رفتار پکڑتی ہے۔

ہندستانی ادب میں ایسی بے شمار کہانیاں ہیں جو دلتوں کے دکھ درد، انتقام اور نظام حاضر میں تبدیلی کی ترجمان بن کر خاموش کھڑی، وقت کے بدلاؤ کا انتظار کررہی ہیں۔

اس تحریک کا اثر اردو ادب پر بھی پڑا مگر اس شدت سے نہیں جتنی شدت سے دوسری زبانوں میں نظر آیا۔ اس کی وجہ بھی صاف ہے کہ اردو تخلیق کار ابھی ان مسائل اور موضوعات میں الجھا ہوا ہے جو خالص اس کے لیے یعنی اس کی قوم پر عذاب کی شکل میں چھائے ہوئے ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس نے دنیا جہان سے آنکھیں موند رکھی ہیں۔ اپنے ملک کے ساتھ ساتھ عالمی مسائل بھی اردو لٹریچر کا حصہ رہے ہیں۔ جہاں عام ہندستانی زبانوں میں دلت کہانیاں آرہی ہیں تو اردو ادب اس سے اچھوتا کیسے رہ جاتا۔ یہ بھی سچ ہے کہ اردو میں دلت کہانیاں کم لکھی گئی ہیں مگر جو لکھی گئی ہیں پوری شدت سے لکھی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں اقبال مجید، ذوقی، غضنفر وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

اقبال مجید کی 'آگ کے پاس بیٹھی عورت' ایک اچھی دلت کہانی کہی جاسکتی ہے۔ دلت سماج ہندستانی تہذیب میں کسی ناسور کی طرح رہا ہے۔ صدیوں سے اپنے آقاؤں کے ظلم وستم کو سہتے ہوئے جیسے انھیں ذلت سہنے کی عادت پڑ گئی ہو۔ انھوں نے یہ آسانی قبول کرلیا کہ وہ ہماری سوسائٹی کے 'مل' ہیں اور 'مل' (گندگی) میں سانسیں بھرنا ہی ان کا مقدر ہے۔ آگ کے پاس بیٹھی عورت نے بیٹھے بیٹھے ہی اتنی خاموشی سے ایسا با کمال عمل کردکھایا جس کا تصور اب تک کی کسی دلت خاتون نے شاید ہی کیا ہو۔ کہا جاتا ہے کہ گھورے کے دن بھی پلٹتے ہیں۔ ہم انھیں گھورا نہیں کہہ رہے ہیں مگر ان کا معاشرہ کسی گھورے سے کم نہ تھا۔ بہر حال جیسے تبدیلیاں پہلے آئی تھیں اور انھیں ہندستانی تہذیب کا حاشیہ مان لیا گیا تھا، ویسے ہی تبدیلیوں کی ہوا نے حاشیے (دلتوں) کو حاشیے پر رکھ کر ایسا فٹ نوٹ بنادیا جسے پڑھے بغیر آگے بڑھنا جیسے خود کو نامکمل چھوڑ دینے جیسا ہوتا۔ اقبال مجید نے اسی فٹ نوٹ پر آکر دلت سماج کے بدلے رویے اور ان کے

اس تحریک کا اثر اردو ادب پر بھی پڑا مگر اس شدت سے نہیں جتنی شدت سے دوسری زبانوں میں نظر آیا۔ اس کی وجہ بھی صاف ہے کہ اردو تخلیق کار ابھی ان مسائل اور موضوعات میں الجھا ہوا ہے جو خالص اس کے لیے یعنی اس کی قوم پر عذاب کی شکل میں چھائے ہوئے ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس نے دنیا جہان سے آنکھیں موند رکھی ہیں۔ اپنے ملک کے ساتھ ساتھ عالمی مسائل بھی اردو لٹریچر کا حصہ رہے ہیں۔ جہاں عام ہندستانی زبانوں میں دلت کہانیاں آرہی ہیں تو اردو ادب اس سے اچھوتا کیسے رہ جاتا۔ یہ بھی سچ ہے کہ اردو میں دلت کہانیاں کم لکھی گئی ہیں مگر جو لکھی گئی ہیں پوری شدت سے لکھی گئی ہیں۔اس سلسلے میں اقبال مجید، ذوقی، غضنفر وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

آقاؤں کی پست ذہنیت پر وار کرتی ایک ایسی کہانی کو الفاظ کا لباس پہنایا جسے ہم نئے عہد کی ایسی کہانی کہہ سکتے ہیں جو آج کے کنزیومر ورلڈ کا آئینہ بھی ہے، جس میں بدلتے معاشرے کی مختلف تصویریں مختلف رنگوں میں اپنا عکس چھوڑتی ہیں۔ اور شدت سے اپنی پہچان بناتی ہیں۔

دلت سماج کے مردوں کی بات جانے دیجیے، عورت نے کیا کچھ ستم نہ اٹھایا۔ اس خبر کو یاد کیجیے جب ایک اونچی ذات کے حیوان مرد نے دلت عورت کی شرم گاہ میں وہ لاٹھی ڈالی تھی جس لاٹھی کا استعمال وہ ان کے مردوں پر کیا کرتا تھا۔ (شیومورتی کی کہانی)

یہ تصور سے پرے ہے کہ دلت سماج کی دبی کچلی روندی عورتوں میں انتقام کی وہ آگ آج موجود نہ ہو— معاشرے کے اس بدنما چہرے سے اردو تخلیق کار کیسے غافل رہ سکتے تھے— اقبال مجید کا افسانہ ''آگ کے پاس بیٹھی عورت'' وہ عورت ہے جو ایک پنڈت کو اس گندے گلاس میں پانی پلاتی ہے جس میں وہ سور کے بیمار بچے کو دودھ پلاتی تھی۔

اس کے بعد افسانہ نگار نے کتنی نزاکت سے اس عورت کے جذبات کی عکاسی کی ہے کہ اس کے چہرے پر ایسا سکون آگیا جیسے پیشاب کی حاجت سے فارغ ہونے کے بعد آتا ہے۔

بات اگر یہیں ختم ہوجاتی تو کوئی بات نہ تھی مگر بات وہاں پہنچتی ہے جہاں سے آتش فشاں پھٹا کرتے ہیں۔ اس عورت نے اس گلاس کو جس میں اس نے پنڈت کو پانی پلایا تھا، چمٹے سے اٹھایا اور دہکتی آگ پر رکھ کر پاک کردیا۔ اونچی ذات کے مرد پر ایک دلت عورت کا ایسا بھرپور طمانچہ جسے ہم نئے عہد کی بہتی بیار کا خوشگوار جھونکا کہیں گے۔ یہ وہ کہانی ہے جو اکیسویں صدی کے موضوعات کے اعتبار سے تخلیق کے نئے روزن کھولتی ہے۔ جہاں سے ہم اپنے عہد کو جھانک کر دیکھ سکتے ہیں— حالانکہ فکشن کے موضوعات کا یہ ایک پہلو ہے۔

دلت ادب میں آنے والی ان تبدیلیوں کو مشرف عالم ذوقی کی کہانی سور باڑی میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

اسی طرح اردو کے اہم فکشن نگار غضنفر نے بھی اس موضوع پر اپنا قلم اٹھایا اور وش منتھن جیسا ناول لکھ ڈالا۔ اختر آزاد، ام مبین، اشتیاق سعید نے بھی دلت موضوعات پر کہانیاں لکھی ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ دلت تحریک نے آج کے ہندستانی ادب کو نہ صرف چھوا بلکہ اپنی اہمیت کا بھی احساس کرایا۔ تمام ہندستانی زبانوں کی طرح اردو ادب بھی اس سے اچھوتا نہ رہا۔

ہزاروں سال کے تاریخی پس منظر میں دلت تحریک کا یہ آئینہ ہمیں آنے والے عہد کی ایسی شکل دکھاتا ہے جہاں دلت کہلانا اپنے آپ میں ایک فخر کی بات ہوگی۔ یقیناً اکیسویں صدی میں آکر اس بات کی شروعات ہوچکی ہے۔ ابھی لہجہ دھیما اور سر آہستہ ہے مگر آنے والے پچاس برسوں میں ہونے والی تبدیلیوں کی آہٹ ابھی سے محسوس ہونے لگی ہے۔ اور یقیناً ان کے اثرات دیگر زبانوں کے علاوہ اردو ادب پر بھی پڑیں گے۔

■

Shaesta Fakhri, C-9, Radio Colony,
Auckland Road, Allahabad-211001 (U.P.)

کسی بھی مسئلے پر کم وقت میں زیادہ معلومات حاصل کرنے کا سب سے اچھا طریقہ انٹرویو ہے۔ آپ کسی بھی ایک شخص یا اشخاص سے ایک وقت میں بہت ساری معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ طریقہ تمام ترسیلی ذرائع کے لیے کارگر ہے۔ چاہے وہ اخبار ہو ریڈیو ہو یا ٹیلی ویژن۔ اگرچہ انٹرویو کی نوعیت قدرے مختلف ہوتی ہے کچھ ایسے اصول ضرور ہیں جو اس صحافتی فن کے لیے یکساں طور پر مفید ہیں۔

انٹرویو کے لیے ضروری ہے کہ ایسا موضوع چنا جائے جو قارئین/ سامعین/ ناظرین کے لیے دلچسپ اور قابل توجہ ہو۔ عام طور پر ایسے موضوع پر انٹرویو لیے جاتے ہیں جو زمان و مکان کے مطابق ہوں۔ ان میں روزمرہ کی خبروں اور حالاتِ حاضرہ سے متعلق موضوع ہو سکتے ہیں یا کسی خاص موقع و محل کے اعتبار سے مخصوص موضوعات۔

مثلاً ٹو جی اسپکٹرم، کوئلہ گھوٹالہ، دولت مشترکہ کھیل، پیٹرول کی قیمت میں اضافہ، سماج میں بڑھتی ہوئی بدعنوانی، کالا دھن، عدالتوں کا بڑھتا ہوا رول، وغیرہ، یا کسی خاص موقع پر کسی خاص شخصیت سے اظہار رائے، مثلاً ہندوستانی سنیما کے سو سال پورے ہونے پر بڑے فلمی فنکار جیسے دلیپ کمار، سے انٹرویو، اولمپک میں میڈل جیتنے والے کھلاڑی کے والدین یا کوچ سے انٹرویو، یا بیرونی ملک روانہ ہونے سے پہلے وزیر خارجہ کا انٹرویو، یا جائے حادثہ پر متاثرین یا مہلوکین کے لواحقین کا انٹرویو۔

انتخاب موضوع و شخصیت

انٹرویو معلومات حاصل کرنے کا وہ طریقہ ہے جس سے کسی ایک خاص موضوع پر بھرپور اور مفید معلومات حاصل کی جا سکتی ہے۔ ایسی معلومات جو موقع و محل کے لحاظ سے قاری، سامع کی دلچسپی کا باعث ہو۔

سال رواں سعادت حسن منٹو کی پیدائش کا سوواں سال ہے۔ افسانہ نگاری میں منٹو کی منفرد حیثیت ہے۔ اس موقع پر ان کی بیٹیوں سے بہتر اظہار رائے اور کون کر سکتا ہے۔ اس کے لیے اسی طرح کا ایک ماحول بنانا سامعین، ناظرین کو موضوع سے قریب لانے میں معاون ہو۔ اس موقع پر اردو کونسل اور عالمی اردو ٹرسٹ نے مشترکہ طور پر ایک پروگرام کا انعقاد واگھہ سرحد پر کیا تھا۔ منٹو کی صاحبزادیاں پاکستان سے تشریف لائیں تھیں جبکہ منٹو پر ان ادبا نے زیادہ کام کیا ہے اور جو ان کی انفرادیت کو سچا مانتے ہیں وہ دہلی سے تشریف لے گئے تھے۔ پروگرام میں بارڈر سیکورٹی فورس نے تعاون کیا تھا۔ اس موقع پر منٹو کے اہل خانہ سے جو معلومات/ اظہار خیال ہوا وہ موقع اور محل کے لحاظ سے بہتر موضوع تھا۔ اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے منٹو کے گاؤں پپروڈی میں جو لدھیانہ کے سمرالہ قصبے کا ایک گاؤں ہے منٹو کی پاکستان سے آئی تینوں بیٹیوں نگہت، نزہت، اور نصرت کا استقبال کیا گیا۔ موقع اور محل کے لحاظ سے یہ تقریب موزوں تھی۔

انٹرویو کے لیے موضوع کا انتخاب اس کی اہمیت کے لحاظ سے کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا موقع محل پر منحصر کرتا ہے۔ کسی خاص موقع پر انٹرویو کے لیے موضوع منتخب کرتے وقت اس شخصیت کا انتخاب بھی کرنا ہوگا جس سے اس موضوع پر انٹرویو کرنا ہے۔ ظاہر ہے ایسے شخص کے انتخاب کے لیے ضروری ہے کہ وہ موضوع کے بارے میں صاحب رائے کی حیثیت رکھتا ہو، اس کے بارے میں معتبر معلومات رکھتا ہو اور وہ خود اس موضوع سے منسلک ہو چاہے وہ علمی اعتبار سے ہو یا قربت کے لحاظ سے۔ اگر موضوع ادبی ہے تو انٹرویو کے لیے ایسے شخص کا انتخاب کریں جس کی ادبی حیثیت ہو اور ادب پر دسترس رکھتا ہو۔ مثلاً اگر تنقید پر رائے حاصل کرنی ہے تو کسی معتبر شخص کو اظہار خیال کے لیے چنیں۔ اگر موضوع سیاسی ہو تو کسی ایسے سیاستداں سے جو اس موضوع کے بارے میں معقول معلومات و رائے رکھتا ہو۔ انٹرویو کے لیے مناسب شخص کا انتخاب بھی انٹرویو کی معنویت و دلچسپی کا ضامن ہوتا ہے۔

تیاری

انٹرویو سے پہلے انٹرویو لینے والے کو پوری تیاری کر لینی چاہیے۔ جس موضوع پر اس کو انٹرویو لینا ہے اس کے بارے میں اور جس شخص سے لینا ہے اس کے بارے میں بھی کوششیں ہونی چاہیے کہ انٹرویو لینے کے لیے ایسے شخص کا انتخاب کریں جو اس موضوع سے وابستہ ہو۔ مثلاً کسی صحافی سے انٹرویو لینا ہے تو بہتر ہے کہ میڈیا سے

متعلق کسی شخص کو انٹرویو لینے کے لیے چنیں جس کا انتخاب کریں وہ شخص اس موضوع پر خاطر خواہ معلومات رکھتا ہو۔ ایسا کرنے سے وہ شخص مناسب سوالات کرسکے گا اور مطلوبہ ہدف آسانی سے حاصل کرلے گا۔ اگر کوئی غیر متوقع صورت حال بھی واقع ہوجائے تو اس میں اس سے نپٹنے کے لیے صلاحیت ہوگی۔ جس شخص کا انٹرویو کرنا ہے اس کے رتبہ اور حیثیت کے لحاظ سے اس شخص کا انتخاب کریں جس کو انٹرویو کرنا ہے۔

انٹرویو کرنے والے کو موضوع اور انٹرویو لینے کے لیے پوری تیاری کرنی چاہیے۔ اگر موضوع کسی خاص موقع کا ہے تو اس موقع کی اہمیت، اس سے متعلقہ معلومات گذشتہ اور موجودہ اور بہتر ہے کہ مستقبل میں ہونے والے ممکنہ اقدامات کے بارے میں معلوم ہو۔ اگر گیہوں کی امدادی قیمت پر معلومات حاصل کرنی ہے تو گیہوں کی فصل کے بارے میں اس کی قسموں کے بارے میں، ان علاقوں کے بارے میں جہاں گندم زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کی پیدوار کی مقدار، اس میں استعمال ہونے والے اجزا، فصل اور اس کی قسموں کی نئی ایجادات اور گذشتہ سرکاری اعداد و شمار مثلاً پچھلی امدادی قیمت کیا تھی، کب طے کی گئی تھی، اس کے ساتھ اگر دیگر سہولیات کا اعلان کیا گیا تھا تو وہ حکومت کی طرف سے ان کا اطلاق، اس کا کسانوں پر اثر وغیرہ، جتنی زیادہ معلومات انٹرویو لینے والے کو ہوگی وہ اتنا ہی پر اعتماد ہوگا۔ اس کے علاوہ جس شخص سے انٹرویو لینا ہے اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات ہونی چاہیے۔ مثلاً گیہوں کے بارے میں وزیر زراعت سے انٹرویو لینا ہے تو ان کی مدت کار، ان کا اس موضوع پر تجربہ، خود ان کی حیثیت، سیاسی تجربہ، سیاسی حیثیت، سیاست میں ان کی معتبریت، حلقہ انتخاب کتنی مرتبہ منتخب ہوئے ہیں۔ گذشتہ کارکردگی، عوام میں ان کی شبیہ، ان کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کے بارے میں معلومات انٹرویو لینے والے کو اس موضوع سے بہتر طور پر عہدہ برآں ہونے میں مدد کرے گی۔ اگر کسی سرکاری افسر سے اس موضوع پر بات کرنی ہے تو اس افسر کی حیثیت کہ وہ کب سے اس محکمہ میں ہیں، پہلے کہاں کہاں رہے ہیں وہاں ان کی کارکردگی کیسی رہی، عوام میں ان کی شبیہ کیسی ہے۔ ان کی کامیابیاں اور ناکامیاں دونوں پر انٹرویو لینے والے کی نظر ہونی چاہیے۔

کسی خاص موقع یا کسی خاص وقت پر انٹرویو شائع یا نشر کرتے وقت اس خاص موقع یا وقت کی اہمیت کا اظہار اور موضوع و شخصیت سے اس کا سروکار واضح کرنا قارئین/ سامعین/ ناظرین کے لیے زیادہ دلچسپ ہوگا اور ان کی زیادہ توجہ حاصل ہوسکے گی۔ موقع اور موضوع کی مناسبت سے ایک سے زیادہ اشخاص کا انٹرویو بھی شائع/نشر کیا جاسکتا ہے۔ اکثر ٹیلی ویژن پر مختلف ٹی وی چینل اس

> انٹرویو کے لیے موضوع کا انتخاب اس کی اہمیت کے لحاظ سے کیا جاتا ھے۔ جیسا کہ پھلے عرض کیا گیا موقع محل پر منحصر کرتا ھے۔ کسی خاص موقع پر انٹرویو کے لیے موضوع منتخب کرتے وقت اس شخصیت کا انتخاب بھی کرنا ھوگا جس سے اس موضوع پر انٹرویو کرنا ھے۔ ظاھر ھے ایسے شخص کے انتخاب کے لیے ضروری ھے کہ وہ موضوع کے بارے میں صاحب رائے کی حیثیت رکھتا ھو، اس کے بارے میں معتبر معلومات رکھتا ھو اور وہ خود اس موضوع سے منسلک ھو چاھے وہ علمی اعتبار سے ھو یا قربت کے لحاظ سے۔ اگر موضوع ادبی ھے تو انٹرویو کے لیے ایسے شخص کا انتخاب کریں جس کی ادبی حیثیت ھو اور ادب پر دسترس رکھتا ھو۔

طرح کے پروگرام پیش کرتے ہیں جن میں ایک سے زیادہ اشخاص ایک یا چنندہ موضوعات پر اپنی آرا کا اظہار کرتے ہیں۔ ان پروگراموں میں سوال کرنے والے شخص یعنی اینکر کا بہت اہم رول ہوتا ہے۔ موضوع پر مفید اور جامع معلومات کے علاوہ روبرو اشخاص کے مابین ایک توازن قائم رکھنا، فضول اور غیر ضروری بات چیت سے پرہیز، موضوع پر تسلسل برقرار رکھنا اور غیر ضروری بحث سے اجتناب کرنا اینکر کی صلاحیت پر منحصر ہوتا ہے۔ کسی بھی انٹرویو کے شائع یا نشر کرنے کے لیے وقت اور جگہ معین ہوتی ہے اس لیے اینکر کو اس معینہ جگہ اور وقت میں وہ انٹرویو یا بحث ختم کرنی ہوتی ہے جس کے لیے ٹائم مینجمنٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ انٹرویو لینے والے شخص کو یاد رکھنا چاہیے کہ بات چیت یا بحث کا اختتام دفعتاً یا اچانک نہ ہو بلکہ خوبصورتی سے کیا جائے اور آخیر میں انٹرویو لینے والا کچھ ایسے جملے تحریر کرے یا بولے جو قارئین/ سامعین/ ناظرین کے ذہن میں دیر تک رہیں۔

انٹرویو کے سوالات اس طرح سے وضع کیے جانے چاہئیں کہ کم سے کم سوالات سے زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہوجائے۔ سوالات مختصر اور آسان ہونے چاہیے۔ سوال کا جواب ملنے کے دوران بہت سے ضمنی سوالات ذہن میں آتے ہیں۔ ان کو اسی وقت نہ پوچھیں بلکہ جواب مکمل ہونے کا انتظار کریں۔ کبھی کبھی سوال کا جواب یا مطلوبہ معلومات حاصل نہیں ہو پاتی۔ سیاسی لوگ تو اکثر ناپسندیدہ سوالات کے جواب ٹال جاتے ہیں۔ ان کے مطلوبہ جواب حاصل کرنے کے لیے آپ سوال کی نوعیت بدل کر پوچھ سکتے ہیں۔ لیکن یہ خیال رہنا چاہیے کہ اپنی بات/ سوال پر بضد نہ ہوں اور اگر ایسا محسوس ہو کہ آپ کا اصرار ناگوار گزرے گا تو اس کو موخر کرسکتے ہیں اور کچھ دیر بعد کسی دوسرے طریقے سے اس کا جواب حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ ہوسکتا ہے کہ کسی ناپسندیدہ سوال پر آپ کو شدید ردّعمل کا سامنا کرنا پڑے اس کو خندہ پیشانی سے ٹالنا چاہیے اور کسی دوسرے موضوع پر گفتگو شروع کردیں۔ ماحول کو خوشگوار بنائے رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے۔ اس کے لیے آپ ملاقاتی سے ہلکے پھلکے سوال اس کی پسند کے مطابق کریں مثلاً اس کی پسندیدہ اداکارہ، پسندیدہ کھیل، پسندیدہ کھلاڑی، اسکولی زندگی،

وغیرہ۔سوال آپ مختلف موضوعات پر پوچھ سکتے ہیں لیکن اس بات کا خیال رہے کہ سوالات پوچھتے وقت آپ کے روبرو بیٹھے ہوئے شخص کو یہ احساس نہیں ہونا چاہیے کہ اس کا مذاق اڑایا جارہا ہے یا اس کی بے عزتی ہورہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی خاص سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے آپ کو اصرار کرنا پڑے لیکن آپ کے رویہ اور لہجے میں تضحیک بالکل نہیں ہونی چاہیے۔کبھی کبھی سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلتا اس کے لیے انٹرویو لینے والے شخص کو ایسے حربے استعمال کرنے پڑتے ہیں، مثلاً کسی ایسے واقعہ یا ملاقات کا ذکر جس سے روبرو بیٹھا شخص لاشعوری طور پر ردعمل کا اظہار کر بیٹھتا ہے اور وہ باتیں معلوم ہوجاتی ہیں جو عام صورت میں ممکن نہیں ہوتیں۔

موضوع خشک اور ناپسندیدہ ہو تو دوران انٹرویو ماحول کو سازگار بنانے کے لیے کچھ موضوع سے ہٹ کر بھی گفتگو کرلینی چاہیے جس سے سامعین/ ناظرین کو تھوڑی راحت مل جاتی ہے اور وہ پھر سے تازہ دم ہوجاتے ہیں۔اس دوران اردگرد کے ماحول پر، لباس پر، کسی کتاب وغیرہ پر تبصرہ بھی کیا جاسکتا ہے۔

انٹرویو کے دوران روبرو شخص کے بیٹھنے کے انداز، اس کی حرکات وسکنات ہر ایک کا اثر ہوتا ہے۔اس بات کا پورا خیال رکھنا چاہیے کہ جواب دینے کا انداز سامعین/ ناظرین کو معیوب نہ لگے، ٹیلی ویژن پر اس کا خاص خیال رکھا جانا چاہیے، ٹی وی کے لیے جس شخص کا انٹرویو لینا ہوتا ہے وہ اسکرین پر جاذب نظر لگے اس کے لیے اس کا میک اپ بھی کیا جاتا ہے۔ اسکرین پر سوال کرنے اور جواب دینے والے دونوں حضرات ناظرین کے سامنے ہوتے ہیں اس لیے اس پر خاص دھیان دینے کی ضرورت ہے دونوں اور خاص طور پر روبرو شخص کا حلیہ اس کے بیٹھنے اور جواب دینے کا انداز، چہرے کے تاثرات سب ناظرین کے سامنے ہوتے ہیں۔

ٹیلی ویژن پر انٹرویو کے دوران کیمرے اور روشنی کی پوزیشن کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔اس کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔تھوڑی سی محنت سے اسکرین پر کسی بھی شخص کے عیوب کو آسانی سے چھپایا جاسکتا ہے اور اس طرح ان کو ظاہر بھی کیا جاسکتا ہے۔ یہ کیمرے اور روشنی کی جادوگری ہے۔

انٹرویو کے دوران حاصل کی گئی معلومات میں اپنی طرف سے ترمیم واضافہ مناسب نہیں ہے البتہ کبھی کبھی کسی خاص موضوع پر حاصل شدہ سخت ردعمل کے اثر کو معتدل کرنے کے لیے کوشش کی جاسکتی ہے۔ جواب میں حاصل معلومات کو من وعن پیش کرنا صحافت کے اصولوں کے عین مطابق ہے۔لیکن روبرو شخص پر مطلوبہ جواب حاصل کرنے کے لیے کسی طرح کی زور زبردستی یا اصرار مناسب نہیں ہے۔اس کے لیے اپنے الفاظ اس کے منہ سے نکلوانا دیانتداری نہیں ہوگی۔

انٹرویو لیتے وقت آپ کی آواز کا زیروبم یا چہرے کے تاثرات زیر بحث موضوع کے مطابق ہونے چاہیے۔ سنجیدہ موضوع پر خنداں پیشانی کا مظاہر معیوب ہوگا۔

انٹرویوں کے موضوع اور شخصیت کے انتخاب کے بعد سوالنامہ تیار کیا جاتا ہے آپ کے پاس وہ سوال تحریری طور پر موجود ہونے چاہیے جس کے بارے میں آپ اس شخصیت کی رائے جاننا چاہتے ہیں۔ایک اچھے صحافی کو سوالنامہ تیار کرنے کے بعد اس شخص کو دکھا لینا چاہیے تاکہ وہ اطمینان بخش جواب دے سکے۔اس کے ساتھ ہی ایسے سوالات حذف کیے جاسکتے ہیں جو متنازع ہوں یا جن کے بارے میں جواب دینے والا شخص مطمئن یا تیار نہ ہو۔

سوالات کے جوابات حاصل کرنے کے بعد بھی ایک مرتبہ جواب دینے والے شخص کو دکھا یا سنا کر اطمینان کرلینا چاہیے۔اس کے بعد ہی وہ انٹرویو شائع یا نشر کرنا مناسب ہوگا۔اس طریقے سے انٹرویو فون پر بھی کیا جاسکتا ہے۔آپ اپنے سوالات فون پر کریں اور جوابات فون پر یا اسکرین پر ریکارڈ کرلیں۔ بعد میں اسے بھی مرتب کرکے شائع یا نشر کریں۔

ریکارڈ انٹرویو لیتے وقت کچھ تکنیکی باریکیوں کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ روبرو شخص کا انٹرویو ریکارڈ کرتے وقت ریکارڈ کی پوزیشن اس طرح رکھنی چاہیے کہ بولنے والے کی آواز واضح طور پر سنائی دے۔اگر ریکارڈر زیادہ قریب یا زیادہ دور ہوگا تو آواز صاف نہیں سنائی دے گی۔ اسی طرح ٹیلی ویژن میں ریکارڈر کے ساتھ ساتھ کیمرے کی پوزیشن کی بھی بہت اہمیت ہوتی ہے۔اس کی مناسب پوزیشن سے ہی صحیح تصویر کی عکاسی ہوسکے گی۔کیمرے کی مدد سے روبرو شخص کی اس پوزیشن کو فوکس کریں جس میں وہ بہتر دکھائی دے چاہے وہ سامنے کی تصویر ہو یا سائڈ پوز۔

ایک اچھے صحافی کی طرح انٹرویو لینے والے شخص کو بھی صحافت کے اصولوں اور قانونی داؤں پیچ سے واقف ہونا چاہیے۔انٹرویو کے دوران ایسے سوالات سے پرہیز کریں جن کا تعلق ایسے امور سے ہو جن کی قانونی طور پر ممانعت ہے مثلاً نسلی، سماجی یا مذہبی تعصب یا زیرعدالت معاملے، ملک کی سلامتی یا دیگر ممالک سے تعلقات کے معاملے۔اس کے علاوہ اس بات کا بھی بخوبی اندازہ ہونا چاہیے کہ کس لغزش کے لیے کون سی سزا یا جرمانہ ہے۔تنقید، تضحیک اگر ضروری ہو تو دیگر خبروں کی اشاعت یا نشریات کی طرح انٹرویو میں بھی کسی شخص یا تنظیم کی تنقید یا تضحیک سے گریز کرنا چاہیے۔اگر کسی کی تنقید، شکایت یا بدعنوانی ناگزیر ہو اور ایسا کرنا عوام کے مفاد میں ہو تو احتیاط برتنی چاہیے اور صرف اتنے پر ہی قناعت کرنی چاہیے جتنا ضروری ہو۔عام طور پر سیاسی پارٹیاں اور ان سے منسلک افراد ایک دوسرے پر الزام تراشی کرتے ہیں ایسی بحث اور ایسے معاملوں سے اجتناب یا بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔

عدالتوں اور قانون ساز اداروں مثلاً پارلیمنٹ یا ریاستی اسمبلیوں کو قانون کی دفعہ 105 اور 194 کے تحت خصوصی اختیارات حاصل ہیں۔ان اختیارات کے پیش نظر ان پر تنقید سے پرہیز کرنا چاہیے۔

■

Naseem Ahmad, Principle Public Officer, NCPUL, New Delhi - 110025

تبسم صابر

حکیم احمد خاں فاخر رام پوری اور ان کا غیرمطبوعہ دیوان

علوم وفنون اور ادبیات کی ترویج و اشاعت میں ریاست رام پور کا ایک خاص مقام ہے۔ یہاں ہر دور میں علما، صوفیا، شعرا اور دوسرے اصحاب فن کی ایک بڑی جماعت موجود رہی ہے جنھوں نے اپنی قوت فکر و استدلال اور علمی تبحر ولیاقت سے ایسے علمی وادبی شاہ کار دنیائے علم وادب کو دیے ہیں جو ناقابل فراموش ہیں۔ انھیں اصحاب علم وفضل میں ایک اہم نام فاضل اجل حکیم احمد خاں فاخر کا ہے۔

حکیم احمد خاں فاخر کی پیدائش 1298 ہجری/ 1783 عیسوی میں رام پور میں ہوئی۔ فاخر کے والد کا نام محمد ناصر خاں تھا۔ قومیت کے اعتبار سے فاخر افغانی تھے۔ مولوی رستم علی رام پوری اور مولوی مبین لکھنوی کے علاوہ مختلف علمائے کرام سے عربی وفارسی علوم کی تحصیل کی تھی۔ طب میں حکیم سید اکبر علی نجیب آبادی کے شاگرد تھے اور شعر وسخن میں مولوی قدرت اللہ شوق سے تلمذ تھا۔ ریاست رام پور سے فاخر کا تعلق قدیمی تھا۔ انھوں نے رام پور کے کئی نوابین کا دور دیکھا تھا۔ شاہی خاندان کے معالج خصوصی اور ریاست میں افسر الاطبا تھے۔ اولاً نواب سید احمد علی خاں بہادر کے معالج تھے۔ کہا جاتا ہے کہ طبی کتابیں انھیں حفظ تھیں اور وہ ان کا درس زبانی دیا کرتے تھے۔ علم طب میں متعدد کتابیں لکھی تھیں۔ درس وتدریس کا بھی مشغلہ تھا۔ حکیم محمد اعظم خاں کے علاوہ بہت سے معروف اطبا کے نام ان کے شاگردوں کی فہرست میں شامل ہیں۔ نوے برس کی عمر میں 14 صفر المظفر 1290 ہجری/ 1873 عیسوی کو فاخر کا انتقال ہوا اور محلّہ گھیر چنداں خاں میں ملا عثمان کے مقبرے میں مدفون ہوئے۔

حافظ احمد علی خاں شوق کے بیان کے مطابق:

''علاج بہت اچھا تھا۔ پڑھاتے بھی خوب تھے۔ کتب طبیہ گویا حفظ تھیں۔''

(تذکرہ کاملان رام پور مصنفہ حافظ احمد علی خاں شوق، ص 9-8)

مولانا سید عبدالحی حسنی نے نزہۃ الخواطر میں ان کے لیے 'الشیخ الفاضل' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

(نزہۃ الخواطر مصنفہ مولانا سید عبدالحی حسنی، ج 7، ص 37)

مفردات ادویہ کے بیان میں 'طب سعیدی' کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی تھی جس کا دیباچہ نواب محمد سعید خاں والی رام پور کے نام پر ہے۔ اس کتاب میں فاخر نے پہلے اپنے عہد تک کی علم الادویہ سے متعلق عربی، فارسی اور ہندوستانی کتابوں سے ایک جامع فہرست ادویہ مرتب کی ہے۔ پھر ان کے صحیح صحیح ہندوستانی نام ومفردات تلاش کر کے لکھے ہیں، پھر ان ادویہ کے بارے میں اپنے عہد تک کی ساری معلومات کو یک جا کر دیا ہے۔ اس کتاب کی دوسری اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں ہر دوا کے نام کو ہندی نام سے شروع کیا گیا ہے۔ طب سعیدی کے علاوہ رسالہ 'چوب چینی'، 'رسالہ' ماء الجبن'، رسالہ 'خواص ادویۂ فارسی' جنگ وکشکول' فارسی اور 'نوطرز حکمت' (اردو) نامی کتابیں یادگار ہیں۔ علاوہ ازیں ایک ضخیم دیوان بھی رام پور رضا لائبریری کے ذخیرہ مخطوطات میں شامل ہے۔

فاخر ان اصحاب قلم میں سے تھے جنھیں اردو، ہندی اور فارسی کے ساتھ عربی زبان پر بھی کامل عبور تھا اور اس میں شعر کہنے کا سلیقہ رکھتے تھے۔ فاخر کی طبیعت شروع سے ہی طب کے ساتھ ساتھ نظم ونثر کی طرف بھی مائل تھی۔ رام

پور رضا لائبریری میں ان کا جو اردو دیوان ہمیں دستیاب ہوا ہے اس میں فارسی و اردو کلام کے ساتھ ان کا عربی کلام بھی شامل ہے۔ علاوہ ازیں ان کی کتاب 'طب سعیدی' جسے انھوں نے نواب محمد سعید خاں کے نام معنون کیا ہے اس میں بھی عربی اشعار مرقوم ہیں جن سے عربی زبان میں ان کی مہارت اور شعر گوئی کا ثبوت فراہم ہوتا ہے نیز اس دیوان میں بہت سے قطعات تاریخ کی موجودگی یہ ظاہر کرتی ہے کہ فاخر کو تاریخ گوئی میں بھی ملکہ حاصل تھا۔

زیر نظر مضمون میں فاخر کے اس غیر مطبوعہ ادبی شہ پارے کا تعارف مقصود ہے جو باوجود اپنی ادبی اور تاریخی خوبیوں کے پردۂ گمنامی میں ہے اور کسی ایسے دیدہ ور کی تلاش میں ہے جو اس کے نوک و پلک کو سدھار کر اسے داد تحسین دلا سکے اور ان بوسیدہ اوراق، منتشر صفحات کو حیات نو بخشے۔ میرے علم کی حد تک رام پور رضا لائبریری کے علاوہ دیوان فاخر کا دوسرا کوئی قلمی نسخہ کہیں موجود نہیں ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ اس کی طباعت و اشاعت کی جانب جلد از جلد توجہ دی جائے تاکہ اصحاب ذوق کی اس تک بہ آسانی رسائی ہو سکے۔

بہرحال رام پور رضا لائبریری میں دیوان فاخر کا جو قلمی نسخہ ہمیں دستیاب ہوا ہے وہ فن دواوین اردو موجودات نمبر 1021 کے تحت محفوظ ہے۔ اس مخطوطے کا سائز 12x20 سینٹی میٹر اور اس کے مسطر کا سائز 9x18 سینٹی میٹر ہے۔ مخطوطے پر کہیں بھی کاتب کے نام یا سال کتابت کی وضاحت نہیں ہے۔ لائبریری کے فہرست ساز نے اس کی تفصیلات میں نسخۂ مؤلف تحریر کیا ہے۔ موجودہ حالت میں مخطوطہ مرمت شدہ ہے جس میں بوسیدہ مقامات پر پیوند کاری اور ہر صفحے کی کنارہ بندی کروی گئی ہے۔ اس کے باوجود مخطوطے کی حالت بہت خراب ہے۔ مخطوطے میں جابجا کرم خوردگی کے بہ کثرت نشانات ہیں۔ اور جابجا پیوند کاری کے سبب بہت سے حروف اور کہیں کہیں الفاظ یا مکمل مصرعے تک پیوند کے نیچے چھپ گئے ہیں جنھیں کوشش کے باوجود پڑھنا محال ہے۔ یہ مخطوطہ تقریباً 233 صفحات پر مشتمل ہے۔ مخطوطے کے پہلے صفحے پر امیر مینائی کی 'انتخاب یادگار' سے ماخوذ فاخر کے حالات رقم ہیں اور اس کے آخر میں کتاب کا حوالہ نقل کر دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں دوسرے صفحے پر مختلف موجودات نمبر درج ہیں۔ یہ اس دیوان کی خارجی تفصیلات ہیں۔

جہاں تک دیوان کے مشتملات کا تعلق ہے دیوان فاخر میں مختلف مثنویاں، مناجات، قصائد، مسدس و مخمس، قطعات تواریخ، رباعیات، سہرے، عید، شب برات، دوالی اور بسنت وغیرہ کی مبارک بادیں، سلام اور متعدد غزلیات موجود ہیں۔ علاوہ ازیں اساتذۂ فن مولوی جامی، صائب، ظہیر فاریابی، حافظ شیرازی، جلال اسیر، منشی رام سہائے، شیخ سعدی اور حضرت امیر خسرو، مومن خاں مومن کے کلام پر تضمینیں شامل ہیں۔ مزید براں دیوان کے آخر

> فاخر ان اصحاب قلم میں سے تھے جنھیں اردو، ہندی اور فارسی کے ساتھ عربی زبان پر بھی کامل عبور تھا اور اس میں شعر کہنے کا سلیقہ رکھتے تھے۔ فاخر کی طبیعت شروع سے ہی طب کے ساتھ ساتھ نظم و نثر کی طرف بھی مائل تھی۔ رام پور رضا لائبریری میں ان کا جو اردو دیوان ہمیں دستیاب ہوا ہے اس میں فارسی و اردو کلام کے ساتھ ان کا عربی کلام بھی شامل ہے۔ علاوہ ازیں ان کی کتاب 'طب سعیدی' جسے انھوں نے نواب محمد سعید خاں کے نام معنون کیا ہے اس میں بھی عربی اشعار مرقوم ہیں جن سے عربی زبان میں ان کی مہارت اور شعرگوئی کا ثبوت فراہم ہوتا ہے نیز اس دیوان میں بہت سے قطعات تاریخ کی موجودگی یہ ظاہر کرتی ہے کہ فاخر کو تاریخ گوئی میں بھی ملکہ حاصل تھا۔

میں والی رام پور نواب محمد یوسف علی خاں ناظم کی تقریباً (41) غزلوں پر تضمینیں لکھی ہیں۔ پیش نظر دیوان میں مفرد اشعار بھی ایک بڑی تعداد میں جمع ہیں۔ دیوان کے شروع میں حمدیہ و نعتیہ مثنویاں ہیں۔ نیز نواب محمد سعید خاں کی مدح میں کہے گئے عربی اشعار مرقوم ہیں۔

دیوان فاخر کی محض سرسری ورق گردانی سے بھی یہ بات بہ خوبی واضح ہوتی ہے کہ شاعر نے اپنے اشہب قلم کو حسن تعلیل و تشبیہ، استعارہ اور مضمون آفرینی کے میدان میں بے دریغ دوڑایا ہے۔ صنائع و بدائع جو شاعری کی جان تصور کیے جاتے ہیں اس دیوان میں ہر جگہ دستیاب ہوتے ہیں۔

جیسا کہ مذکورہ دیوان فاخر میں بہت سے قطعات تاریخ موجود ہیں جنھیں فاخر نے سنین، وزن اور قافیہ کی دشواریوں کے باوجود نہایت واضح اور خوبصورت انداز میں نظم کیا ہے۔ ان قطعات کے مطالعے سے جہاں ایک طرف فاخر کی قادرالکلامی کا پتا چلتا ہے وہیں اس کے عہد کے بہت سے تاریخی حالات بھی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ چونکہ فاخر نے رام پور کے بہت سے نوابین کا دور دیکھا تھا اور شاہی معالج ہونے کے سبب انھیں بہت سے حالات و واقعات کو قریب سے دیکھنے کا موقع بھی ملا تھا لہٰذا ان کے دیوان کی تاریخی اہمیت مسلم ہے جسے کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

دیوان فاخر کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں اردو کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی کے اشعار بھی ملتے ہیں جو تعداد میں اگرچہ کم ہیں لیکن فنی اعتبار سے کافی اہمیت کے حامل ہیں اور جن سے فاخر کا تبحر و کمال ظاہر ہوتا ہے۔ اردو اور فارسی کے مقابلے عربی میں شعر کہنا فاخر کے فضل و کمال کو زیادہ واضح کرتا ہے اس لیے کہ جس زمانے میں فاخر نے یہ اشعار تخلیق کیے اس میں فارسی اور اردو زبان کا عام رواج تھا۔ شروع سے ہی بچوں کو پہلے فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی اور جس ماحول میں شاعر پلتا ہے اور جس زبان کے الفاظ اس کے کان عہد طفولیت سے آشنا ہوتے

ہیں ان میں جذبات وخیالات کا اظہار طبعی امر ہے لیکن ایک اجنبی زبان میں جس کا ماحول، بندش اور تراکیب مختلف ہوتی ہیں ان میں تصورات وخیالات، الفاظ کے انتخاب، تراکیب کے اختیار اور بیان وادا کے طریقوں پر قدرت حاصل کر پانا مشکل ہے۔ دوسرے اس دور میں شعرا فارسی کے مقابلے عربی میں شعر کہنے کی طرف بہت کم متوجہ ہوتے تھے۔ لہٰذا فاخر کا عربی زبان میں شاعری کرنا ان کے امتیازی وصف کو ظاہر کرتا ہے۔

اردو چونکہ فارسی سے قدرے زیادہ قریب ہے اس لیے طوالت سے بچتے ہوئے فاخر کی عربی شاعری سے صرف نظر کرتے ہیں اور ان کے اردو و فارسی کے چند نمونے درج کرتے ہیں۔

پیش نظر دیوان کے شروع میں والی ریاست نواب محمد سعید خاں (1256ھ/1840 تا 1271ھ/1855) کی شان میں عربی زبان میں مدحیہ قصیدہ رقم ہے۔ یہ مدحیہ اشعار فاخر کی کتاب 'طب سعیدی' کے مقدمے میں بھی مذکور ہیں۔

اشعار فارسی در مدح نواب محمد سعید خاں بہادر:

زہے حشمت زہے شان ریاست
اخی شوکت اخی اقبال و دولت

فریدوں جاہ و کیوان بارگاہ است
سکندر فرد کیکاؤس حشمت

عظیم الشان نواب بہادر
شجاع و عادل و ماحی بدعت

ز سیمائی ہمایونش ہویدا
درایت رافت و علم فراست

بہ پیشش دست بستہ است ہردم
شہامت صولت و نصفت عدالت

بفیاضی روا ہر خاص و عام است
ز بحر ضود و انہار رحمت

الٰہی در جہاں باشد باقبال
بحق حضرت شاہ ولایت

بماند فاحر قاصر ہمیشہ
بہ ہمراہ لواء فتح و نصرت

فارسی اشعار کے بعد اب ذیل میں پیش نظر دیوان سے اردو کے چند متفرق اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

اس کے در پر گرے ہم ایسے کہ پھر ہل نہ سکے
ناتوانی نے کیا کام توانائی کا

خون آنکھوں سے رواں خاک فشاں نعرہ زناں
آج کچھ اور ہے عالم ترے سودائی کا
(ص41)

دیکھ گل رو کو میرے گلشن میں
بولے ہے مرغ بوستاں کیسا؟
اس پری رو کے دیکھنے کے لیے
جھانکے ہے مہر آسماں کیسا؟
(ص42)

دیکھتے ہی مصحف رو کو ترے اے ماہ وش
ہے یقیں مجھ کو ہر اک کافر مسلماں ہوئے گا
جس گھڑی وہ بام پہ آئے گا رشک آفتاب
صحن اس کا عاشقوں سے محشر ستاں ہوئے گا
جلوہ فرما جب ہوا وہ آئینہ خانہ میں شوخ
آئینہ خانہ سبھی مثل پرستاں ہوئے گا
(ص45)

جس کے گھر میں وہ گل رعنا ہوا رونق فزا
صحن اس کا جلوہ گر مثل خیاباں ہوگیا
اشک آنکھوں سے ہوئے جاری جو اس کی بزم میں
شمع سا یہ عشق؟ سب پہ روشن ہوگیا
(ص50)

فاخر تو کر سکوت وگرنہ مثال شمع
جس نے زباں دراز کری سر جدا ہوا
افسوس ہم تو آہ بھی کرتے نہیں کہیں
چرچا ہمارے عشق کا کیوں جابجا ہوا؟
(ص53)

کس سے پوچھوں جا کے میں فاخر کہ کس نے لے لیا
دل ابھی سینے میں تھا اک دم میں وہ کیا ہوگیا
(ص5)

باغباں دشمن ہیں فاخر تاک میں صیاد ہے
باغ میں شاید کہ لائی ہے قضائے عندلیب
(ص69)

از قطعات:

مصیبت تجھ پہ آجائے جو ناگاہ
کہ اس سے رنج پہنچے تجھ کو جانکاہ
تسلی کر تو اس آیت سے اپنی
الا لا تقنطوا من رحمۃ اللہ
(ص255)

ایضاً:

ہمیں بھی لے چلو خدمت کے واسطے ہمراہ
تمھیں ضرور ہے غیروں کے گھر اگر رہنا
تو سوز دل سے نہ جل جائے مثل پروانہ
ہمیشہ شمع کے مانند چشم تر رہنا
(ص161)

از رباعیات:

جز درد و الم نہیں گزارا دل پر
ہر وقت چلے ہے غم کا آرا دل پر
شیشے سے بھی نازک تھا و لیکن افسوس
پتھر کلفت نے آ کے مارا دل پر
(ص164)

ایضاً:

کافر تری آنکھ کیا ہے سبحان اللہ
یہ نرگس خود نما ہے سبحان اللہ
جو دیکھے ہے تجھ بُت کو کرے ہے سجدہ
تو قبلۂ مدعا ہے سبحان اللہ

فن شعر گوئی میں حکیم احمد خاں فاخر کی مہارت کا اندازہ ان چند مثالوں سے بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے اور ان مثالوں کی موجودگی میں یہ دعویٰ کرنا کہ فاخر کو عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں نثر کے ساتھ نظم پر بھی قدرت فائقہ حاصل تھی، دعویٰ محض نہ ہوگا۔ خدا کرے کہ اس دیوان کی مطبوعہ شکل میں آنے کی جلد سے جلد کوئی تدبیر ہو۔

◘

Dr. Tabassum Sabir D/o Mr. Sabir Raza Khan, Imli Jhooley Wali,
Degree College Road, Rampur (U.P.)

■ شبیر احمد

وحشت کلکتوی
شخصیت و فن

علامہ رضا علی وحشت 18 نومبر 1881 کو کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شمشاد علی کلکتہ کے جنرل پوسٹ آفس میں ملازم تھے۔ والدہ بنگالن تھیں اور بمشکل اردو بولا کرتی تھیں، مگر پھر بھی گھر کے ماحول پر اردو زبان وتہذیب ایسی غالب رہی کہ ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری کو یہ کہنا پڑا کہ اگر زبان سیکھنا ہے تو کلام وحشت پڑھو۔ اس کا احساس وحشت کو بھی تھا، جبھی تو فرماتے ہیں:

خامۂ وحشت کا کیا کہنا جہانِ شعر میں
ہم کلامِ میرزا ہے، ہم نوائے میر ہے

مولانا حالی، شبلی نعمانی، علامہ اقبال، عبدالحلیم شرر، حسرت موہانی اور نیاز فتح پوری جیسے مشاہیر ادب نے وحشت کلکتوی کے فن کا لوہا مانا۔ طوطیِ بنگالہ، بلبلِ بنگالہ، ساحرِ بنگالہ، غالبِ دوراں، غالب ثانی کے لقب سے نوازا۔ وحشت استاد شاعر تھے۔ بنگال کی شعری محفلوں میں آج بھی ان کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ لیکن افسوس، تحریری طور پر ایسا کوئی کارنامہ نظر نہیں آتا جو اس قادرالکلام شاعر کے شایانِ شان ہو۔ میں شکرگزار ہوں رسالہ 'اردو دنیا' کا کہ اس نے ان کے کلام اور ان پر مضمون شائع کرنے کی جانب دل چسپی دکھائی تاکہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر لوگ اس باکمال فن کار سے آشنا ہوسکیں۔

وحشت نے ابتدائی تعلیم گھر ہی میں پائی۔ ذرا ہوش سنبھالا تو مدرسہ عالیہ کلکتہ میں داخل کردیے گئے اور یہیں سے 1898 میں انھوں نے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ شاعری میں انھوں نے داغ کے شاگرد، شمس کلکتوی سے اصلاح لی۔ وحشت بڑے ذہین تھے۔ بچپن ہی سے انھیں مطالعہ کا گہرا شوق تھا۔ اردو، فارسی اور انگریزی ادب مسلسل پڑھتے رہے۔ انگریزی سے ایسا شغف تھا کہ طالب علمی ہی کے زمانے میں انگریزی رسالوں میں مقالات لکھا کرتے تھے۔ 1901 میں امپریل ریکارڈ ڈیپارٹمنٹ میں چیف مولوی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 26 سال تک خدمات انجام دیتے رہے اور جب اسلامیہ کالج (موجودہ، مولانا آزاد کالج) کا قیام عمل میں آیا تو 1926 میں اس کالج میں اردو فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ وحشت کے پاس کوئی رسمی سند نہیں تھی۔ نہ ایم اے، بی اے، نہ پی ایچ ڈی۔ صرف انٹرنس ہی کا ایک سرٹیفکٹ تھا۔ اردو فارسی اور انگریزی ادب کے ہر پہلو پر ایسی مدلل گفتگو کرتے تھے کہ سننے والا دم بخود رہ جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ 1936 میں سبکدوشی کے بعد کلکتہ لیڈی برابورن کالج میں پروفیسر مقرر کیے گئے۔ حکومت نے ان کی علمی صلاحیت کو سراہا اور انھیں 'خان صاحب' اور 'خان بہادر' کے خطاب سے سرفراز کیا۔

وحشت علم دوست تھے۔ انھوں نے اسلامیہ کالج میں ایک عالی شان مشاعرے کی بنا رکھی۔ چند طالب علموں کی مدد سے انجمن انیس الاسلام نام کا ایک ادارہ قائم کیا تاکہ نوجوانوں میں تحریر وتقریر کا ذوق پیدا ہو۔ (مولانا ابوالکلام آزاد جیسی شخصیت اسی ادارے کی پیداوار ہیں) وحشت اردو کے بے لوث خدمت گزار تھے۔ کالج میں اردو ادب پڑھاتے، گھر میں شاگردوں کو اصلاح دیتے، شام کو انگریزوں کو اردو زبان سکھاتے، دیر رات تک مشاعروں کی صدارت کرتے، ہر قسم کی ادبی انجمنوں میں پابندی سے شریک ہوتے۔ بلاتاخیر خطوں کے جواب لکھتے۔ تقاریض ومضامین لکھتے۔ اکثر مضمون نگاروں نے انھیں فرشتہ صفت انسان لکھا ہے۔ انھیں اخلاق وخلوص کا مجسمہ بتایا ہے۔

وحشت کی طبیعت میں انکساری، راست گوئی، غم خواری، ایثار و ہمدردی شامل تھی۔ وہ مسلم الثبوت استاد تھے مگر انھوں نے کبھی شاگردوں پر اپنی استادی کا ایسا بوجھ نہیں رکھا جو انھیں گراں بار گزرے۔

انھیں کلکتہ اور یہاں کے علمی وادبی ماحول سے خاصا لگاؤ تھا۔ بچپن سے ضعف تک کا زمانہ اسی شہر نشاط میں گزرا تھا مگر آزادی کے بعد فرقہ وارانہ فساد نے ان کے دل کو اس قدر اچاٹ کردیا کہ انھیں بادلِ ناخواستہ کلکتہ کو خیرباد کہنا پڑا۔ وہ ڈھاکہ منتقل ہوگئے مگر تاحیات ان کا جی اسی شہر میں اٹکا رہا۔ وہیں 20 جولائی 1956 کو اس جہانِ فانی سے انتقال فرمایا۔

وحشت نے غالب کی تقلید بدرجہ اتم کی۔ اس پر وہ نازاں بھی رہے۔ انھوں نے جب شعور کی آنکھیں کھولیں تو دیکھا اردو شاعری، خاص طور سے غزلیہ شاعری انحطاط پذیر ہے۔ مغل خاندان کی تابوت میں آخری کیل ٹھونکی جا چکی ہے۔ بہادر شاہ ظفر اب نہیں رہے۔ لال قلعہ کی شعری محفلیں اجڑ چکی ہیں۔ غالب، مومن، ذوق مرکھپ

گئے اردو شاعری کا عہد زرّیں جو دبستان دہلی کی رہینِ منت تھا، ختم ہو چکا ہے۔ اب دبستانِ لکھنو کا بول بالا ہے۔ فنی و فکری اعتبار سے غزلیہ شاعری سطحی جذبات، خدوخال کی رعنائی، بدن کے نشیب و فراز اور چشمِ بے آب کا اسیر ہو چکی ہے۔ داخلیت کی جگہ خارجیت در آئی ہے۔ سوز و گداز اور درد و اضطراب کی کیفیت قصۂ پارینہ بن چکے ہیں۔ تصنع، تکلف اور لفظی بازی گری کے شور و شر میں زندگی کے مسائل و موضوعات گم ہونے لگے ہیں۔ وحشت جیسے کلاسیکی فن کار کو بھلا یہ کب گوارا ہوتا۔ وہ اردو غزل کو اس شور و شر سے باہر نکالنے پر کوشاں ہوئے۔ مگر اس کے لیے کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ ایک ایسی بلند آواز کی جو اس شور و غل پر قابو پا سکے۔ اپنے پُر اثر نغموں سے دبا سکے اور انھیں کلامِ غالب میں یہ آواز سنائی دینے لگی۔ لہٰذا انھوں نے کلامِ غالب کو پیشِ نظر رکھا اور اس کی پیروی میں جُٹ گئے۔ غالب کا رنگِ تغزل اپنایا۔ چشمۂ غالب سے ظرف و صلاحیت کے مطابق اپنے کشکول بھرنے لگے۔ وحشت سچے، نیک دل، انصاف پسند اور مخلص انسان تھے۔ لہٰذا انھوں نے اتباعِ غالب کا کھلم کھلا اعلان کیا:

تیرے اندازِ سخن سے ہے یہ ظاہر وحشت
کہ مقدر ہے ترا 'غالبِ دوراں' ہونا

یہ اعلان کھوکھلا اور پھسپھسا نہیں تھا۔ بلکہ اس میں برسوں کی محنت و ریاضت شامل تھی۔ وہ بچپن ہی سے اساتذہ کرام کے کلام کا مطالعہ کرنے لگے تھے۔ انھوں نے دیوانِ غالب کا ایسی گہرائی و گیرائی سے مطالعہ کیا کہ ان کے کلام کی معنی آفرینی کا راز پا لیا۔ ذوق و وجدان تو پہلے ہی سے ان میں موجود تھا۔ بس کیا تھا چند برسوں مشاقی کی اور 'غالبِ دوراں' تسلیم کر لیے گئے۔

وحشت تواتر سے غالب کی پیروی کرتے رہے۔ خوبصورت اور حسین تصویریں اوراقِ سخن پر بکھیرتے رہے۔ فارسی ترکیبوں کے استعمال میں انھیں وہ ملکہ حاصل تھا کہ خیال کی ادائیگی میں کسی قسم کے الجھاؤ کا احساس شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ 1910 میں جب دیوانِ وحشت منظرِ عام پر آیا تو بڑے سے بڑے اساتذۂ فن نے داد و تحسین سے نوازا۔ اس وقت کے سب سے بڑے ناقد مولانا الطاف حسین حالی نے وحشت کو ایک خط میں لکھا تھا:

''مولانا، اگر انصاف سے دیکھیے تو میرزا کا تتبع در حقیقت ہم لوگوں کا حق تھا، مگر آپ نے یہ حق ہم سے چھین لیا... تکلف بر طرف، اگر میرزا کے ان بلند اور اچھوتے خیال کو جن میں وہ اپنے تمام معاصرین میں ممتاز تھے، الگ کر لیا جائے تو آپ کے دیوان کو بے شائبۂ تصنع ان کے کلام کا نمونہ قرار دینا ہرگز داخلِ مبالغہ نہیں ہو سکتا۔''

اور نیاز فتحپوری جو اپنے وقت کے ایک سخت گیر نقاد تھے فرماتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ وحشت اپنے تغزل کی سنجیدگی، معنی آفرینی اور دلکش فارسی ترکیبوں کے استعمال سے غالب اسکول کے نہایت کامیاب شاعر سمجھے جاتے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ جس پختگی اور دلکشی کے ساتھ انھوں نے اس رنگ کو پیش کیا وہ اور کسی کو نصیب نہ ہو سکا۔ وحشت نے غالب کا تتبع کیا اور بڑی کامیابی کے ساتھ۔''

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ کہ بیدل کی تقلید میں غالب کی شاعری عرصہ تک ژولیدہ بیانی کا شکار رہی۔ لیکن وحشت نے تقلیدِ غالب میں اس پہلو سے اجتناب کیا۔ اس اعتبار سے وحشت کے اشعار غالب کے ژولیدہ اشعار کے افہام و تفہیم میں معاون و مددگار ہوتے ہیں۔ مگر اس سے یہ ہرگز نہ سمجھ لینا چاہئے کہ وحشت کا سرمایۂ سخن صرف اور صرف تتبع غالب پر مشتمل ہے۔ وحشت کے ہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں جس سے ان کا انفرادی مزاج و اسلوب ظاہر ہوتا ہے۔ اور یہی عناصر ان کی شاعری کو اعتبار بخشتے ہیں۔

وحشت خود فرماتے ہیں:

''غالب کی تقلید میں نے بے شک کی لیکن اس حد تک نہیں کہ میں کچھ اور یجنل خیالات نہ پیش کر سکوں۔ میرے دیوان کا مطالعہ اگر گہرا ہو تو یہ ظاہر کر دے گا کہ میں نے بھی کچھ نہ کچھ پیش کیا ہے۔''

چند اشعار:

مجالِ ترکِ محبت نہ ایک بار ہوئی
خیالِ ترکِ محبت تو بارہا آیا
ہمارے پاؤں میں تو تم نے زنجیر وفا ڈالی
تمہارے ہاتھ سے کیوں رشتۂ مہر و کرم چھوٹا

نیاز فتح پوری نے الہام پارہ سے تعبیر کرتے ہوئے کہا تھا، ''ان (وحشت) کی جوانی کی شاعری کے سامنے لوگوں کا صرف سر جھکتا تھا لیکن اب ان کے رنگ کے سامنے روح دوزانو ہوتی ہے۔''

وحشت کو ان کی زندگی میں کافی شہرت ملی۔ ملک کے مختلف حصوں سے انھیں مدعو کیا جاتا رہا، مگر ان کی طبیعت میں ایسی بے نیازی تھی کہ عدیم الفرصتی کا عذر پیش کر کے ٹال دیتے تھے۔ شاید ان کی اسی بے نیازی نے انھیں Self-projection سے روکے رکھا اور رفتہ رفتہ ان سے وہ مقام چھوٹتا گیا جس کے وہ حقدار تھے اور پھر علاقائی عصبیت نے بھی اپنا کام کیا۔ تذکرہ نویسوں اور تنقید نگاروں کو اس امر سے باز رکھا کہ وحشت جیسے با کمال فن کار پر خامہ فرسائی کریں۔ اس ضمن میں ایک دل چسپ واقعہ پیشِ خدمت ہے:

شمس الرحمٰن فاروقی اپنے مضمون 'خیال بند غالب' میں لکھتے ہیں:

''.....غالب نے ایسے مضمون اختیار کیے جو غزل کے تمام مروجہ مضامین سے ہٹ کر ہیں۔ ان کی اس قوت نے اقبال اور پھر اقبال کے بعد کی تمام غزل کو متاثر کیا۔ اقبال کے ساتھ والوں یا ذرا پہلے اور بعد والوں میں فانی، یگانہ، سیماب، ثاقب لکھنوی، عزیز لکھنوی اور صفی لکھنوی نے غالب کی اس قوت سے تھوڑا بہت فیض حاصل کیا۔''

مظہر امام نے فاروقی کو اس سلسلے میں لکھا کہ جہاں آپ نے غالب کے حوالے سے سیماب، ثاقب لکھنوی، عزیز لکھنوی اور صفی لکھنوی کے نام لیے ہیں کیا وہیں وحشت کلکتوی کا نام نہیں آنا چاہیے تھا۔''

فاروقی صاحب نے جواباً لکھا، ''آپ (مظہر امام) کی بات ٹھیک ہے کہ جہاں سیماب، عزیز وغیرہ کا نام ہے۔ وہاں وحشت کا نام بھی ہونا چاہیے تھا۔ انشاء اللہ کبھی اس کی تلافی کروں گا۔''

معید رشیدی، ایک نوجوان محقق نے وہ کارنامہ انجام دیا جو شاگردانِ وحشت سے ہو سکا نہ یارانِ وحشت سے۔ تذکرہ نویسوں اور تنقید نگاروں کا ذکر ہی کیا۔ معید کی کتاب 'وحشت: حیات وفن' وحشت کی شخصیت و فن کے مختلف جہات کا احاطہ کرتی ہے۔ اس میں وہ ایک جگہ رقم طراز ہیں:

''اقبال عظیم نے ناصر علی خاں سرہندی کو ناصری لکھا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اس ضمن میں راقم (معید رشیدی) کی رہنمائی کی اور بتایا کہ ناصر علی خاں سرہندی بالکل درست ہے۔'' (ص 24)

یہ وہی ناصری ہیں جنھوں نے وحشت کے جدِ امجد ذوالفقار خاں کی تعریف میں قصیدہ کہا تھا اور ذوالفقار خاں نے انھیں انعام سے نوازا تھا۔ حیرت ہوتی ہے کہ فاروقی صاحب کے علم میں ان کے جدِ امجد کا واقعہ محفوظ ہے مگر ان جیسے باکمال فن کار کا نام محفوظ نہیں۔ شاید وحشت نے ایسے ہی واقعہ کی پیشین گوئی کی تھی:

خیال تک نہ کیا اہلِ انجمن نے کبھی
تمام رات جلی شمعِ انجمن کے لیے

■

Shabbir Ahmed, 83D/6, Belgachia Road,
Kolkata-700037 (WB)

وحشت کلکتوی

انتخاب کلام وحشت کلکتوی

یہ رابطہ ظاہرداری کا کیوں مجھ کو دکھایا جاتا ہے
وہ مجھ سے نہیں ہے پوشیدہ جو مجھ سے چھپایا جاتا ہے
کیا اس کی مشیّت کی حکمت ،کیا اپنی وجہ ناکامی
ہوں اس کے سمجھنے سے قاصر جو مجھ کو بتایا جاتا ہے
آسان مٹانا اس کا نہیں مٹتے ہی مٹے گا نقش امید
کل پھر وہ بنایا جائے گا جو آج مٹایا جاتا ہے
تقدیر کا ہر دن رونا ہے یعنی کہ چراغ ارمانوں کا
ہر روز جلایا جاتا ہے ہر روز بجھایا جاتا ہے
اللہ رے زور مجبوری خود مجھ کو حیرت ہوتی ہے
جو بار اٹھانا پڑتا ہے کیوں کر اٹھایا جاتا ہے
یہ بھی تماشا الفت کا جو بات ہے وہ نادانی کی
منظور نہیں ہے ربط جنھیں ربط ان سے بڑھایا جاتا ہے
جب شعروسخن سے وحشت کو باقی نہ رہی ہو دلچسپی
حیراں ہوں پھر کیوں محفل میں یہ شخص بلایا جاتا ہے

ترے آشفتہ سے کیا حالِ بیتابی بیاں ہوگا
جبینِ شوق ہوگی اور تیرا آستاں ہوگا
ابھی افسانۂ مہرو وفا ہے لطف سے خالی
مزا آئے گا جب ذکرِ ستم ہائے بتاں ہوگا
تلاطم ہے امیدوں کا، تصادم آرزوؤں کا
دلِ ہنگامہ پرور کون تیرا رازداں ہوگا
تجمل سے گزر ہوگا ترے کوچے میں عاشق کا
تمناؤں کا لشکر کارواں در کارواں ہوگا
مخاطب ہوگی جب ان کی نظر میری نگاہوں سے
بیاں افسانۂ دل داستاں در داستاں ہوگا
نہیں پابند اہلِ ذوق کعبہ ہو کہ بت خانہ
سبھی ہوں گے وہاں، ذکرِ جمیل اس کا جہاں ہوگا
تغافل تو ادا ہے، پُر خطر ہے التفات اس کا
مصیبت آئے گی اس وقت جب وہ مہرباں ہوگا
سرور افزا و مستی خیز و شورش آفریں ہوگی
وہ بزمِ شعر جس میں وحشتِ شیوا بیاں ہوگا

ادھر اک بیخودی سی چھاگئی تونے جدھر دیکھا
تری محفل میں ہم نے جس کو دیکھا بے خبر دیکھا
ہراک قطرہ خبر دیتاہے دریائے مصیبت کی
ہوا احوالِ دل ظاہر جو حالِ چشمِ تر دیکھا
مری تقدیر ہنس کر پوچھتی ہے میرے یاروں سے
دوا میں کچھ اثر پایا، دعا میں کچھ اثر دیکھا
بقدرِ ناامیدی ہے ہوس کی گرم بازاری
نہ اِس کو مختصر دیکھا، نہ اُس کو مختصر دیکھا
تری افسردگی محفل کو ہے افسانۂ عبرت
کہ انجام شبِ عشرت کو اے شمع سحر دیکھا
نشاطِ زندگی کیا گلشنِ آفاق میں مجھ کو
تمناؤں کی دنیا ہی کو جب زیرو زبر دیکھا
یہ کہہ کر داد دی اس سنگِ در نے جانفشانی کی
کہ ہاں ہم نے کمال وحشتِ شوریدہ سر دیکھا

ضبط کی کوشش ہے جانِ ناتواں مشکل میں ہے
کیوں عیاں ہو آنکھ سے وہ غم جو پنہاں دل میں ہے
جس سے چاہو پوچھ لو تم میرے سوزِ دل کا حال
شمع بھی محفل میں ہے پروانہ بھی محفل میں ہے
اور ہوں گے وہ نکالیں گے جو دل کی آرزو!
وہ تمنا جان ہے میری جو میرے دل میں ہے
عیش ہم بزمی ہے اک تہمت دل وا رفتہ پر
اور ہی عالم میں ہے ہر چند اس محفل میں ہے
ہجر میں دل دیکھتا ہے خواب تیرے وصل کا
قعر دریا میں ہے اور نظارۂ ساحل میں ہے
عشق غارتگر نے شہ دی حسنِ آفت خیز کو
شوقِ لبسمل ہی سے کس بل بازوئے قاتل میں ہے
کچھ سمجھ کر ہی ہوا ہوں موجِ دریا کا حریف
ورنہ میں بھی جانتا ہوں عافیت ساحل میں ہے
بس یہی لے دے کے ہے اک یادگار عہدِ شوق
قدر کر اس داغ کی وحشت جو تیرے دل میں ہے

دلِ خستہ ذوقِ الم سے خوش غمِ یار اپنے اثر سے خوش
جو یہ غیر کے ہے ضرر سے خوش تو وہ آپ اپنے ضرر سے خوش
نہ خیال ذوقِ وصال کا نہ دماغ بزمِ نشاط کا
وہی مجھ کو عیشِ دوام ہے جو کرے تو ایک نظر سے خوش
ہراک اپنے رنگ میں محو ہے یہ ہے لطف وادیٔ عشق میں
جو خوشی ہے صید کو زخم کی تو کماں کش اپنے ہنر میں خوش
جو ہے ربط چشم کو اشک سے تو لگاؤ دل کو ہے زخم سے
یہ صدف ہے اپنے گہر سے خوش، یہ شجر ہے اپنے ثمر سے خوش
وہی ایک ذوقِ خیال ہے نہ الم ہے کچھ نہ ملال ہے
یہ کمال شانِ جمال ہے دل وجاں ہے جس کے اثر سے خوش
مری خستگی سے جو شاد ہے یہ کچھ اس کی سنگ دلی نہیں
ہے دل اس کا بھی الم آشنا کہ ہے میرے دردِ جگر سے خوش
دل و جان وحشت بے نوا ہے شہید لذت شعر کا!
کوئی خوش ہو یا نہ ہو اس کو کیا وہ ہے آپ اپنے ہنر سے خوش

بہار آئی ہے آرائشِ چمن کے لیے
مری بھی طبع کو تحریک ہے سخن کے لیے
خیال تک نہ کیا اہلِ انجمن نے کبھی
تمام رات جلی شمع انجمن کے لیے
وطن میں آنکھ چراتے ہیں ہم سے اہلِ وطن
تڑپتے رہتے ہیں غربت میں ہم وطن کے لیے
چمن کے دام سے جائیں گے ہم کہاں صیاد
قفس فضول ہے پروردۂ چمن کے لیے
فروغِ طبع خدا داد گرچہ تھا وحشت
ریاض کم نہ کیا ہم نے کسبِ فن کے لیے

ستم برپا کیا پھر اے دلِ ناشادماں تو نے
کہ چھیڑی عہدِ ماضی کی غم افزا داستاں تو نے
تری غفلت پرستی نے رکھا محوِ طرب تجھ کو
سنی گو بارہا بانگِ درائے کارواں تو نے
نہ سمجھا معنیٔ نفع و ضرر بازارِ ہستی میں
ہوائے سود میں دیکھا فقط روئے زیاں تو نے
تری لائی ہوئی تھی جو بلا ٹوٹی ترے سر پر
عبث چھیڑا ہے یہ ذکرِ جفائے آسماں تو نے
تری فریاد نے کھینچا دلِ شیخ و برہمن کو
طلسمِ تازہ باندھا وحشتِ جادو بیاں تو نے
◘

ماخذ: دیوانِ وحشت، ترانۂ وحشت

ادارہ

سید سجاد ظہیر: ایک مختصر تعارف

جدید اردو ادب کے ارتقا میں ترقی پسند تحریک نے بڑا اہم اور تاریخی کردار کیا ہے اور سجاد ظہیر عرف بنّے بھائی بلاشبہ اس تحریک کے سالارِ اعظم تھے۔ سجاد ظہیر اس لحاظ سے اردو ادب میں انوکھی شخصیت کے مالک تھے کہ انھوں نے بہت کم لکھا لیکن کئی بہت اچھا اور زیادہ لکھنے والوں کو بھی وہ درجہ، وہ مقبولیت، وہ وقار اور محبت نصیب نہ ہوئی جو سجاد ظہیر کو ملی۔ لکھنؤ میں 5 نومبر 1905 کو پیدا ہوئے۔ ایک معزز اور متمول خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ انھیں زندگی بھر ہر طرح کی آسائش، ماحول کی نفاست اور نام و نمود کے مواقع حاصل رہے۔ انگلستان میں تعلیم پائی۔ ہندوستان اس وقت آئے جب 1931 کی تحریک کے بعد اشتراکی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ سجاد ظہیر نے پریم چند اور ملک راج آنند کے ساتھ ہندوستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین قائم کی۔ 'انگارے' کے افسانوں سے انھیں ادب میں اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی رکنیت سے سیاسی حلقوں میں شہرت حاصل ہوئی۔ ان کا ناولٹ 'لندن کی ایک رات' اردو ناول نگاری میں خاص درجہ رکھتا ہے۔ 1942 سے 1948 تک بمبئی میں رہے اور پھر پاکستان چلے گئے۔ وہاں پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے۔ راولپنڈی سازش کیس میں چار سال قید کی سزا سنائی گئی تھی۔ ضمانت پر رہائی کے بعد ہندوستان لوٹ آئے اور آخر دم تک ترقی پسند تحریک کو منظّم کرنے میں مصروف عمل رہے۔ ان کی اہلیہ رضیہ سجاد ظہیر تھیں جو خود بھی اردو کی ایک مشہور و مقبول افسانہ و ناول نگار تھیں۔ 'روشنائی' ان کی آپ بیتی بھی ہے اور ترقی پسند تحریک کی نظریاتی بنیادوں کا وضاحتی بیان ہے۔ پگھلا نیلم ان کی آزاد اور نثری نظموں کا مجموعہ ہے جسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

13 ستمبر 1973 کو الماتا، قزاقستان میں ان کا انتقال ہوا جو اُس وقت سوویت یونین کا حصہ تھا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ اوکھلا نئی دہلی کے قبرستان میں ان کی تدفین ہوئی۔ سجاد ظہیر کی ہمہ جہت شخصیت زندہ قوموں کے لیے ہمیشہ باعث صد افتخار رہے گی۔ زمینی سطح پر ترقی پسند ادبی تحریک کے معمار کی حیثیت سے تاریخ انھیں کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ دراصل ان کے یہاں آزادی کا ایسا تصور تھا جو ہر عام آدمی کا خواب بھی تھا۔ وہ اسے شرمندۂ تعبیر کرنا چاہتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ زندگی کا اہم ترین حصہ اس تحریک کے لیے صرف کیا جس میں تمام انسانی برادری کی فلاح بہبود شامل تھی۔ باضابطہ طور پر انھوں نے 1919 میں تحریک آزادی میں حصہ لینا شروع کیا۔ 1929 میں انگلینڈ میں بھی ایسے طلبا کو جمع کیا جن کا رجحان اشتراکیت کی طرف تھا۔ 1936 میں جس ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس لکھنؤ میں ہوئی اس پر سجاد ظہیر نے بہت پہلے سے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ 1935 میں انھوں نے لندن میں ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کی انجمن قائم کی۔ باضابطہ طور پر مینی فیسٹو تیار کیا۔ جب نومبر 1935 میں ہندوستان واپس آئے تو انھوں نے الہ آباد ہائی کورٹ میں وکالت شروع کر دی۔ انڈین نیشنل کانگریس کے رکن کی حیثیت سے پنڈت جواہر لعل نہرو کے ساتھ تحریک میں معاونت کی۔ موقف کی ترجمانی کے لیے ماہنامہ 'چنگاری' نکالا اور اس کے مدیر بھی رہے۔ سجاد ظہیر کی تاریخ ساز فتوحات کے لیے 1936 کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کے روح رواں ہوئے۔ لکھنؤ میں اس تاریخی کانفرنس کی صدارت منشی پریم چند نے کی اور سجاد ظہیر اس انجمن کے سکریٹری ہوئے۔ ملک گیر سطح پر شامل مندوبین کی موجودگی میں جن میں ترقی پسندی کے پرجوش ہم نوا مولانا حسرت موہانی بھی شامل تھے۔ منشی جی نے یادگار خطبہ پیش کیا اور اپنی تقریر میں پریم چند نے خصوصی طور پر زور دیا کہ ''ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں کیونکہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگئی۔'' پریم چند کے اس واضح نظریے سے خاص تبدیلیاں رونما ہوئیں اور سجاد ظہیر کا بڑا مقصد پورا اردو ادب کے نظریاتی ارتقا کی تاریخ سجاد ظہیر کے ذکر کے بغیر نہیں لکھی جا سکتی۔

□

(وکی پیڈیا، اور مطبوعہ کوائف ناموں کی مختلف تحریروں سے ماخوذ)

سجاد ظہیر

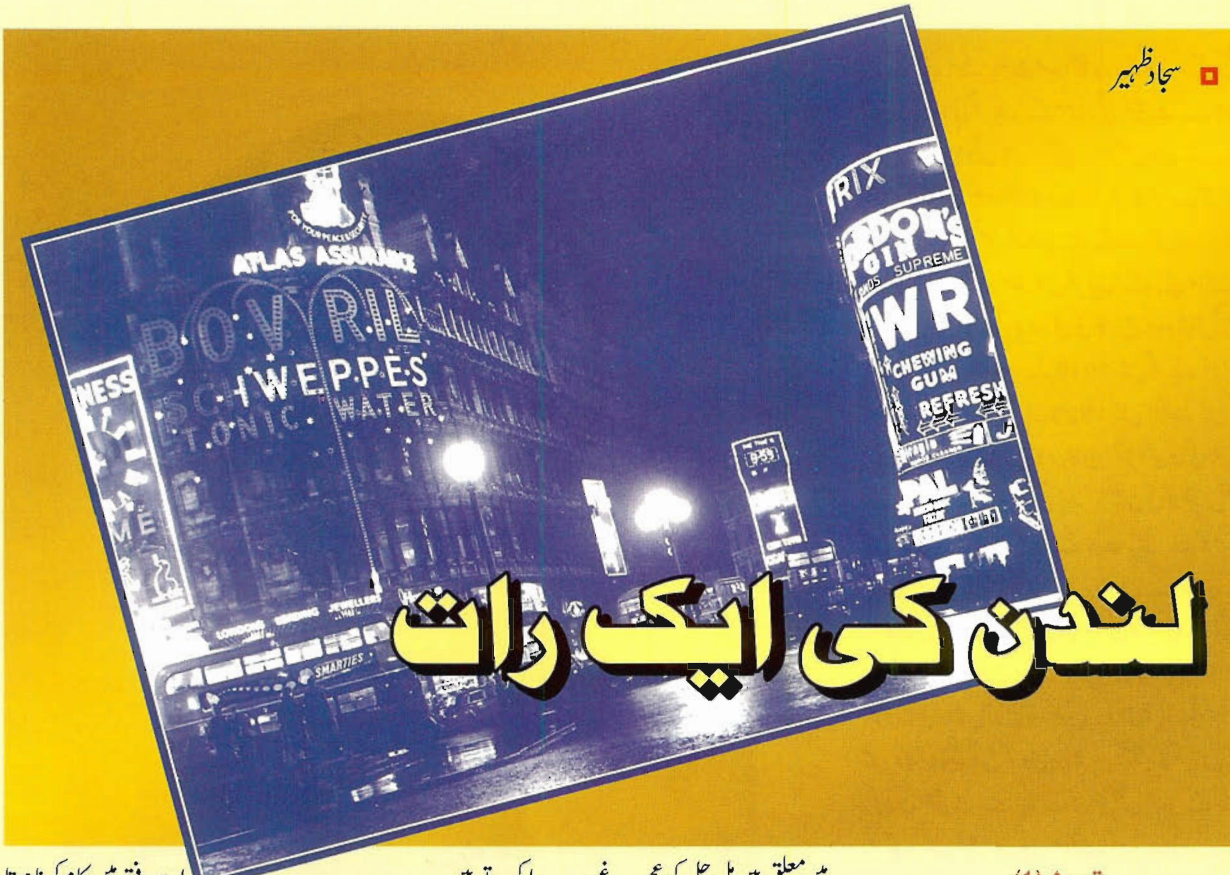

لندن کی ایک رات

قسط (1)

لندن نہایت گھنے، زردی مائل، گاڑھے، تاریک کہرے سے ڈھکا ہوا ہے ایک ایسا لحاف جو نم ہو اور ٹھنڈا، جس سے ہمارا سارا جسم اور خصوصی ناک منہ ڈھانپ دیا جائے، سانس مشکل سے لی جائے، سانس لیتے یہ معلوم ہو کہ تر دھواں پی رہے ہیں، ہر چیز پر مہین مہین پانی کے قطرے جمے ہوئے ہیں، سردی زیادہ نہیں، لیکن جتنی بھی ہے تکلیف دہ ہے، تیسرا پہر ہے لیکن معلوم ہوتا ہے لڑائی ہو رہی ہے۔ کبھی کبھی کہر کے ہلکے ہو جانے سے گیس کی روشنی چمک اٹھتی ہے۔

اس کی کیفیت کے باوجود لندن کی چہل پہل میں کوئی کمی نہیں۔ دکانیں روشن اور سڑکیں موٹروں، لاریوں اور بسوں سے بھری ہوئی ہیں۔ کنارے کی پٹری پر جہاں لوگ پیدل چلتے ہیں، دفتروں سے نکلے ہوئے لوگ، منشی، محرر، کاروباری، ٹائپ کرنے والی لڑکیاں، طالب علم اور چھوٹے کارخانوں میں کام کرنے والے مرد اور عورتیں تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ چھ بج چکے ہیں اور 'بلومسبری' میں جہاں لندن کے طالب علم 'اہل و دماغ' اصلی اور نقلی ہر قوم کے لوگ جو انگلستان کی سیر کو آئے ہیں، آ کر ٹھہرتے ہیں، جہاں انگلستان کے ذہنی انقلابی، غریب، مصنف، وہ سب لوگ جو ایک روحانی خلا میں معلق ہیں مل جل کر عجیب و غریب پیدا کرتے ہیں۔ چھ بج کے دس منٹ ہو گئے۔ رسل اسکوائر کے 'انڈر گراؤنڈ اسٹیشن' کی گھڑی پر بار بار اعظم کی نظر جاتی ہے۔

''کمبخت آج پھر وعدہ کر کے معلوم ہوتا ہے نہیں آئے گی۔ یہ پہلی بار نہیں ہے۔ مجھے اپنی حالت پر خود شرم آتی ہے۔ اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ ذرہ برابر بھی میرا خیال نہیں کرتی مگر میں ہوں کہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ آخر لندن میں اور بہت سی لڑکیاں ہیں اور میں کچھ ایسا بدصورت بھی نہیں مگر میں اس قدر کمزور ہوں۔ مجھے اپنے اوپر ذرا بھی قابو نہیں۔ کتنی دفعہ ارادہ کر چکا ہوں کہ اس سے ملنا چھوڑ دوں، اس سے بات تک نہ کروں سڑک پر ملے تو دوسری طرف منہ پھیر لوں اور اگر وہ خود میرے پاس اپنی مرضی سے آئے تو صاف کہہ دوں چلی جا میرے پاس سے اگر مجھ سے تجھے محبت نہیں تو کیوں میرے پاس آتی ہے۔ کوئی اور عاشق ڈھونڈ، تیرے اور بہت سے طلب گار ہیں۔ میں تجھ سے نفرت کرتا ہوں، اور اسی طرح کے اور بہت سے تیز و تند کلمے جس سے دراصل اس کے دل پر چوٹ لگے، اسے تکلیف پہنچے، اسے اذیت ہو۔ اسی طرح سے میں اس سے بدلہ لوں۔ لیکن کبھی مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔ پہلی بار اس نے سنیچر کی شام کو ملنے کا وعدہ کیا۔ کہا کہ ساڑھے سات بجے آئے گی۔ چھ بجے تک اسے دفتر میں کام کرنا ہوتا ہے اس کے بعد گھر جائے گی اور پھر ساتھ ساڑھے سات بجے تک میرے یہاں پہنچے گی۔ ساڑھے سات سے آٹھ بجے، آٹھ سے نو اور نو سے دس، میں کھانا کھانے بھی نہیں جا سکا، انتظار، انتظار، دس بجے کمرے کے دروازے پر کھٹ کھٹ غصہ کے مارے میں نے جواب تک نہیں دیا کہ ہاں چلی آؤ دروازہ کھلا کون؟ وہ نہیں بلکہ خادمہ 'مسٹر اعظم آپ سے کوئی ٹیلی فون پر بات کرنا چاہتا ہے' معلوم ہوتا تھا کہ میرے جسم کا سارا خون ایک لمحے کے لیے دوڑ کر میرے سر میں پہنچ گیا۔ گرم گرم خون میں نے جو بنا دیا، تھینک یو میری، اور یہ کہہ کر ٹیلی فون سننے گیا۔''

''کون ہے؟'' میں نے کہا اگر چہ مجھے معلوم تھا۔

''میں ہوں ڈارلنگ میرے پیارے تم بہت خفا ہو؟ تمہاری آواز سے معلوم ہوتا ہے۔ مجھے معاف کرو۔ مگر قصور میرا نہیں۔ کچھ لوگ میرے یہاں ملنے کے لیے آئے۔ میری والدہ نے کہا کہ میں ان کی مہمانداری کروں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کچھ بہانہ کروں مگر کچھ بنائے نہ بنی اور اب بہت دیر ہوگئی۔ پیارے اعظم معاف کرو۔''

میرے غصے کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ میں ایک ہفتہ سے اس سے ملا نہیں تھا۔ ہر روز کچھ نہ کچھ کام اسے لگا رہتا

تھا اور آج آخر کار وہ مجھ سے ملنے آنے کو تھی اور اس طرح سے اس نے میری آرزوؤں، تمناؤں پر پانی پھیر دیا۔ میرا جی تو یہ چاہ رہا تھا کہ 'جہنم میں جاؤ!' کہہ کر ٹیلی فون رسیور کو اس کے خانے میں رکھ دوں اور اس گفتگو کا خاتمہ کردوں۔ یہ گفتگو جو 'تاروں' پر ہو رہی تھی یہ گفتگو جس میں انسانوں کی آواز، انسانی پیکر سے جدا ہو کر محض بن کر، خالص آواز ہو کر ہمارے کانوں سے ٹکراتی ہے اور تھوڑی بہت الہامی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ الہام تو آسمانی حقیقت ہے۔ لیکن ٹیلی فون کی آواز سن کر سچ اور جھوٹ کی تمیز کرنا بہت دشوار ہے۔ جھوٹ بولنے کا بہترین طریقہ، یقیناً وہ جھوٹ بول رہی تھی۔ مہمان آگئے! وہ کچھ بہانہ تو کر سکتی تھی اور اس کی ماں اسے باہر جانے کی اجازت دے دیتی، وہ مجھ سے جھوٹ بول رہی ہے۔ بہانہ کر رہی ہے۔ دراصل وہ کسی اور کے ساتھ ہوگی ہوگی۔ عین وقت پر کوئی اور پسند آگیا ہوگا۔ اس کے ساتھ سیر وتفریح، سنیما، تھیٹر یا موٹر پر گھومنے، میرے پاس تو موٹر بھی نہیں۔ اور میں کوئی امیر کبیر نہیں۔ اصلی وجہ نہ آنے کی یہ ہے اور اب بہانہ کر رہی ہے۔ ''ڈارلنگ اعظم، پیارے اعظم'' جھوٹی دغاباز۔ یہ سب کچھ تھا۔ لیکن میں نے جواب دیا۔

''دراصل! اور میں تمھارا انتظار کرتے کرتے ادھ مرا ہوگیا۔ تم نے کم از کم ٹیلی فون تو اور پہلے کر دیا ہوتا لیکن ابھی تک دیر نہیں ہوئی ہے۔ 'انڈر گراؤنڈ' اور 'بسیں' تو ساڑھے بارہ بجے تک چلتی رہتی ہیں۔ میرے ساتھ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تم گزار سکتی ہو۔''

میری آواز میں بجائے غصہ کے گڑگڑاہٹ آگئی۔ مجھے اس کا احساس ہو رہا تھا، میں محسوس کر رہا تھا کہ میں اپنے کو ذلیل کر رہا ہوں، لیکن ایک ایسی طاقت، جس کے سامنے میں بالکل لاچار و مجبور تھا، مجھے پستی کی طرف کھینچے لیے جا رہی تھی۔

میں نے اپنی خودداری کو اپنی نظروں میں قائم رکھنے کے لیے سوچنا شروع کر دیا کہ عشق میں ذلت اٹھانا دراصل ذلت نہیں۔ اردو کے ان تمام شاعروں کے شکوے اور گلے مجھے یاد آنے لگے جو کہ کوچہ جاناں کے کتے بن کر اغیار کی ٹھوکریں کھاتے ہیں، دربان کی گالیاں سنتے ہیں اور معشوق کے ہرجائی پن اور ناز اور نخرے کو لذت روح سمجھ کر نہ صرف برداشت کرتے ہیں بلکہ خود اس کی فرمائش کرتے ہیں کہ ان پر ظلم وستم کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں۔

لیکن ہماری شاعری اور چیز ہے اور ذلت کی حقیقت کچھ اور میں اپنے دل کو لاکھ سمجھاؤں لیکن حقارت کی شرمناک صورت بار بار میری نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ اس نے جواب دیا، ''نہیں ڈارلنگ اعظم اب بہت دیر ہوگئی۔ صبح سات بجے مجھے اٹھنا ہے۔ تم تو جانتے ہو۔''

''مگر کل تو اتوار ہے تمھیں دفتر تو جانا نہیں۔''

''ہاں یہ تو ہے مگر پھر بھی تم جانتے ہو، اتوار کے دن گھر میں خادمہ دیر کو آتی ہے اور مجھے گھر کے کام کاج میں والدہ کی مدد کرنا ہوتی ہے۔ دراصل میں سچ بول رہی ہوں۔ معلوم ہوتا ہے تم میری باتوں کا یقین نہیں کر رہے ہو۔ یہ بہانہ نہیں۔ تم جانتے ہو میں تم کو کس قدر چاہتی ہوں۔ اچھا کل میں بارہ بجے کے قریب تم کو ٹیلی فون کروں گی اور پھر اس وقت کسی دوسرے دن تم سے ملاقات کا وقت طے کروں گی، اب مجھے اس وقت معاف کرو۔''

مجھ سے ٹیلی فون پر بات کرنے تک کی اسے اس وقت فرصت نہیں اور کل صبح سویرے اٹھنا ہے اپنی والدہ کی مدد کرنے کے لیے۔ جھوٹ جھوٹ وہ ضرور کسی اور کے ساتھ تفریح کو جا رہی ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ بس اس سے اچھا موقع اب مجھے نہیں ملے گا۔ اس سے صاف صاف کہہ دوں جو کچھ بھی میرا شبہ ہے مگر میں نے جواب دیا۔

''اچھی بات ہے جین، کل بارہ بجے تمھارے ٹیلی فون کا میں انتظار کروں گا۔ گڈ نائٹ۔

اور دوسرے دن ٹیلی فون ندارد۔ سارا دن میرا بیکار ضائع ہوا اور اگر راؤ ایک بجے کے قریب ملنے نہ آجاتا تو میں پاگل ہو جاتا۔ راؤ خوش قسمت آدمی ہے اسے کبھی عشق عاشقی کے جنجال میں پڑتے کسی نے نہ دیکھا۔ باوجود اس کے ہمیشہ کوئی نہ کوئی بانکی لڑکی اس کے قبضے میں رہتی ہے۔

کب تک یہاں میں انتظار کروں۔ سوا چھ بج گئے۔ سردی ہے اور جین کا ابھی تک پتہ ہی نہیں۔

لیکن جین کا ہنستا ہوا چہرہ، اس کا لمبا چھریرہ بدن، اس کی چمکدار آنکھیں جو ہر وقت گھبرائی ہوئی ادھر اُدھر دیکھتی ہیں۔ اس کی ہنسی کی آواز، اس کا گھبرا کر جھوٹ بولنا یہ سب اعظم کے ذہن میں بجلی کی طرح کوندتا اور اس کے دماغ کو تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے بے حس کر دیتا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے منٹ انڈر گراؤنڈ کی لفٹ کا دروازہ کھلتا اور لوگ اس میں سے باہر نکلتے، کبھی بیس، کبھی اس سے زیادہ کبھی اس سے کم اور اعظم کی نظر اس سارے گروہ پر پڑتی ہے اور جب آخری شخص نکل جاتا اور جین کی صورت اسے نظر نہ آتی تو پھر اس کی پریشانی بڑھتی، کبھی گھڑی پر نظر کبھی ادھر کبھی اُدھر۔ اخبار کی دوکان کے سامنے بڑے بڑے اشتہار لگے ہوئے تھے۔ ٹائمز، ڈیلی میل، مارننگ پوسٹ، ڈیلی ٹیلی گراف وغیرہ۔ اس کی نظر شام کے اخباروں پر پڑی جنھیں لوگ اسٹیشن کے باہر بیچ رہے تھے۔

''فٹ بال کے نتیجے''، ''میچ کے آخری نتیجے'' اخبار بیچنے والے پکار رہے تھے۔ ٹہلتے میں اس کی نظر چند اور اشتہاروں پر بڑی جو تختوں پر چپکے ہوئے تھے۔ ''بیکار مزدوروں کا ہائڈ پارک میں جلسہ''، ''دس انگریزی سپاہیوں نے دس ہزار ہندوستانی نیٹوز کو فساد کرنے سے روکا۔'' ''ایک گورا زخمی ہوا اور 15 نیٹوز کی جان گئی۔'' بڑے بڑے، کوئی ڈھائی فٹ، او رایک فٹ چوڑے کاغذوں پر یہ اشتہا سرخ حرفوں میں لکھے ہوئے تھے۔ اعظم کا خیال ایک لمحے کے لیے اپنے دوست کے انتظار سے ہٹ کر ہندوستان، وطن کی طرف گیا، ''یہ کمبخت انگریزی اخبار کتنی حقارت کے ساتھ ہم ہندوستانیوں کا ذکر کرتے ہیں۔'' نیٹوز ہم ''نیٹوز'' ہیں اور یہ لال منہے بندر، جو اس ملک میں رہتے ہیں، یہ کون ہیں؟''

اور وہ بے چارے غریب جنھوں نے گوروں کی گالیاں کھائیں اور ہائڈ پارک کے بیکار انگریز مزدور جو بھوکے مرتے ہیں؟ اعظم کا خیال اس طرف نہیں گیا۔

عربی کی ایک مثل ہے کہ ''انتظار موت سے زیادہ تکلیف دہ ہے'' موت جب بہت قریب ہوتی ہے تو مرنے والے کے ہوش وحواس مختل ہو جاتے ہیں۔ انتظار کی شدت ذہن کو کام کرنے سے روک دیتی ہے۔ خصوصاً ایسا انتظار جیسا اعظم کو تھا۔ اب تو وہ جین کے آنے کو بھی بھول سا گیا۔ جین کا آنا، اس کی اور اعظم کی ملاقات، خوشی یا اس کا نہ آنا اور کلفت، ان تمام خیالات اور احساسات نے مادی حقیقت کے جامے کو چھوڑ کر، دھندلی سی غیر معنوی صورت اختیار کرلی اور اس کے ذہن پر ایک کالی گھٹا سی چھا گئی۔

''ہلو اعظم! تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو!'' انڈر گراؤنڈ اسٹیشن سے راؤ نکلا اور اس نے اعظم کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

راؤ کے اس طرح سے یکبارگی آجانے سے اعظم کے دل کو فوراً سکون ہوگیا جس طرح رنج اور اذیت کے وقت رونے سے جی ہلکا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس وقت اعظم کا خیال جو صرف ایک نقطہ پر جم کر اس کے دل میں ناسور کی طرح سے چبھنے لگا تھا اور اب دوسری طرف ہٹ گیا۔ راؤ اس کا دوست تھا لیکن اعظم کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ راؤ کو کیا جواب دے۔ یہ کوئی بڑے فخر کی بات تو

تھی نہیں کہ جین کے انتظار میں کھڑے ہوئے رسل اسکوائر کے اسٹیشن پر میاں اعظم سردی کھا رہے ہیں اور ان کی جان جہاں کا پتہ ندارد۔ لیکن اعظم نے اپنے دل میں سوچا'' راؤ سے چھپانے سے آخر کیا فائدہ؟ وہ ضرور بھانپ جائے گا۔'' اور اس نے ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا'' جین سے اپائنٹ منٹ تھا چھ بجے، اس نے یہاں ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ ابھی تک وہ آئی نہیں۔ چھ بج کر بیس مٹ ہوگئے۔ نعیم کے یہاں آج پارٹی ہے اس نے دونوں کو بلایا تھا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔''

راؤ کا خیال اعظم کی اندرونی حالت کی طرف نہیں گیا۔ بھلا یہ بھی کوئی پریشانی کی بات ہے کہ وعدے کے بموجب کوئی ملاقات کے لیے نہیں آئے۔ خصوصاً ایک لڑکی، سنگار کرنے میں بے چاری کو دیر ہوگئی ہو، اسے اپنے لبوں کی لالی کی گہرائی شاید پسند نہ آئی ہو اور وہ اسے دوبارہ ٹھیک کرتی ہو۔ غرض دیر ہو جانے کے سینکڑوں اسباب ہوسکتے ہیں۔ غصہ اور بے چینی کا تو کوئی موقع نہ تھا۔

لیکن راؤ جین کا عاشق تو تھا نہیں۔ اعظم کو تو اس سے عشق تھا۔

راؤ نے کہا'' کیا تم بھی نعیم کے ہاں مدعو ہو؟ مجھے بھی اس نے بلایا ہے۔ چلو پھر ساتھ چلیں۔ جین کو نعیم کا پتہ تو معلوم ہی ہے۔ وہ وہاں سیدھی چلی آئے گی۔ یہاں سردی میں ٹھٹھرنے سے کیا فائدہ۔ آؤ چلو۔''

اعظم ایک لمحے کے لیے ہچکچایا،'' رکے یا نہ رکے، شاید وہ پانچ منٹ کے اندر آجائے۔ اگر اب چلا جاؤں تو اتنی دیر تک رکنا بیکار ہوا اور شاید وہ نہ آئے کیا معلوم'' راؤ سمجھ گیا کہ اعظم کس کشمکش میں مبتلا ہے اس نے اپنے مدراسی لہجے میں تیزی سے پھر کہا'' چلو بھی اعظم۔ یہاں کھڑے رہنے سے کیا فائدہ۔ کچھ یہ تو ہے نہیں کہ جین نے اگر تم کو یہاں نہ پایا تو وہ واپس چلی جائے۔ اگر اسے آنا ہے تو وہ سیدھی نعیم کے ہاں آسکتی ہے۔''

اعظم نے طے کیا کہ راؤ کے ساتھ چلا جانا بہتر ہے۔ اسے اس خیال نے گھیر لیا کہ وہ اس عورت کے پیچھے اپنی خودداری تک کھو بیٹھا۔ ذلت کے بھاری بوجھ سے اس کا دل پھر بیٹھنے لگا۔ اس کے قدم اٹھے لیکن آہستہ آہستہ اور وہ راؤ کے ساتھ اسٹیشن سے باہر نکلا۔ راؤ نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جس پر مردنی سی چھائی ہوئی تھی، جیسے کوئی مجروح جانور۔ اذیت اور بے بسی، وحشت اور لاچاری، راؤ نے یکبارگی محسوس کیا کہ اس کے دوست کی کیا حالت ہے۔ اسے یہ خیال کر کے شرمندگی سی ہوئی کہ اس نے اعظم کی اصلی کیفیت کا ابھی تک اندازہ نہیں کیا تھا۔ اس کے دل میں اعظم کے لیے ہمدردی کے جذبات بھر آئے۔ پھر کچھ ترس آیا، کچھ ہنسی آئی۔ اس لڑکی نے اچھے خاصے بھلے چنگے انسان کو پاگل کر دیا۔ یہ آج پہلی دفعہ نہیں اب تو اعظم کی پڑھائی پر بھی اس کا اثر پڑنے لگا ہے۔ اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو امتحان میں پاس ہونا مشکل ہو جائے گا۔ کسی طرح سے اس سے اعظم کا پیچھا چھوٹے تو اچھا ہے۔

راؤ نے کہا'' ارے بھائی اعظم بس اتنے غمگین مت ہو۔ جین ضرور تھوڑی دیر میں آجائے گی۔ کسی وجہ سے دیر ہوگئی ہے۔ آج کہرا کس قدر ہے اور دوسری بھی۔ گھر سے نکلتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ 'چلو پب' میں چلتے ہو۔ ایک گلاس 'بیئر'۔ پھر نعیم کے یہاں چلیں گے۔''

اعظم کی قوت ارادی اب بالکل غائب ہوگئی تھی۔

'' ہاں ضرور'' اس نے آہستہ سے کہا'' سردی میں ایک ایک پیگ وہسکی یا برانڈی کیوں نہ پی جائے۔'' راؤ اعظم دونوں آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے۔ کہرا چند منٹ کے لیے کم ہوگیا تھا۔ جس کی وجہ سے بجلی کی روشنی چمک اٹھی تھی۔ راؤ کا چہرہ، بڑی بڑی بیضوی آنکھیں۔ جیسے پرانے راجپوت شہزادوں کی تصویر میں ہوتی ہے۔ اس کا درمیانہ قد اور نازک سا جسم بعض ہندو دیوتاؤں کی طرح کالے ریشم کی طرح ملائم بال جو اس کی پیشانی پر گرے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ لیکن کچھ کیریکٹر کی کمزوری بھی معلوم ہوتی تھی۔ بجلی کی روشنی میں جب اس کا چہرہ آتا تو اس سے صاف ظاہر ہوتا کہ وہ اعظم کی حالت پر افسوس کر رہا ہے۔

اعظم کی نظر راؤ کے چہرے پر پڑی۔ اسے فوراً اس بات کا احساس ہوا کہ راؤ اس سے اظہار ہمدردی کر رہا ہے۔ لفظوں میں نہیں بلکہ اپنے رویے سے اور اپنی خاموشی سے اعظم کو تھوڑا بہت سکون ہوگیا۔ دنیا میں اور بہت سی چیزیں ہیں علاوہ عشق کے۔

قسط 2

'' تم نے آج شام کا اخبار دیکھا؟ ہندوستان میں پھر کہیں گولی چلی۔'' اعظم نے کہا'' نہیں میں نے اخبار تو نہیں دیکھا؟ مگر اشتہار دیکھے ہیں۔ اب تو یہ روز کا دستور ہوتا جاتا ہے ہم کالے آدمیوں کی جان کیڑوں مکوڑوں کے برابر ہے اور قصور ضرور ہمارا ہی ہوگا۔ ہم ہندوستانی اسی لائق ہیں، کمینے، ذلیل، بزدل، جوتا کھاتے ہیں مگر انگریزوں کی خوشامد سے باز نہیں آتے۔

ہندو مسلمان کی جان کے درپے، مسلمان ہندو کا گلا گھونٹنے کے لیے تیار۔ گولی نہیں میرا بس چلے تو ساری قوم کو توپ کے سامنے رکھ کر اڑا دوں۔ اس قوم کو زندہ ہی رہنے کا کوئی حق نہیں۔ خیال تو کرو 35 کروڑ انسان، اور ایک لاکھ سے بھی کم انگریز ان پر مزے سے حکومت کرتے ہیں اور حکومت بھی کیسی حکومت! ہندوستان میں ذلیل سے ذلیل انگریز کا رتبہ بڑے ہندوستانی سے بڑھ کر ہے۔ یہاں انگلستان میں چاہے انگریز کا رتبہ بڑے سے بڑے ہندوستانی سے بڑھ کر ہے۔ یہاں انگلستان میں چاہے انگریز مرد ہمارے جوتے صاف کرتے اور انگریز لڑکیاں ہم سے محبت کریں مگر سویز کے اس پار تو ہم سب 'کالا لوگ'، 'نیٹوز' غلاموں سے بدتر سمجھتے جاتے ہیں۔ میں بیرسٹر ہو جاؤں

اورتم انجینئر مگر ہندوستان میں وہی 'نیٹو' کے 'نیٹو' ہو گے اور انگریزوں کی ٹھوکریں کھاؤ گے اور باوجود اس کے پھر الٹ کر انھیں کو 'سرکار سلام'، 'خداوند' اور 'باپ' کہو گے۔ اتنی ذلت برداشت کرنے پر بھی جس قوم کے کان پر جوں تک نہ رینگے اس کا تو صفحہ ہستی سے ناپید ہوجانا ہی بہت رہے۔ مجھے تو خوشی ہوتی ہے جب ہندوستان سے گولی چلنے کی خبر آتی ہے۔ راؤ نے تلخی کے ساتھ کیا۔

اعظم راؤ کی اس مبالغہ آمیز گفتگو پر ہنس پڑا۔ اسے پالیکس سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی مگر راؤ کی ان باتوں میں اتنی قدرت تھی کہ اعظم تک اس کا اثر پہنچ ہی گیا۔

''بھئی راؤ اتنا بھی کیا مبالغہ! اس طرح باتیں کرنا تو سہل ہے مگر جو لوگ وطن کی ترقی کی کوشش کررہے ہیں ان کی مدد کرنے کے لیے کوئی نہیں تیار ہوتا۔ اگر ایسا ہی تم چاہتے ہو کہ ہندوستانی ذلت سے نجات پائیں تو پھر تم جا کر ان لوگوں کی مدد کیوں نہیں کرتے جو وطن کی بھلائی کے لیے کوشاں ہیں؟''

''وطن کی بھلائی کے لیے کوشاں ہیں؟ ذرا مجھے بتایئے تو سہی'' راؤ نے تیزی سے پوچھا ''کسی کو یہ تک معلوم نہیں کہ وطن کی بھلائی ہے کس چڑیا کا نام؟ اس کے لیے کوشاں ہونا تو درکنار زنانہ بن کر چرخا کاتنے میں وطن کی بھلائی ہے؟ یا مہاتما گاندھی کی طرح سچ کی کھوج کرنے میں وطن کی بھلائی ہے؟ یا کونسل کی ممبری اور منسٹری میں وطن کی بھلائی ہے؟ یا سوشل ریفارم اور اچھوت کانفرنس میں حصہ لینے میں وطن کی بھلائی ہے؟ سرکاری ملازمت میں وطن کی بھلائی ہو یا ہندو مہاسبھا اور مسلم لیگ میں وطن کی بھلائی کے لیے ہر شخص کے پاس وطن کی بھلائی کا ایک نسخہ ہے۔ ہر شخص معلوم ہوتا ہے کہ وطن کی بھلائی کے لیے کوشاں ہے۔ ہر شخص پکار پکار کر کہتا ہے کہ وطن کی بھلائی کے لیے کام کررہا ہے۔ حد ہوگئی، ان کی دیکھا دیکھی انگریزی گورنمنٹ تک کہنے لگی کہ وہ بھی ہندوستان کی بھلائی چاہتی ہے اور ملک کی حالت کیا ہے؟ ایک طرف تو غربت اور بھوک کا سایہ ملک پر پھیلتا جارہا ہے۔ دوسری طرف ظلم و جبر کا جال چاروں طرف سے ہم کو جکڑتا جارہا ہے۔ کیا اچھے ہماری بھلائی کرنے والے ہیں۔ میں باز آیا ایسی بھلائی کرنے سے، کم از کم میں کسی کو دھوکا تو نہیں دیتا۔ میں صاف صاف کہتا ہوں کہ میں صرف اپنی بھلائی چاہتا ہوں رہ گیا وطن اور اس کی خدمت، میاں اعظم ہندوستان کی حالت حد سے گزرچکی ہے۔ جتنی جلدی یہ قوم جس کا نام ہندوستانی ہے فنا ہوجائے گی اتنا ہی اچھا ہے۔'' ''راؤ تم کو تو خودکشی کرلینا چاہیے۔ میں نے تم سے بڑھ کر کوئی اس ایسا مشرف انسان نہیں دیکھا۔ لیکن دیکھنے میں تم اتنے خوش نظر آتے ہو۔ عجیب بات ہے۔'' اعظم نے کہا اور اس کا خیال پھر جین کی طرف گیا اور اپنی مایوسی کا احساس اسے ہوا۔ وہ یکبارگی چپ ہوگیا اور چہرے سے غمگینی ظاہر ہونے لگی۔ راؤ نے فوراً اعظم کی اس تبدیلی کو محسوس کیا اور ہنس کر جواب دیا۔ ''خوشی سے زندگی بسر کرنے کا راز ناامیدی میں ہے۔ ناامیدی کا بلند ترین درجہ کامل بے حسی کی کیفیت ہے۔ یہ وہ درجہ ہے کہ انسان کو خوشی اور غم، آرام اور تکلیف میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ ہم ہندو اس کو نروان کہتے ہیں۔''

اعظم پر دوبارہ غمگینی پوری طرح سے چھا گئی۔ اس نے راؤ کی باتوں پر ہنسنے کی کوشش کی۔ بے معنی سی مسکراہٹ بن کر اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ جین آخر کیوں نہیں آئی۔ کیا دراصل وہ مجھ سے بالکل محبت نہیں کرتی۔ لیکن اُس نے سوچا کہ اگر ایسا ہوتا تو جین اس سے ملنے کا وعدہ کیوں کرتی؟ اس سے اظہارِ عشق کیوں کرتی۔ کیا اس کے پیار اور محبت کے الفاظ سب جھوٹے تھے۔ شک اور شک کا دیو پھر اعظم کے ذہن پر قابو پانے لگا۔ کیا معلوم! اس نے سوچا، شاید اس کے کئی عاشق ہوں۔ یہاں آج کل یہ کوئی بری بات تو سمجھی نہیں جاتی۔ مجھ سے ہفتے میں ایک دفعہ آکر مل لیتی ہے۔ اور پھر میرے علاوہ شاید کوئی اور بھی ہو۔ یا شاید چونکہ وہ سمجھتی ہے کہ مجھ سے صاف صاف کہہ دے کہ وہ مجھ سے عشق نہیں کرتی تو مجھے بہت تکلیف ہوگی، اس خیال سے وہ مجھ سے جھوٹ موٹ

سجاد ظہیر منتخب کلام

غزل

تجھے کیا بتائیں ہمدم اسے پوچھ مت دوبارہ
کسی اور کا نہیں تھا وہ قصور تھا ہمارا
وہ قتیلِ رقص و رم تھی، وہ شہیدِ زیر و بم تھی
مری موجِ مضطرب کو نہ ملا مگر کنارا
ہے ہزار بار بہتر ترے زہدِ بے نمک سے
وہ گناہِ روح پرور بنے دل کا جو سہارا
جنھیں زندگی سے نفرت، جنھیں حسن سے عداوت
وہ خزاں میں خاک ہائیں گے بہار کا اشارہ
یہ ندائے لال و گوہر ہے بطونِ بحر و بر سے
ہمیں تاجِ خسروی کی نہیں بندشیں گوارا
جو رہا تو مردِ محنت کا عروجِ فن و حکمت
نہ فسونِ قیصری ہے نہ شکوہِ قصرِ دارا
دلِ دردمند انساں کی امید کا نشاں ہے
وہ فضا کے نیلگوں میں جو ہے سرخ اک ستارہ

محبت کی موت

تم نے کبھی محبت کو مرتے دیکھا ہے؟
چمکتی ہنستی آنکھیں پتھرا جاتی ہیں
دل کے دالانوں میں پریشاں گرم لو کے
جھکڑ چلتے ہیں
گلابی احساس کے بہتے سوتے خشک
اور لگتا ہے جیسے
کسی ہری بھری کھیتی پر پالا
پڑجائے
لیکن یارب
آرزو کے ان مرجھائے ہوئے سوکھے پھولوں
ان گمشدہ جنتوں سے
کیسی صندلی
دل آویز
خوشبوئیں آتی ہیں

دریا

آؤ میرے پاس آؤ نزدیک
یہاں سے دیکھیں
اس کھڑکی سے باہر
نیچے اک دریا بہتا ہے
دھندلی دھندلی ہلتی تصویروں کا
خاموشی سے بوجھل
زخمی سایوں میں
تیر چھپائے تھرتھراتے، جلتے
کناروں کے پہلو میں
بے کل، دُکھی
اُسے بھی نیند نہیں آتی

وہی پہلے کے سے تعلقات قائم رکھنا چاہتی ہے اور رفتہ رفتہ مجھ سے ملنا چھوڑ دے گی۔ اس طرح سے دیر کرنا اور وعدہ کرکے ملنے نہ آنا اسی کا پیش خیمہ ہے۔

کہرا پھر گھر آیا اور چاروں طرف اندھیرا بڑھ گیا۔ راؤ نے اپنے کوٹ کے کالر کو اٹھایا، کندھے جھکا لیے اور جیب میں دونوں ہاتھ پوری طرح ڈال کر تیزی سے چلنا شروع کیا۔

''آؤ ذرا اور تیز چلیں مجھے سردی معلوم ہو رہی ہے۔'' راؤ نے کہا۔

اعظم نے کچھ جواب نہ دیا مگر اس نے قدم تیز بڑھانے شروع کیے۔ چند منٹ میں 'پب' تک پہنچ گئے اور دونوں اندر داخل ہوئے۔

انگلستان میں شراب خانے عام طور سے دو یا تین حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ سامنے کا حصہ جس میں مزدور طبقہ کے لوگ جاتے ہیں اور اندر کا حصہ جس میں پیسے والے لوگ جاتے ہیں کبھی کبھی ایک چھوٹا سا تیسرا حصہ بھی ہوتا ہے جہاں وہ لوگ جنھیں جلدی سے واپس چلا جانا ہوتا ہے شراب پی لیتے ہیں۔ اس حصے میں بیٹھنے کے لیے کرسیاں وغیرہ ہوتی ہیں۔ شراب بیچنے والا درمیان میں ہوتا ہے۔ اس کے چاروں طرف کوئی ڈیڑھ گز اونچی اور تقریباً ایک فٹ چوڑی لکڑی کی میز کی قسم کی چیز ہوتی ہے۔ اس میز میں اندر کی طرف نل لگے ہوتے ہیں۔ جن میں سے گلاس بھر بھر بیئر ان لوگوں کو دی جاتی ہے جو بوتل میں بھری ہوئی شرابیں نہیں پینا چاہتے۔ یہ ایک معمولی شراب خانہ تھا۔ غریبوں کے حصے میں تین چار بنچیں پڑی ہوئی تھیں اور ان کے سامنے لکڑی کی میزیں تھیں۔ کچھ مزدور اپنے سامنے گلاس بیئر لیے ہوئے بنچوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور تین چار بنچ والی میز کے کنارے کھڑے ہوئے تھے۔ کسی کے سامنے شراب بیچنے والے نے ابھی بھی گلاس بھر کر رکھا تھا جس سے جھاگ اٹھ رہا تھا، کسی کا گلاس آدھا تھا اور وہ خاموشی کے ساتھ اپنا پائپ پی رہا تھا، کسی کا گلاس بالکل خالی تھا اور وہ ایک اور مانگ رہا تھا۔ تمباکو کا دھواں سارے کمرے میں بھرا ہوا تھا۔

راؤ اور اعظم اسی کمرے میں داخل ہوئے اور 'بار' کے کنارے آکر کھڑے ہوگئے۔

''گڈ ایوننگ سر،'' شراب بیچنے والے نے راؤ کو دیکھ کر کہا۔ راؤ چونکہ اکثر اس شراب خانے میں جایا کرتا تھا اس وجہ سے مالک دوکان اسے پہچاننے لگا تھا۔

''کتنا خراب موسم ہے'' مالک نے سلام کرنے کے بعد فوراً کہا۔ انگلستان میں موسم پر اظہار رائے کرنا ہر شخص اپنا فرض سمجھتا ہے۔ بجائے مزاج پرسی کے موسم کی اچھائی یا برائی کا ذکر کرنا، ایک دستور سا ہوگیا ہے جس کے جواب میں دوسرا شخص اتفاق رائے کا اظہار کرتا ہے اور اگر اسے کچھ اور ضروری بات نہیں ہوا کرتی، اور اس کا دل چپ رہنے کو بھی نہیں چاہتا پھر موسم پر گفتگو چھڑ جاتی ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے تجربات بیان کرتا ہے، سال گزشتہ موسم اتنا برا نہیں تھا، پانچ سال ہوئے جب گرمیوں کے مہینے

میں سورج بالکل نہیں دکھائی دیا اور مسلسل بارش ہوتی رہی اور جاڑوں بھر دھوپ ہی دھوپ رہی، تین برس پہلے اتنی سردی پڑی کہ نل میں پانی جم گیا۔ دریائے ٹیمس پر اسکیٹنگ ہوتی تھی وغیرہ وغیرہ۔ غرض اس گفتگو کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ انگریز قوم نے غالباً انفرادی آزادی کو قائم رکھنے کے لیے اس رسم کو رائج کیا ہے۔ موسم کی باتیں کرکے ہر شخص اپنے ذاتی معاملات پر اوروں کو گفتگو کرنے سے روک دیتا ہے۔ یہ ایسا مضمون ہے جس پر ہر شخص آزادی کے ساتھ اظہار رائے کرسکتا ہے۔ بغیر یہ بتائے ہوئے کہ اس کا 'اسم شریف' کیا ہے۔ اس کا 'دولت خانہ' کہاں ہے۔ اس کا پیشہ کیا ہے، اس کی تنخواہ کیا ہے، اس کا مذہب کیا ہے، اس کی ذات کون سی ہے، جو ہمارے وطن کا دستور ہے۔

''گڈ ایوننگ،'' راؤ نے جواب دیا ''ہاں کس قدر برا موسم ہے۔ معلوم نہیں یہ کہرا کب اٹھے گا اور پھر اس نے اعظم سے پوچھا ''کیا پیو گے؟''

''برانڈی'' اعظم نے جواب دیا۔ اسے اس وقت تیز شراب کی خواہش تھی۔

راؤ نے اعظم کے لیے برانڈی اور اپنے لیے وہسکی کا آرڈر دیا۔ شراب بیچنے والے نے دونوں گلاس اور سوڈے کی بوتل، اعظم اور راؤ کے سامنے رکھ دیے، راؤ نے سوڈا ملا کر اور اعظم نے بغیر سوڈا ملائے ہوئے گلاس ساتھ ساتھ لبوں کی طرف اٹھائے۔

''چیر اعظم'' راؤ نے مسکرا کر کہا اور پہلا گھونٹ پیا۔

''چیر راؤ'' اعظم نے آہستہ سے غمگین آواز میں جواب دیا اور راؤ کے ساتھ ہی ساتھ پہلا گھونٹ پیا، پھر دونوں نے گلاس میز پر رکھ دیے۔ گفتگو کی کوشش معلوم ہوتا تھا دونوں کر رہے ہیں۔ اعظم اپنی اصلی حالت کو بھلا دینے کے لیے۔ اور راؤ جس پر اعظم کی افسردگی کا اثر پڑتا جا رہا تھا۔ اعظم کو کسی طرح سے تسکین دینے کے لیے۔ مگر جیسا اکثر ہوتا ہے کوشش کرنے سے گفتگو نہیں ہوتی۔ دونوں پر ایک تکلیف دہ، بھاری خاموشی چھا گئی۔ شراب پینے سے یہ کیفیت اور مستقل سی ہوگئی، بجائے اس کے کہ ان کی زبانیں کھلیں اور ان کے قلب میں حرارت پہنچے، تھوڑی سی شراب کا اس وقت الٹا اثر ہوا۔

''جین، جین، جین،'' اعظم کے دماغ پر اندر ہی جیسے کوئی بار بار ہتھوڑا سا برسا رہا تھا۔

اور راؤ اب اعظم کی اس حالت میں خود اتنا ڈوب گیا تھا کہ اس کے دوست کی تکلیف کا اثر خود اس تک پہنچ رہا تھا۔ ''یہ روحانی کرب ایسا بھی نہیں جس سے انسان کو بالآخر تقویت پہنچتی ہو'' راؤ نے سوچا ''یہ تو بالکل بے فیض، لاحاصل اذیت ہے جس کا اثر سوائے دل اور دماغ کے معطل ہوجانے کے اور کچھ بھی نہیں۔ ہر اذیت بے سود نہیں۔ بعض تکلیفیں اس قسم کی بھی ہوتی ہیں جن سے ہمیں روحانی اور جسمانی فائدہ پہنچتا ہے، یا ہمیں تو ہمارے تکلیف برداشت کرنے سے کسی اور کو کوئی فائدہ نہیں۔''

■

ماخذ: اردو پوائنٹ ڈاٹ کام۔

محمد انصاراللہ

ہجو و ہزل اور واسوخت

ہجو و ہزل

اکبر شاہ ثانی کے عہد میں دہلی میں غیر سنجیدہ شاعری کو عموماً فروغ حاصل نہیں ہوسکا تھا۔ اس زمانے میں بہ گمانِ غالب طویل ہجویات نہیں لکھی گئیں۔ معمولاً دو دو شعر کے قطعوں اور رباعیوں سے ہجو کا کام نکال لیا جاتا تھا۔ بعض وقت صرف ایک شعر کہہ کر دل ٹھنڈا کرلیتے تھے۔ دس بارہ یا کچھ زیادہ شعروں کے بھی کچھ ہجو یہ قطعے مل جاتے ہیں لیکن ان کی تعداد بہت نہیں معلوم ہوتی ہے۔

1. احسان

پرانے اُستادوں میں سے حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان زندہ تھے اور شاید اس زمانے میں سب سے زیادہ ہجویات انھیں نے لکھی تھیں بلکہ ہجوگوئی میں وہ خود کو بہت مشاق سمجھتے تھے۔ ان کے دیوان میں چند ہجویات قطعہ کی صورت میں ہیں۔ یہاں نمونہ کے طور پر ایک نقل کی جاتی ہے:

قطعہ ہذا در ہجوِ قلق

فکر میرا ہے آسماں پرواز   لامکاں یہ ولا مکاں پرواز
مجھ سے اڑ کر عدو کہاں جاوے   جس جگہ جاوے جو تیاں کھاوے
شہرہ اپنا عدو کو ہے منظور   چل قلم نام اُس کا کر مشہور
آپ جنجال میں پڑا وہ پلید   . . .برائے خود تابید
ہجو میری زباں پہ آنے لگی   روح سودا کی تھرتھرانے لگی
قلق ابنِ قلندر نامی   ایک بوگر ہے ایک گڈامی
اک مچھندر ہے شہر کے اندر   ہے قلندر کے گھر میں وہ بندر
نام بندو ہے اسم زن بندی   وہ تو خندہ ہے اور یہ خندی
میرخاں کا شپریں بازار   جوتیاں گانٹھتا ہے واں وہ چمار
کون خرگاؤ ریش ہے وہ سگ
خوک بھی رہوے ایسے سگ سے الگ

دیکھنے کی بات ہے کہ احسان ہجو میں بھی ایسے الفاظ استعمال نہیں کرسکتے تھے جو گرے ہوئے اور گالی کے طور پر رائج ہوں۔ انھوں نے کتا اور سور کی جگہ خوک اور سگ نظم کیا ہے۔ ایسی صورت میں ان کی ہجویات میں 'ہجو پن' بھی نہیں آسکا ہے۔

احسان نے دو دو شعروں پر مشتمل کئی قطعے لکھے ہیں۔ انداز ان کا بھی وہی ہے اور فحش کا عنصر ان میں بھی نہ ہونے کے برابر ہے مثلاً:

قطعہ

جو اہل تسنن پر آوازہ کسے ناحق   شاگرد ہے شیطان کا، ابلیس مقرر ہے
مردود ہے ملعون، مطعونِ خلائق ہے   مسلم نہیں مشرک ہے، مومن نہیں کافر ہے

رباعی

ہیں ایک حکیم جی بہ شکلِ طاعون   ہے رقص، تقیہ، بخل اُن کا قانون
پڑھتے ہیں نفیسی اور خود ہیں وہ کثیف   نسخے ہیں عجیب اور طرفہ معجون

احسان کو جو بات پسند ہوتی تھی اُس کو بے کم و کاست نظم کردیتے تھے۔ اس میں نمک مرچ لگا کر دلچسپ یا سبق آموز بھی نہیں بناتے تھے اور پھکڑ پن تک پہنچنا تو شاید اُن کے لیے ممکن ہی نہیں تھا اسی لیے اپنے دعووں کے باوجود وہ ہجوگوئی میں کامیاب نہیں تھے۔

کہتے ہیں کہ احسان کے مزاج میں شوخی اور ظرافت تھی اور اسی نے ان کی غزلوں کے بعض شعروں کو ہزل بنایا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی ظریفانہ شاعری بھی زیرِ لب تبسم کی حد سے آگے نہیں بڑھتی اور اُن کی ظرافت کبھی بھی سنجیدگی کا دامن نہیں چھوڑ پاتی۔
ذیل میں نمونہ کے طور پر چند شعر نقل کیے جاتے ہیں:

قاضی مے گلگوں کی حرمت ہے کتابوں میں   لیکن بڑی ذلت ہے رشوت کا بچا جانا
بے معنی نہیں، معنی اِس رمز کے دلکش ہیں   مانگ اپنی دکھا جانی، چٹکی کو بجا جانا
محتسب قہر ہے تو شوق سے نگلے انگور   اور محروم رہیں بادۂ انگور سے ہم
خفا مت ہو مجھ کو ٹھکانے بہت ہیں
مرا سر رہے آستانے بہت ہیں

2. اوج

مرزا قادر بخش صابر نے ان کا احوال خاصی تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:

''اوج تخلص، عبداللہ خاں ساکن سردھنہ، اپنے اشعار کو لکھ لیتا اور اپنے لکھے کو پڑھ لیتا۔ بیشتر کاملانِ فنِ سخن بہ طریقِ ظرافت اِس کو استاد کہتے۔ ہمیشہ زمین ہائے سنگلاخ کی تلاش میں رہتا۔ عرصہ ایک سال کا ہوا کہ خلوت خاک کو اپنا گوشۂ عافیت بنایا۔''

(گلستانِ سخن، جلد 1، ص 280 تا 282)

مولانا محمد حسین آزاد نے بھی ان کو دیکھا تھا اور اِن کے احوال میں آبِ حیات میں چند صفحے صرف کیے ہیں۔ انھوں نے جو لکھا ہے مختصراً یہ ہے:

''ایسے بلند مضمون اور نازک خیال پیدا کرتے تھے کہ قابو میں نہ لاسکتے تھے اور انھیں عمدہ الفاظ میں ایسی چستی اور درستی سے باندھتے تھے کہ وہ مضمون سما بھی نہ ہوسکتا تھا۔ فکرِ مضامین اور تلاشِ الفاظ میں تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ آپ ہی آپ مزے لیتے تھے۔ ہونٹ چباتے چباتے ایک طرف سے سفید ہوگیا تھا۔ مشاعروں میں غزل سناتے تھے

توصف مجلس سے گز گز بھر آگے نکل جاتے تھے۔ ایک دن رستہ میں ملے۔ دیکھتے ہی کہنے لگے۔ آج گیا تھا۔ انھیں (مرزا غالب کو) بھی سنا آیا۔ میں نے کہا؟ کہا؟ کڑک کر کہا

ڈیڑھ جز پر بھی تو ہے مطلع ومقطع غائب
غالب آسان نہیں صاحبِ دیوان ہونا

(آبِ حیات، ص 494 تا 497)

عمومی واقعات پر اکثر شعر کہا کرتے تھے۔ مومن خاں مومن کو کنورا جیت سنگھ نے ہتھنی دی۔ آپ نے کہا:

جنموں میں وہ مومن مکان لیتا ہے
نجومی بن کے جو ہتھنی کا دان لیتا ہے

دلی میں شیریں ایک بڑی نامی رنڈی تھی۔ وہ حج کو چلی۔ آپ نے کہا:

بجا ہے شیریں اگر چھوڑ دلی حج کو چلی
مثل ہے نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی

ان کی ظرافت بھی ارادی اور شعوری نہیں ہوتی تھی بلکہ جن واقعات یا معاملات سے متعلق یہ شعر کہتے تھے ان میں بجائے خود کبھی ہجو اور کبھی ظرافت کا پہلو نکل آتا تھا۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

ہیں مچھلیاں بھوؤں کی چین پر شکن کے اندر — الٹی ہے بہتی گنگا مچھی بھون کے اندر
میں وہ ہوں نخلِ جوئے سلسبیلِ دریائی — یہ مری ہے کشتیِ گل نارجیلِ دریائی
میں اپنے کوچ کی ہوں موج میں بہا جاتا — حباب وار ہوں کوسِ رحیلِ دریائی
دم کا جو دمدمہ یہ باندھے خیال اپنا — بے پُل صراط اُتریں یہ ہے کمال اپنا
کسبِ شہادت اپنا ہے یاد کس کو قاتل — سانچے میں تیغ کے، سر لیتے ہیں ڈھال اپنا

3. خلیفہ

مرزا قادر بخش صابر نے اس شاعر کا تعارف مختصراً اس طرح کرایا ہے:

''خلیفہ تخلص، رجبی حجام، موزوں طبع، ظریف مزاج، ساکن شاہجہاں آباد تھا۔ راگ ورنگ میں شریک یارانِ رنگین صحبت اور ضلع اور جگت میں ہمرنگ مصاحبانِ صادق المودت۔ ایک پہلوان کی ہجو میں چند شعر موزوں کیے تھے۔ اس میں سے یہ شعر یاد رہ گیا:

اوندھا پڑے ہے نیچے سدا ہر جوان کے
تا لوگ یہ کہیں کہ کبھی چت نہیں ہوا''

(گلستانِ سخن، جلد 1، ص 427)

افسوس ہے کہ نہ تو خلیفہ کے مزید حالات دستیاب ہو سکے اور نہ اس کی مذکورہ ہجو کا کوئی اور شعر ملا۔ اس ایک شعر سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ کی یہ ہجو مثنوی کے بجائے غزل کی ہیئت میں تھی۔

4. فدا

سید محمد علی نام تھا۔ سپاہی پیشہ تھے لیکن فقیری اختیار کر لینے کے بعد فدا شاہ کر کے مشہور ہو گئے تھے۔ شیفتہ نے ان کے تعارف میں جو لکھا ہے مختصراً یہ ہے:

''از سکنائے لوہاری من متعلقاتِ سہارنپور۔ پیشتر معاش بہ پیشہ سپاہگری می کرد۔ آخر خوفِ معاد غالب آمدہ۔ دنیا را بہ اہلِ دنیا گذاشتہ... مردے بود خوش اختلاط، بذلہ سنج از فدائیانِ فنِ شعر... عاقبت مایل بہ ہزل گشت۔ رفتش را ازیں دیار یاز دہم سال است۔''

(گلشنِ بے خار، جلد 1، ص 145 تا 146)

یعنی یہ اکبر شاہ ثانی کے ابتدائی زمانے میں دہلی میں رہے تھے۔ ان کے کلام میں ہزل کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔

نمونے کے طور پر دو شعر نقل کیے جاتے ہیں:

اس سیمیں اور مجھ سے وہ باہم رہا — ایک مدت تک یہی عالم رہا
جس نے کھایا ہے تیر مژگاں کا — اُس کے نزدیک پھانس ہے بھالا

5. کرم

شیخ غلام ضامن نام تھا۔ حکیم مومن خاں مومن کے شاگرد تھے۔ حیدر آباد تک کا سفر کیا تھا۔ نواب شیفتہ نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''باوجود کہن سالی مرد شگفتہ وظریف است۔'' (ایضاً، ص 161)

فرہاد و قیس عشق میں سرگرمِ لاف تھے — خاموش ہو گئے جو مرا نام آ گیا
اُس کو شہرت کی تمنا، مجھے رسوائی کی — ہر کوئی آرزوئے نشو و نما رکھتا ہے
گھبرا کے لگے دیکھنے وہ اپنی بنا گوش — جب اشک مری آنکھوں سے دردانہ سے نکلے
کس باغ میں وہ رونقِ گل جلوہ کناں ہے — نکلے ہے دھواں سا دِ فردوس بریں سے

شیفتہ کے بیان کے باوجود ان کے یہاں بھی ظرافت کی طرف میلان شعوری نہیں معلوم ہوتا ہے۔ صرف کسی کسی شعر کے مضمون میں ظرافت کا برائے نام سا عنصر معلوم ہوتا ہے۔

6. غالب

مرزا اسداللہ خاں غالب کو 'حیوان ظریف' کہا گیا ہے اور ان کے لطائف و ظرائف مشہور ہیں لیکن ان کی شاعری کو 'ظریفانہ' نہیں کہا جا سکتا ہے۔ ان کے دیوان میں یہ چند شعر اس اعتبار سے ضرور لائق توجہ ہیں:

شیخ جی کعبے کا جانا معلوم — آپ مسجد میں گدھا باندھتے ہیں
ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن — ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن
قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں — رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

دھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

اکبر شاہ ثانی کے عہد میں جیسے بھی حالات تھے لیکن اس بارے میں شبہ نہیں کہ اس وقت ظریفانہ شاعری، ہزل اور ہجو وغیرہ کے لیے دہلی میں ماحول سازگار نہیں تھا اور اس زمانے میں اس قسم کی شاعری کا کوئی لائق توجہ نمونہ سامنے نہیں آ سکا۔ نام برآوردہ شاعروں میں سے کسی نے بھی ہزل اور ہجو کو بطورِ خاص اختیار نہیں کیا تھا۔ حکیم مومن خاں مومن نے تو بہت صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا:

ہجو گوئی نہیں ہمارا کام

اور شیخ ذوق کے حال میں آزاد نے لکھا ہے کہ:

''ہزاروں آدمیوں سے انھیں ناراضی یا رنج پہنچا ہو گا مگر تمام عمر میں ایک شعر بھی ہجو میں نہ کہا۔ خدا ہر شخص کو اس کی نیت کا پھل دیتا ہے۔ اس کی شان دیکھو کہ اڑسٹھ برس کی عمر پائی مگر خدا نے ان کی ہجو بھی کسی کے منہ سے نہ نکلوائی۔'' (آبِ حیات، ص 454)

خود شیخ ذوق کا قول یہ تھا:

پاک رکھ اپنا دہاں ذکرِ خدائے پاک سے
کم نہیں ہرگز زباں منہ میں اترے مسواک سے

واسوخت

اکبر شاہ ثانی کے عہد میں دہلی کا ماحول بطور مجموعی ریختی واسوخت وغیرہ شعری اصناف کے لیے بھی کچھ سازگار نہیں تھا۔ چنانچہ وہاں کے معروف شاعروں نے عموماً ان کی طرف نہ کرنے کی برابر توجہ کی ہے۔ حکیم مومن خاں مومن نے ضرور ہر قسم کے

واسوخت لکھے ہیں۔ بیشتر مسدس ہیں، کچھ مثمن وغیرہ کی صورت میں ہیں۔ ایک دو میں دوسرے شاعروں کے شعر تضمین کیے ہیں۔ بعض ترجیع بند کے طور پر ہیں اور چند ترکیب بند کی شکل میں بھی ہیں۔

مومن کے دیوان میں جو پہلا واسوخت ہے اس کا عنوان اس طرح ہے:

"تضمین شعر خواجہ میر درد قدس اللہ سرہ بہ طریق تسدیس۔"

اس عنوان سے واسوخت کی نوعیت کا کسی قدر اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس میں شاعر نے خواجہ میر درد کے ایک مطلع کو تضمین کرنے کے لیے انتخاب کیا ہے۔ چنانچہ یہ واسوخت ترجیع بند کے طور پر ہے۔ اس میں کل گیارہ بند ہیں۔ کچھ متفرق بند یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

جائے عبرت ہے مرا حالِ پریشاں یارو — آس توڑے ہے یہ مایوسیِ حرماں یارو
دل لگا کر میں ہوا سخت پریشاں یارو — ہائے افسوس نہ نکلا کوئی ارماں یارو
جی کی جی ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی
ایک بھی اس سے ملاقات نہ ہونے پائی

میں بھی حاضر تھا ہوئے جب طرفِ کعبہ رواں — حضرتِ مومن تقویٰ روش و شیخِ زماں
بے ادب ہنستے تھے کیا لوگ ہیں بیہودہ گماں — پڑھ کے یہ درد کا مطلع جو ہوے اشک فشاں
جی کی جی ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی
ایک بھی اس سے ملاقات نہ ہونے پائی

اس ترجیع بند میں واسوخت والی بات کم سے کم ہے البتہ زیرِ تضمین شعر کی مناسبت سے اس میں ایک حد تک مرثیہ والی کیفیت آگئی ہے۔ اسی طور پر مومن نے ایک واسوخت اور بھی کہا ہے، جس کا عنوان ہے:

"تضمین شعر منشی فضل عظیم۔"

یہ بھی مسدس ترجیع بند ہے اور اس میں بھی شاعر نے بہت کامیابی کے ساتھ عاشق دردمند کی سرگذشت سنائی ہے:

یہ میرا حال جو اے یارو دیکھتے ہو تباہ — کہ رنگ زرد ہے، منہ فق ہے، بکھری بکھری نگاہ
ہیں اشک چشم میں اور لب پہ نالۂ جانکاہ — یہ سب ہے دل کے سبب دل نے مجھ کو مارا آہ
دل فریفتہ و ردے قاتلے دارم
زدستِ دل بہ عذابم عجب دلے دارم

اس نہج پر یہ ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ واسوختن اعتراض کردن و روگردانیدن کے معنی میں آتا ہے چنانچہ واسوخت میں روگردانی، تنفر اور بے پروائی کا مضمون ہونا چاہیے۔ عام طور سے واسوخت مسدس کی صورت میں ترکیب بند یا ترجیع بند کے طور پر لکھے گئے ہیں اور ان میں معشوق کی شکایت اُس سے بیزاری اور بے پروائی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ضمناً عشق کی مذمت بھی کی جاتی ہے۔ حکیم محمد مومن خاں مومن نے دوسرے شاعروں کے کلام کی تضمین کے علاوہ خود اپنے طور پر بھی چند واسوخت تصنیف کیے ہیں۔ ایک واسوخت کا عنوان ہے:

"مقدس بہ مضمون واسوختِ ہجر"

یہ بطور ترکیب بند ہے اور اس کا پہلا بند اس طرح ہے:

اے ستمگر کہاں تلک بیداد — سر پامالِ عاشقِ ناشاد
قول دینا عدو کو حسبِ مراد — مرگیا تیرے ہاتھ سے فریاد
فکرِ جور و سرِ جفا کب تک
بے وفا غیر سے وفا کب تک

اس کے بعد حکیم مومن خاں زمانے کی بے اعتباری کا بیان کر کے محبوب کو راہ پر آجانے کا مشورہ دیتے ہیں اور پھر کسی دوسرے محبوب کو سر پر بیٹھا لینے کا ذکر کر کے کہتے ہیں:

اس کی جانب نظر رہے ہردم — تھام لوں بس دل و جگر ہر دم
کھینچوں میں پرشرر ہردم — بزم میں اس کو دیکھ کر ہردم
مسکراؤں ترے رلانے کو
داغ کھاؤں ترے جلانے کو

آخر میں دل کی بات کہہ کر شاعر نے بڑی دلسوزی کے ساتھ اِس واسوخت کو ختم کیا ہے:

کب تلک یہ جفا سہوں گا میں — اس ستم پر نہ کچھ کہوں گا میں
یہ نہیں ہے تو بس نہ ہوں گا میں — جو کہا ہے سو کر رہوں گا میں
جلے کیوں مومن آتشِ غم میں
جائے ایسی وفا جہنم میں

اپنے مطلب کے اعتبار سے اس کو مثالی واسوخت کہا جاسکتا ہے۔ زبان کی سلاست اور بیان کی روانی بھی داد طلب ہے۔ تیس بند کے اس واسوخت میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو اس صنف کے دائرہ سے باہر ہو اور ہر بند کے مضمون میں ربط کی صورت بھی موجود ہے۔ اس واسوخت کو پڑھتے وقت بار بار ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ یہ بیان خود مومن کی آپ بیتی کا ایک حصہ ہے اور غالباً اسی لیے پر اثر ہے۔

مومن کے ایک دوسرے واسوخت کا عنوان اور اس کا پہلا اور آخری بند اس طرح ہے:

"ایضاً واسوخت بہ ہماں قالبِ مقدس"

دوستوں عشقِ نہفتہ نے ستایا ہے مجھے — آتشِ نہانی نے جلایا ہے مجھے
کیا کہوں کیا غمِ پنہاں نے دکھایا ہے مجھے — ضبطِ وحشت نے یہ دیوانہ بنایا ہے مجھے
چہرۂ زار سے پردہ نہ اٹھاؤں کب تک
گو غمِ پردہ نشیں ہے نہ دکھاؤں کب تک

ہائے جی بیٹھ گیا بس کہ اٹھائے ہیں ستم — دل کھنچے کیوں نہ بہت کھینچ چکا رنج والم
صدقۂ عشق نے بےطور کیا ناک میں دم — ایسا بیزار ہوا ہوں کہ خدا کی ہے قسم
اُس نے بھی کام نہ رکھا تو نہ رکھوں گا کام
پھر یہ سمجھوں گا کہ مومن کو بتوں سے کیا کام

اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ واسوخت پہلے سے مختلف ہے اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ مومن نے واسوخت کی حدوں پر نظر رکھ کر اس کے مضامین میں وسعت پیدا کرنے کی مثبت اور لائق ستائش کوشش کی تھی۔ عام طور سے واسوخت مسدس کی صورت میں ہی لکھے گئے ہیں۔ مومن نے ایک واسوخت مثمن کے طور پر بھی لکھا تھا۔ اس کا عنوان اس طرح ہے:

"متضمن روضۂ گلستانِ دلفروز بہ گلفشانیِ مضامینِ دلسوز"

اس واسوخت کا موضوع بھی نیا اور دلچسپ ہے۔

مومن کے واسوخت اردو کی بیانیہ شاعری کا اچھا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ان میں عاشق کے جذبات، کیفیات اور معاملات کی بہت کامیاب عکاسی کی گئی ہے۔ ان میں فکر کی تیزی اور خیالوں کی نزاکت کے ساتھ ساتھ بیان کا ربط، بندش کا لطف اور زبان کی خوبی بھی داد طلب ہے۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ ان کی طرف تا حال کما حقہ توجہ نہیں کی گئی ہے۔

ماخذ: تاریخ ادب اردو (1811 تا 1837) (جلد نہم)، مصنف: محمد انصار اللہ، سنہ اشاعت: 2012،
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

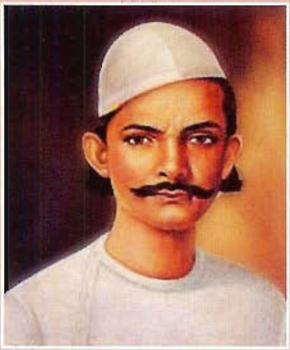

ایس نسیم بانو

مرثیہ انیس میں یوم عاشور

عربی سے فارسی اور فارسی سے اردو تک پہنچنے والی اصنافِ ادب میں ایک مشہور ومقبول صنفِ سخن مرثیہ ہے۔ مرثیہ عربی لفظ 'رثا' سے مشتق ہے۔ جس کے لغوی معنی میت پر رونا ہے۔ گویا اس صنف میں کسی عزیز یا حبیب کی موت پر اظہارِ غم کیا جاتا ہے۔ عربی سے یہ صنف سخن فارسی میں منتقل ہوئی۔ فارسی کے مشہور شاعر فردوسی نے 'شاہنامے' میں سہراب کی موت پر اس کی ماں کے اضطراب اور غم و گریے کا اظہار کیا ہے۔ لیکن اسے رزمیہ قرار دیا گیا۔ سانحۂ کربلا کے بعد حضرت امام حسین اور رفقائے امام حسین کی شہادت کے واقعات مرثیے کا موضوع قرار پا چکے تھے۔ اگرچہ اس وقت شخصی مرثیے لکھے گئے لیکن مرثیے سے سانحۂ کربلا ہی کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے۔

لغت میں مرثیہ موت پر اظہارِ غم کرنے کے ہیں۔ اردو میں اس کا عام مفہوم وہ نظم ہے جو کربلا کے خونی واقعات پر لکھی گئی ہو۔ یعنی حادثۂ کربلا کے واقعات کی تفصیل۔

اردو میں شعرا شروع ہی سے اس طرف متوجہ تھے۔ خصوصاً دکن کی سرزمین میں اس صنف کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ غالباً مرثیہ کی ابتدا دکن ہی بتائی جاتی ہے، جس کا پھیلاؤ لگ بھگ ساڑھے چار سو برس پر ہے۔

البتہ شمالی ہندوستان میں مرثیے کا عروج رہا اور یہاں پر ان گنت مرثیوں کے ذریعے اردو شاعری کو گراں مایہ بنا دیا۔ اردو زبان کو الفاظ کا ایسا ذخیرہ انیس نے دیا جو کسی صدی میں بھی نہ رہا ہوگا۔ میر انیس نے جس وقت مرثیہ لکھنا شروع کیا۔ اس وقت دبیر کا بول بالا تھا اور لوگ صنعت گری کے عادی تھے۔ حقیقت یہ تھی لوگ شاعرا سے سمجھتے تھے جو غزل نگار ہو اور بگڑا شاعر مرثیہ گو اس وقت کا عام تاثر تھا۔ اسی پس منظر کو پیش کرتا ہوا انیس کا یہ شعر:

اک طرف میں اور زمانہ اک طرف
جاں شیریں مفت ہوتی ہے تلف

میر انیس کے کلام کی سادگی آہستہ آہستہ لوگوں کے دلوں کو چھوتی گئی اور آپ کی یہی سادگی ایک دن آپ کی شہرت اور مقبولیت کا باعث بنی۔ رفتہ رفتہ انیس کے قدردانوں میں اضافہ ہوتا گیا جس سے بے حد متاثر ہو کر آپ نے کہا تھا:

کہتی ہے زمین کبھی نہ دیکھے ہوں گے
گردوں نے بھی گنجان ستارے ایسے

بعض لوگ میر انیس کے کلام کو اس نظر سے دیکھتے ہیں۔ گویا وہ سب کے لیے نہیں صرف امام حسینؓ سے مذہبی عقیدت رکھنے والے لوگوں کے لیے ہیں اور چند لوگوں کے لیے میر انیس کا کلام ماہِ محرم میں سننے کے لیے ہوتا ہے۔ آہ یا واہ کر لینا ان کے لیے کافی ہے۔ انیس صاحب نے آہ و بکا کی خاطر ڈھائی ڈھائی سو بندوں کے مرثیے نہیں لکھے۔ نہ تو آپ نے رونے رلانے کے لیے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کو مرثیے میں اجاگر کیا۔ اگر آپ غور سے انیس کے مرثیے پڑھتے اور سنتے ہیں تو آپ یہ بات جان لیں گے کہ مرثیہ انیس میں انیس نے اخلاقی اقدار کو روشن کیا ہے۔ یہ ایسی قدریں ہیں جو کبھی بھی مٹ نہیں سکتی۔ میر انیس کی اخلاقی قدروں کے متعلق صالحہ عابد حسین لکھتی ہیں:

''یہ قدریں ہیں خداشناسی اور خودشناسی۔ عقیدہ اور ایمان دیانت اور شرافت۔ حق پرستی، عفو و کرم، ایثار و قربانی، شجاعت و جاں بازی، وفا اور جاں نثاری، صبر اور استقلال راضی برضا رہنے کا حوصلہ۔ رشتوں کی پاس داری اور انسانیت کا درد، خلوص اور محبت اور پھر حق کی راہ میں جان قربان کرنے کا وہ جذبہ جو شہادت کی منزل تک پہنچ سکتا ہے۔''

یہ ساری قدریں میر انیس کے مرثیے میں بلا واسطہ اخلاقی تعلیم کے تحت ہمیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ میر انیس کے یہ اشعار زندگی کے سارے تجربات کا نچوڑ ہیں۔ یا یوں کہیے کہ ایک تصوفانہ رنگ جھلکتا ہے:

ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا
بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے

جب اللہ تعالیٰ دنیا میں انسان کو شہرت سے نوازتا ہے۔ وہ انسان عموماً دوسروں کو حقیر سمجھنے لگتا ہے لیکن میر انیس شہرت حاصل کرنے کے بعد بھی خود کو حقیر سمجھ رہے ہیں اور ساری کائنات کے ذرّوں کو اونچا رتبہ دے رہے ہیں:

کبھی برا نہیں جانا کسی کو اپنے سوا
ہر ایک ذرہ کو ہم آفتاب سمجھے ہیں

رشتوں کی پاسداری اور خلوص ومحبت کو نبھانے کا طریقہ میر انیس کے یہاں بہت نفیس انداز میں دیکھنے کو ملتا ہے:

کسی کو کیا ہو دلوں کی شکستگی کی خبر
کہ ٹوٹنے میں یہ شیشے صدا نہیں رکھتے

اخلاقی تعلیم کی انیس کے یہاں کوئی کمی نہیں۔ مرثیوں میں اس کثرت سے اشعار ہیں کہ اگر تشریح و تجزیہ کیجیے تو ایک مکمل کتاب بن جائے۔

میر انیس کے مرثیوں میں صبح عاشورہ کا منظر جابجا دیکھنے کو ملتا ہے۔ گویا انیس کے نزدیک منظر صبح کی عکاسی برائے حمد نہیں بلکہ کائنات کی گہرائیوں کی پوری حقیقت سے روبرو کرانا ہو:

پھیلا ہوا تھا نور سحر ارض و سما میں
مصروف تھی سب فوج خدا یادِ خدا میں
چھپنا وہ ماہتاب کا وہ صبح کا ظہور
یاد خدا میں زمزمہ پردازیٔ طیور

صبح عاشورہ میں میر انیس کے یہاں یہ صبح تخلیق کا پر تولیے ہوئے برآمد ہوئی ہے۔ اس صبح آفتاب کا طلوع ہونا ایک نئی دنیا کی بشارت ہے۔ یعنی اب دنیا میں نورِ ایمان جگمگائے گا۔ تاریکی دور ہوگی یعنی گناہ جہالت ظلم، فریب اس نئی صبح کے اجالے میں ماند پڑ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں رات اور صبح کا ذکر کرنے کے لیے کہتا ہے:

''تو کہہ میں پناہ میں آیا صبح کے رب کی، ہر چیز کی بدی سے جو اس نے بنائی اور بدی سے اندیرے کی جب سمٹ آئے۔''

میر انیس نے اپنی بے مثال صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے انھیں باتوں کو شعری انداز میں بیان کیا ہے جس کا ذکر قرآن شریف میں موجود ہے:

پیمانۂ خورشید لگا نور سے بھرنے

گردوں سے سفر فوج کواکب لگی کرنے

صبح عاشور کی ابتدا علی اکبر سے ہوتی ہے۔ حضرت امام حسینؑ علی اکبر سے اس صبح اذان کی فرمائش کرتے ہیں جس کا ذکر میر انیس نے یوں کیا ہے:

فرمایا سحر قتل کی ظاہر ہوئی بیٹا
لو اٹھ کے اذاں دو کہ شب آخر ہوئی بیٹا

حضرت علیؑ جب صبح عاشور کو اذاں دی کائنات کا ہر ذرہ جھوم اٹھا:

چپ تھے طیور جھومتے تھے وجد میں شجر
تسبیح خواں تھے برگ و گل و غنچہ و ثمر
محو ثنا تھے لوح و نباتات و دشت و در
پانی سے منہ نکالے تھے دریا کے جانور

یہ اذان نہ صرف ایک نئی صبح کی نوید تھی بلکہ خواب خرگوش میں مبتلا نفوس کو جھنجھوڑ کر بیدار کرنے کا ایک ذریعہ تھی۔ اس کے علاوہ میر انیس نے صبح کے دل کش منظر اور صبح کی شگفتگی کو بڑے ہی اچھوتے انداز میں بیان کیا ہے۔ صبح جب اوس پودوں پر پڑتی ہے۔ شبنم کے ان قطروں کو بڑے ہی خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے:

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک
ہر برگِ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک

میر انیس کے ان اشعار کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ساری کائنات از سر نو خلق ہوئی ہے۔ دراصل صبح عاشور کا یہ سارا منظر تمثیل کی زبان میں ایک نئی دنیا کی نوید دے رہا ہے۔ صبح عاشور کے مناظر کو تفصیلاً بیان کرنے کا مقصد ظلم کی تاریکی چھٹنے کے بعد ایک نئی قوت مدافعت کا پیدا ہونا ہے۔ جسے حضرت امام حسین نے اپنے خون کا عطیہ دے کر اسلام کو اس خطرے سے بچا لیا۔ جو انسانیت کے تصور کو ایک بہت بڑے خطرے میں ڈال دیا تھا (یعنی یزید اور اس کی افواج مظالم اور بے راہ روی کی نمائندہ تھی) اس ظلم، تشدد، گناہ اور غلاظت سے دنیا پاک ہوئی اسی سرسبز وشاداب صبح کا ذکر میر انیس نے کیا ہے جس سے آپ کا کلام عبادت کہلانے کا مستحق بن گیا۔

یوم عاشور کو یزیدی فوجیں جنگ کی ابتدا کر دیتی ہیں۔ امام حسینؑ جو برابر دشمن کو لڑائی سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور مخالف فوج کو سمجھا رہے ہیں:

مجھ کو لڑنا نہیں منظور یہ کیا کرتے ہو
تیر جوڑے میں جو مجھ پر تو خطا کرتے ہیں

یزیدی فوج کربلا میں ساتویں محرم سے حسینؑ اور ان کے بچوں کو پانی دینا بند کر دیتی ہے۔ نہر فرات پر پہرہ بٹھا دیا گیا۔ کس حسرت کے ساتھ کہتے ہیں:

چشم امید ہو کیا سب نے پھرائی ہے نگاہ
کوئی اک جام بھی پانی کا نہیں دیتا ہے آہ
بچے روتے ہیں تو سینہ مرا شق ہوتا ہے

روز عاشور سارے جاں نثار شہید ہوتے ہیں۔ صرف اکبر وعباس باقی رہتے ہیں۔ عباس میدان جنگ میں جا کر جہاد کرنا چاہتے ہیں تا کہ بچوں کے لیے پانی لاسکیں۔ لڑتے ہیں اور نہر تک پہنچتے ہیں۔ مشک بھرتے ہیں مگر خود تین دن کے پیاسے ہونے کے باوجود لب تر نہیں کرتے۔ اس لیے کہ بھائی اور بھائی کے بچے پیاسے ہیں۔ محبت، صبر کا بے مثال منظر شاید ہی ہمیں کہیں دیکھنے کو ملتا ہے۔ لڑتے ہوئے خیموں تک پہنچنا چاہتے ہیں مگر یزیدی فوجیں چاروں طرف سے گھیر لیتی ہیں۔ شانے سے دونوں بازو جدا ہو جاتے ہیں۔ مشکیزہ جس میں پانی بھرا ہے وہ دانتوں سے پکڑ لیتے ہیں۔ مگر اس پر دشمن تیر سے نشانہ لگاتا ہے۔ میر انیس نے اس سارے منظر کو شاعری میں یوں بیان کیا ہے:

> چند لوگوں کے لیے میر انیس کا کلام ماہِ محرم میں سننے کے لیے ہوتا ہے۔ آہ یا واہ کرلینا ان کے لیے کافی ہے۔ انیس صاحب نے آہ و بکا کی خاطر ڈھائی ڈھائی سو بندوں کے مرثیے نہیں لکھے۔ نہ تو آپ نے رونے رلانے کے لیے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کو مرثیے میں اجاگر کیا۔ اگر آپ غور سے انیس کے مرثیے پڑھتے اور سنتے ہیں تو آپ یہ بات جان لیں گے کہ مرثیہ انیس میں انیس نے اخلاقی اقدار کو روشن کیا ہے۔ یہ ایسی قدریں ہیں جو کبھی بھی مٹ نہیں سکتی۔

دریا سے مشک بھر کے جو نکلا وہ تشنہ کام
پھر گھاٹ پر گھٹا کی طرح چھائی فوج شام
دانتوں سے پکڑی مشک کہ محنت تباہ نہ ہو
مشکیزے پر بھی تیر لگا وامیاہ تو
پانی کے ساتھ حضرت عباس گر پڑے

یہ تاریخ انسانی کا ایک بے مثال نمونہ ہے۔ انسان کو صرف خدا پر بھروسہ ہونا چاہیے۔ کیسا ہی سخت مصیبت کا وقت ہو ہر حال میں خدا پر بھروسہ رکھے سارا خاندان فنا ہو جانے کے بعد بھی صبر کی ہدایت دیتے ہیں:

اٹھ جائیں بھائی بھانجے یا ہو پسر جدا
صابر اسی سے صبر کی کرتے ہیں التجا
ناموس لٹیں، قید ہوں، یا شام میں جائیں
مہلت مرے لاشہ پہ بھی رونے کی نہ پائیں
بیڑی میں قدم، طوق میں عابد کا گلا ہو
جس میں تیرے محبوب کی امت کا بھلا ہو

حسینؑ نے ہر صدمہ سہا، غم اولاد میں میر انیس نے جو صبر کی شان دکھائی وہ ساری انسانیت کے لیے ایک نمونہ ہے۔

مرثیے صرف آہ و بکا یا نالہ وفریاد کے لیے لکھے نہیں جاتے۔ بلکہ یہ مخصوص تعلیم دیتے ہیں۔ اگر آپ ان کا گہرائی سے مطالعہ کریں اور ان مثالوں پر غور کریں تو یہ رونے رلانے سے زیادہ صبر واستقلال، راضی برضا، اور رضائے الٰہی پر سر جھکانے کا درس دیتے ہیں۔ خصوصاً میر انیس کے مرثیے میں اخلاقی قدروں کو دل نشیں انداز میں پڑھنے کے بعد ہم ان سبھی کرداروں کے اعلیٰ صفات کے قائل ہوتے ہیں۔

بے شک مرثیے کو پڑھنے یا سننے کے بعد آنسو آنا یا رونا ایک ایسا عمل ہے جو ہم سوچ سمجھ کر نہیں کرتے۔ یہ واقعات ہی ایسے ہیں جو رونگٹے کھڑے کر دیتے ہیں اور جب بات دل سے نکلتی ہے تو دل میں اترتی ہے۔ مرثیہ نگار بھی اسی عقیدت ومحبت کے جذبے کو لیے ہوئے اپنا قلم اٹھاتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اس میں محو ہو جائیں اور دوسری باتوں کو ان دیکھا یا ان سنا کر دیں۔

بہر کیف میر انیس کے فن کارانہ انداز بیان سے حادثۂ کربلا یا معرکۂ کربلا پر مبنی کلام عبادت کی سطح پر آیا تو اس میں از خود صداقت کو گرفت میں لینے کی سکت پیدا ہوئی اور آپ صبح عاشور کی زرخیز علامتوں میں امام حسین کی لازوال قربانی کے جملہ پہلوؤں کو احاطہ کرنے میں کامیاب ہوگئے یا یوں کہیے اس لازوال قربانی کے جملہ مراحل کو اپنے فن کارانہ حسن سے نوازا ہے۔ ان مرثیوں کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ حضرت امام حسینؑ نے بے دریغ خون بہانے کی روایت کے خلاف جہاد کیا ہے۔ اور یہ جہاد قربانی کی عظیم قوت کی مدد سے کامیاب ہوا جسے میر انیس نے اپنی قوت بیان سے صنف مرثیہ میں اس حسن عقیدت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت صرف آپ کو نصیب فرمائی ہے۔

□

Dr. S Nasim Bano, Plot No 106, Sadashiv Nagar East, Old Hubli, Bubli - 580024 (W.B.)

قاضی حبیب احمد

حیدرآبادی ڈھولک کے گیت اور ان کی ثقافتی اہمیت

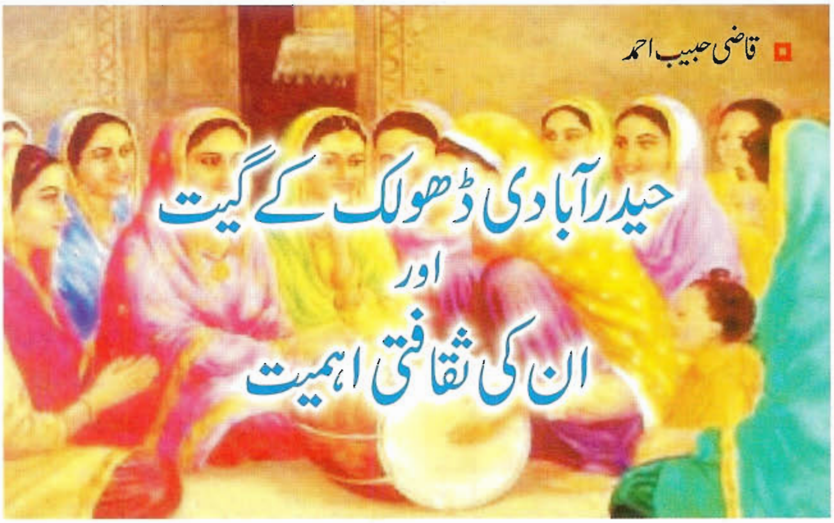

لوک ادب وہ ہے جو ہمیں اپنے ماضی سے جوڑتا ہے۔ ہماری تہذیبی روایتوں، اور رواجوں سے ملنے والی روحانی مسرت اور سرور و انبساط سے ہمیں آشنا کراتا ہے۔ جنوبی ہندوستان میں اردو لوک ورثہ دکنی زبان میں دستیاب ہے۔ دکنی لوک گیتوں میں شادی بیاہ اور دیگر مذہبی رسومات کے موقعوں پر مختلف گیت گائے جاتے ہیں۔ ان گیتوں میں سب سے ممتاز مقام ڈھولک کے گیتوں کو حاصل ہے۔ لوک گیتوں میں استعمال ہونے والے موسیقی کے آلوں میں بین، بانسری اور الغوزہ کے ساتھ ڈھولک کی بھی خاص اہمیت ہے۔

ڈھولک یوں تو ہندو پاک کے کئی مقامات میں رائج رہا ہے اور آج بھی خاص خاص موقعوں پر ڈھولک کی تال پر اردو ہندی اور دیگر علاقائی زبانوں میں گیت گائے جاتے ہیں۔ ڈھولک دراصل ڈھول کی تصغیر ہے یعنی ڈھول حجم میں بڑا ہوتا ہے اور منہ چوڑا اور کھلا ہوتا ہے اور ایک ہی جانب بجایا جاتا ہے جب کہ ڈھولک چھوٹا ہوتا ہے اور دونوں جانب بجایا جاتا ہے۔

حیدرآباد دکن اور اس کے قرب و جوار میں جن ڈھولک کے گیتوں کا رواج ہے یہ موسیقی کے آلے سے اپنی شناخت ضرور رکھتا ہے لیکن اس کی اصل پہچان اس کے گیت ہیں اور ان گیتوں کی مخصوص زبان ہے جو مقامی دکنی ہے۔ یہ وہی زبان ہے جو ابتدا میں اردو شاعری کی زبان تھی۔ ملا وجہی کی نثری تصنیف 'سب رس' میں بھی ہمیں یہی زبان کسی قدر فارسی آمیز ملتی ہے۔ زمانے کے ساتھ ساتھ اس زبان میں تغیرات ہوتے رہے اور آج بھی یہ آندھرا پردیش، کرناٹک اور تمل ناڈو میں لوگوں کی بول چال کی زبان ہے۔ الگ الگ علاقوں کے لہجے اور آہنگ سے اس میں فرق نظر آتا ہے لیکن ڈھولک کے گیتوں میں وہی زبان استعمال ہوئی ہے جو حیدرآباد دکن کی بول چال کی زبان ہے۔ اس زبان میں بڑی شیرینی اور چاشنی ہے۔ اس کے محاوروں میں بڑی کیفیت اور معنی آفرینی ہے۔

عموماً کشمیر، سندھ، پنجاب اور شمالی ہند کے بعض دیہاتی اور کوہستانی آبادیوں اور بھوجپوری کے علاقے میں جو لوک گیت ڈھولک کی تال پر گائے جاتے ہیں ان میں موسموں اور تقریبوں پر، عشقیہ و رزمیہ داستانوں پر اور صوفیانہ کلام پر گیت ملتے ہیں۔ جہاں تک حیدرآبادی ڈھولک کا تعلق ہے اس میں خاص مقامی کلچر اور طرز معاشرت کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ رہنے سہنے اور کھانے پینے کے طریقے، لباس اور گھریلو سامان، شادی بیاہ کے رسم و رواج، خوشی و غمی کے اظہار کے طریقے، کھانے پینے اور پکوان کی انواع واقسام رشتے ناتے، ان رشتوں کی آپسی کشمکش، چشمکیں اور رقابتیں، میاں بیوی کا رشتہ اور اس رشتے سے وابستہ الجھنیں اور دیگر جزوی پہلو جن کے تذکرے سے گدگدی پیدا کی جاسکتی اور چٹخارہ لیا جاسکتا ہے اور یہی حیدر آبادی ڈھولک کے مقبول موضوعات ہیں۔ یہ وہ باتیں ہیں جو عورتیں آپس میں کہہ سن کر اپنا من ہلکا کرتی ہیں۔ ہنس اور گا کر لطف اندوز ہوتی ہیں۔ پڑھی لکھی خواتین کے پاس ترسیل کے ہزاروں ذریعے موجود ہیں لیکن دیہاتی عورتیں اپنے جذبات کا اظہار لوک گیتوں میں کرتی ہیں۔ جیسے وزیر آغا نے کہا ہے:

''گیت مزاجاً نسوانیت کے غنائی اظہار کی ایک صورت ہے۔ ثقافتی لحاظ سے اس کا نہایت گہرا تعلق زمین سے ہے اور زمین عورت سے مشابہ ہے۔ وہ عورت ہی کی طرح روح کو ایک ارضی جسم عطا کرتی ہے اور زندگی کی بقا اس کا عظیم ترین مقصد ہے۔'' (اردو شاعری کا زوال: وزیر آغا)

ڈھولک کے گیتوں میں بھی ادعا اور اظہار عورت کی جانب سے ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ایک عورت گاتی ہے اور کئی عورتیں اس کے جلو میں گاتی ہیں۔ گیت کے بول مختصر ہوتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ بارہ یا پندرہ سطریں ہوتی ہیں۔ گیت کے بول کئی بار دوہرائے جاتے ہیں اور اس کی تکرار سے سماں باندھا جاتا ہے لیکن ٹیپ کا مصرعہ یا Title Line کو خوب دوہرایا جاتا ہے۔ لڑکیوں کے کھلکھلانے اور کھنکنے سے گیت کا آغاز ہوتا ہے۔ لیکن جن گیتوں میں طنز یا رومان اور راز و نیاز زیادہ ہوتا ہے تو ان کے آغاز پر لڑکیاں زیادہ کھلکھلا کر ہنستی ہیں۔ ان گیتوں میں ڈھولک کے ساتھ تالیاں بھی بہت بجائی جاتی ہیں یعنی تال کے ساتھ تالیاں ڈھولک کی پہچان ہے۔

جہاں تک ڈھولک کے موضوعات کا تعلق ہے یہ حیدرآبادی معاشرے کے عام موضوعات ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حیدرآباد اور اس کے نواح میں عورتیں دوپہر کے کھانے کے بعد ایک جگہ جمع ہو جاتی تھیں اور معاشرے کے مضحک پہلوؤں پر اپنے انداز میں اپنی زبان میں تالیوں اور پہلے تو مٹی کے ڈول، مٹکی یا دیگر ظروف کی مدد سے ساز پیدا کیا جاتا تھا اور بعد میں ڈھولک کا استعمال کیا جانے لگا اور یہ طریقہ اتنا مقبول ہوا کہ اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ اس طرح ایک شناخت قائم ہوگئی۔ یہاں یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ ڈھولک کے گیتوں میں اکثر خارجیت پائی جاتی ہے۔ ورنہ عموماً گیتوں میں داخلیت ملتی ہے۔ ڈھولک کے موضوعات گیتوں کے عام موضوعات سے کسی قدر مختلف ہیں۔ گیت کے موضوعات کے سلسلے میں وزیر آغا کا خیال ہے:

''گیت کی آواز میں دھرتی کی بہت سی دوسری آوازیں بھی شامل ہو جاتی ہیں۔ جیسے پپیہے کی پکار، کوئل کی کوک، مینا کا ترنم، بھونرے کی گھن گھن وغیرہ۔ اسی طرح محبوب کے دیس کی طرف جاتا ہوا بادل یا چاند، ندی کنارا، جنگل، برکھا، پھلواری یہ تمام چیزیں مل کر وہ پس منظر تیار کر دیتی ہیں جس پر محبت اپنے نقوش اجاگر کرتی ہے۔ اس فضا میں فطرت کا ترنم، رقص، لباس اور چھوئی موئی کی سی کیفیت۔ یہ سب کچھ شامل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب دور سے آنے والی بنسی کی تان سن کر (بنسی کی تان محبوب کا بلاوا ہے) عورت گیت گاتی ہے تو گویا ساری دھرتی اپنے جادو کا تماشا دکھاتی اور رقص کرتی ہے۔''

(اردو شاعری کا زوال: وزیر آغا)

ڈھولک کے گیت حیدر آبادی معاشرت کے آئینہ دار ہیں۔ حیدر آبادی معاشرت کی ترجمانی دیگر وسائل سے بھی ہوئی ہے۔ جہاں شاعری اور فکشن میں گراں و

بوجھل افکار وخیالات اور فلسفیانہ موشگافیوں سے پیچیدگی پیدا کی جاتی ہے اور اس طرح اہل علم کے لیے ایک مشغلہ ہاتھ آتا ہے۔ ڈھولک کے گیتوں کے ذریعے اظہارِ خیال کے لیے ایک آسان اور ارزاں طریقہ اختیار کیا گیا ہے جو عوام کے ہر طبقے کے لیے قابل فہم ہے۔

ڈھولک کے گیت ایک عرصے تک آکاش وانی، حیدرآباد سے نشر ہوتے تھے اور اس کے سامعین دنیا بھر میں موجود تھے جو انھیں سن کر لطف اٹھاتے تھے۔ ہفتے میں ایک یا دو دن یہ پروگرام نشر ہوتا تھا۔ اب یہ سلسلہ موقوف ہے۔

آیئے ڈھولک کے گیتوں کی کچھ جھلکیاں دیکھیں۔

ڈھولک کا یہ گیت ملاحظہ ہو:

بھائی ہمارے ہوگئے بھابی کے دوانے اللہ
بھابی کو ہماری جی بھابی کو ہماری کنگن نکال دے
بھائی ہمارے ہوگئے باتاں کے دوانے اللہ

اس طرح اس گیت میں بھابی کے پازیب، کنگن وغیرہ اتارنے کا ذکر ہے اور جس سے یہ مستنبط کیا گیا ہے کہ ان زیوروں سے متعلق اعضا پر بھائی ریجھ گئے ہیں۔ بہرحال ایک ایسا منظر اور ایسا سماں باندھا گیا ہے جو سننے والے کے لیے تاثیر اور دلچسپی پیدا کرتا ہے اور چونکہ اکثر گھروں میں نئی نویلی بھابیوں کے ساتھ ان کی غیر شادی شدہ نندوں کی نوک جھونک اور چپقلش رہتی ہے۔ نیا شادی شدہ دولہا اپنی دلہن کے نازنخرے اٹھاتا ہی ہے تو دولھے کا یہ رویہ اکثر گھر والوں کے لیے بے چینی اور رقابت کا باعث بنتا ہے۔ ایسے بہت سارے دیگر گیت ہیں جو دکھتی رگ پر ہاتھ رکھتے معلوم ہوتے ہیں اور عام لوگوں کے لیے لطف ومسرت کا باعث ہوتے ہیں۔ ایک اور ڈھولک ہے ''دیور جی میری انگنائی میں گلی مت کھیلو''

اس گیت میں بھاوج اپنے دیور کو 'گلی ڈنڈا' کھیلنے سے منع کرتی ہے۔ وہ کئی خدشے ظاہر کرتی ہے تمھاری گلی پڑوسن کی انگنائی میں پڑے گی تو پڑوسن کی بلی ہمارے گھر آجائے گی اور میرا چھیکا توڑ دے گی۔ اس پر بھی وہ نہیں مانتا تو کہتی ہے پڑوسن لکڑی لے کر آئے گی اور ساسر جی کے کوڑے لگیں گے۔ اس پر بھی وہ باز نہیں آتا تو اصل بات اس کی زبان پر آجاتی ہے اور کہتی ہے:

تمھاری گلی پڑوسن کے گھر میں
پڑوسن کی چھوکری ہماری انگنائی میں
میری جورانی بن جائے گی
دیور جی میری انگنائی میں گلی مت کھیلو

گھر کی عورتوں کو اس طرح کے خدشے اور واہمے بہت ہوتے رہتے ہیں اور اسی عام خیال کو گیت کا روپ دیا گیا ہے اور یہ گیت ہزاروں ایسے خیالات رکھنے والوں کی تسکین کا باعث بن جاتا ہے۔ ڈھولک کے گیتوں میں گھریلو کشمکش اور گھریلو رشتوں اور رشتہ داروں کی نفسیات ہی کی جھلکیاں عام زبان اور محاورے میں گیت کی شکل میں سامنے آتی ہیں۔ یہ گیت عام شاعری کی طرح گہری سوچ وفکر کے غماز نہیں ہوتے نہ ہی ان میں فکر وفلسفے کی پیچیدگیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ خانگی معاملات کی سیدھا سادہ اظہار ہوتا ہے۔ یہ عام روز مرہ کی زندگی کا مشاہدہ ہے جو ہر عام وخاص آدمی کا تجربہ ہے تو ان گیتوں میں ہر فرد اپنے دل کی دھڑکن محسوس کرتا ہے۔ ان گیتوں کی لفظیات اور محاورے بھی عام بول چال کے ہوتے ہیں تو ہر عقل وفہم کے انسان کے لیے قابل قبول ہوتے ہیں۔

ڈھولک کے گیتوں میں گھریلو کشمکش اور گھریلو رشتوں اور رشتہ داروں کی نفسیات ہی کی جھلکیاں عام زبان اور محاورے میں گیت کی شکل میں سامنے آتی ہیں۔ یہ گیت عام شاعری کی طرح گہری سوچ و فکر کے غماز نہیں ہوتے نہ ہی ان میں فکر و فلسفے کی پیچیدگیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ خانگی معاملات کی سیدھا سادہ اظہار ہوتا ہے۔ یہ عام روز مرہ کی زندگی کا مشاہدہ ہے جو ہر عام و خاص آدمی کا تجربہ ہے تو ان گیتوں میں ہر فرد اپنے دل کی دھڑکن محسوس کرتا ہے۔ ان گیتوں کی لفظیات اور محاورے بھی عام بول چال کے ہوتے ہیں تو ہر عقل و فہم کے انسان کے لیے قابل قبول ہوتے ہیں۔

ڈھولک کا یہ گیت ملاحظہ ہو جس میں ساس نند اور شوہر کے رشتوں کا ایک انوکھا پہلو سامنے آتا ہے۔ اس گیت کے کچھ بول سنیے:

سنو محلے والو میری کالی مرغی کھوگئی نا
ساس پوچھے بہو بیگم خاصے میں کیا پکائے تم
میں بولی جی کیا بولی جی جوار کی روٹی امبڑے کی بھاجی کالی مرغی کھوگئی نا
سنو محلے والو میری کالی مرغی کھوگئی نا
نند نے پوچھے بھابی بیگم خاصے میں کیا پکائے تم
میں بولی جی کیا بولی جی باسی روٹی باسی سالن کالی مرغی کھوگئی نا
سنو محلے والو میری کالی مرغی کھوگئی نا
سیاں پوچھے میری بیگم خاصے میں کیا پکائے تم
میں بولی جی کیا بولی جی مرغی کا سالن گھی کے پراٹھے کالی مرغی مل گئی نا
سنو محلے والو میری کالی مرغی مل گئی نا

یعنی بہو اپنی ساس کو یہ کہہ کر ٹال دیتی ہے کہ کالے رنگ کی جو مرغی اس نے پال رکھی تھی وہ کھوگئی ہے اس لیے میں نے جوار کی روٹی اور امبڑے کی بھاجی بنائی ہے۔ نند سے کہتی ہے کہ باسی روٹی اور باسی سالن اس نے خاصے میں بنایا ہے۔ تمام محلے میں یہ اودھم مچاتی ہے کہ اس کی کالی مرغی کھوگئی ہے۔ لیکن جب اس کا شوہر آتا ہے تو کہتی ہے کہ اس نے خاصے میں مرغی کا سالن اور گھی کے پراٹھے بنائے ہیں اور کالی مرغی جو کھوگئی تھی اب مل گئی ہے۔

ڈھولک کے گیتوں میں عام طور پر خارجی موضوعات کو لے کر طنزیہ اسلوب میں گیت گایا جاتا ہے جس میں خوب ہنسنا ہنسانا ہوتا ہے لیکن بعض گیت داخلی نوعیت کے بھی ہیں جو کیفیت اور کمیت سے بھرپور ہیں۔ مثلاً ڈھولک کا یہ گیت ملاحظہ ہو:

چلے آؤ سیاں رنگیلے میں واری رے
سجن موہے تم بن بھائے نہ گجرا
نہ موتیا چنبیلی نہ جوہی نہ موگرا
چلے آؤ سیاں رنگیلے میں واری رے
سجن موہے تم بن بھائے نہ زیور
نہ جھمکے نہ کنگن نہ جھومر نہ ہار
چلے آؤ سیاں رنگیلے میں واری رے
سجن موہے تم بن بھائے نہ سنگھار
نہ کاجل نہ سرخی نہ مسی نہ مہندی
چلے آؤ سیاں رنگیلے میں واری رے

جہاں لوک ورثے کے تعلق سے عموماً عدم توجہی لاپرواہی کا مظاہرہ کیا جارہا ہے اسی طرح حیدرآبادی ڈھولک بھی بے اعتنائی کا شکار ہورہا ہے۔ ان گیتوں کے متن کے تحفظ، ان پر تحقیق وتبصرے اور تنقید کی جانب بہت کم توجہ کی جارہی ہے۔ ایک تو اردو زبان میں لوک ورثہ کی طرف شروع ہی سے بے اعتنائی برتی گئی ہے جس کے سبب ایک بڑا ذخیرہ محفوظ نہیں رکھا جاسکا ہے۔ اب جس قدر لوک ورثہ دستیاب ہے کم از کم اس کے تحفظ کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔

□

Dr. K Habeeb Ahmed, Asst. Professor of Urdu Dept. of Arbic, Persian & Urdu University of Madras, Marina Campurs, Chennai- 600005

محمد علم اللہ

سنیما کیسے دیکھیں

فلموں کے سماج پر اثرات، بحث کا ایک پرانا موضوع ہے، معاشرے کے مختلف طبقوں کی جانب سے الزامات لگائے جاتے ہیں کہ فلمیں معاشرے کو بگاڑ رہی ہیں، جب کہ فلم والے اپنا دفاع یہ کہہ کر کرتے ہیں کہ وہ وہی دکھا رہے ہیں جو سماج میں وقوع پذیر ہو رہا ہے یا جسے سماج پسند کرتا ہے۔ اس بحث کا کبھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا، کیونکہ دونوں کے اپنے اپنے دلائل ہیں۔ ہاں! بات اگر اثرات کی کریں تو وہ بہت تشویش ناک سطح تک پہنچ گئی ہیں۔ عمارتوں سے چھلانگ لگانے، کھیل کھیل میں ساتھی کو چوٹ پہنچانے سے آگے بڑھ کر فلم کے ذریعے ناظرین جرم کرنا سیکھ گئے ہیں اور یہ ان کی ترغیب کا وسیلہ بن رہی ہے۔ شاید اسی وجہ سے ہندوستان میں اس کے عہد طفولیت میں ہی ہمارے بزرگوں نے اس کے بھیانک اثرات کے پیش نظر اس سے محتاط رہنے کی تلقین کی تھی۔ چنانچہ 1926 میں ہی مہاتما گاندھی نے 'ینگ انڈیا' میں سنیما سے جڑے افراد کو نصیحت کرتے ہوئے لکھا تھا ''اس کا برا اثر روزانہ میرے اوپر پڑتا ہے اس لیے میں فلم بنانے والوں سے کہوں گا کہ وہ سماج کو پاک و صاف اور سدھار کرنے والی فلمیں بنائیں''۔ 1935 میں پریم چند 'ہنس' میں لکھتے ہیں ''سنیما اگر ہماری زندگی کو صحت مند لطف نہیں دے پاتا ہے، ہمیں بے حیائی و بے شرمی اور فتنہ پردازی کی طرف لے جاتا اور حیوانیت کو بڑھاوا دیتا ہے، تو جتنی جلدی اس کا نشان مٹ جائے، اتنا ہی بہتر ہے''۔ 1965 میں ورنداون لال ورما نے بھی اسے محسوس کرتے ہوئے لکھا تھا ''فلم کا اثر ناظرین و سامعین پر بہت جلد اور گہرا پڑتا ہے، گندی فلموں کی بہتات ہے، جو معاشرے کو زوال کی جانب لے جا رہی ہیں، اپنے تہذیب کی حفاظت اور ملک کے اونچے آدرشوں کو بچانے اور اوپر لانے کی سخت ضرورت ہے''۔ لیکن اس کے باوجود اتنے متاثر کن اثرات کو زائل کرنے کے لیے کوئی خاص اقدام یا سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی، جس کی اب سخت ضرورت ہے۔ 1896 میں یورپ میں لومیر برادرز کی طرف سے کیے گئے سنیما کے پہلے مظاہرے کے کچھ مہینوں بعد ہی سنیما ہندوستان میں بھی دیکھا جا سکا تھا۔ 1897 میں یہاں عملی طور پر فلم بنانے کی شروعات بھی ہو گئی تھی۔ لیکن اس سے قبل بھی یہ ڈرامہ اور تھیٹر کی شکل میں نہ صرف ترقی پذیر تھا بلکہ اس فن کا وہ عہد عروج تھا۔ شیکسپیئر کے ڈراموں نے ماورائی طاقتوں، روح، شیطان اور نفرت و محبت کے ساتھ انسانی نفسیات کی نہایت اچھی عکاسی سے خود کو دائمی قرار دلایا، تو آغا حشر کاشمیری اور دیگر لکھنے والوں کی سر پرستی میں اس فن نے ترقی کے منازل طے کیے۔ 1913 میں دادا صاحب پھالکے نے اپنی فیچر فلم 'راجہ ہریش چندر' مکمل کی اور آج تقریباً 800 فلمیں ہر سال بنا کر ہندوستان دنیا بھر میں سب سے اوپر ہے۔

> 1950-60 کی دہائی میں سماجی مسائل پر مبنی فلموں نے عوام کا دل جیتا تھا۔ دو بیگھ زمین، اپکار، مدر انڈیا، ہندوستانی نظام میں ساہوکاری اور اس کے استحصال کی عکاسی تھی تو 1960-70 کی تاریخ پر مبنی فلم مغل اعظم، انارکلی، تاج محل، پالکی اور دیگر فلموں نے ایک اچھا ذوق اور سماج کو صحت مند پیغام دیا تھا۔

اگر فلموں کو ادوار میں تقسیم کریں تو سماجی کہانیوں پر مبنی فلموں کے بعد رومانی، تاریخی، تفریحی اور تشدد پر مبنی فلموں تک آتے آتے سنیما نے نفرت، بدلہ، طاقت کے زور پر کچھ بھی کر لینے، اسمگلنگ، مافیا کے کرتوت اور

گزشتہ دو دہائی سے عریانیت، فحاشی، ذو معنی الفاظ، جملوں، گالی اور بے ہودہ مکالموں تک کا سفر طے کر کے ہندوستانی سماج پر اور خصوصی طور پر نئی تین نسلوں کو نہ صرف متاثر کیا ہے بلکہ پاکیزہ و صاف ستھرے ماحول کو پراگندہ اور اس کے تانے بانے کے شیرازہ کو بکھیر دیا ہے۔ 1950-60 کی دہائی میں سماجی مسائل پر مبنی فلموں نے عوام کا دل جیتا تھا۔ دو بیگھ زمین، اپکار، مدر انڈیا، ہندوستانی نظام میں ساہوکاری اور اس کے استحصال کی عکاسی تھی تو 1960-70 کی تاریخ پر مبنی فلم مغل اعظم، انارکلی، تاج محل، پالکی اور دیگر فلموں نے ایک اچھا ذوق اور سماج کو صحت مند پیغام دیا تھا۔ اس کے بعد کی فلموں میں رومانس، تفریح ادر عشق و محبت کی داستانیں تھیں لیکن 1980-90 میں فلموں نے حیرت انگیز کروٹ لی اور عظیم فنکار دلیپ کمار کے بعد کامیاب ہیرو راجندر کمار، راجیش کھنہ اور کئی دیگر کے بعد 'اینگری ینگ مین' نے نوجوان ذہن کو نہ صرف راغب کیا بلکہ بدلہ، ظلم کے خلاف مقابلے امیتابھ بچن کو سپر اسٹار تو بنا ہی دیا ساتھ ہی ساتھ نوجوانوں کی ایسی ذہن سازی کی جس نے دو اور تین نوجوان نسل کو واقعی 'اینگری ینگ مین' بنا دیا۔ ان فلموں کے بعد دھارمک فلموں نے سماج کے کچھ طبقوں کو مذہبی پس منظر میں متاثر کیا۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ دھارمک فلموں کی روایتوں اور 'اینگری ینگ مین' کی شبیہ سے ہندوستان کی دہشت گرد اور کٹر ہندوتو حامی تنظیموں اور پارٹیوں کو نئی نوجوان اینگری ینگ مین کی نسل مل گئی۔ دوسری جانب فلموں میں عریانیت، فحاشی، عصمت دری، اغوا، تاوان، قتل اور ظلم و ستم کے نت نئے طریقوں نے جاہل اور کم پڑھے لکھے نوجوانوں کے ساتھ ساتھ دو نوجوان نسل کو ذہنی طور پر تباہ کر دیا۔ ایک طبقے نے عصمت دری، قتل، تاوان اور اغوا کو اپنا طریقہ کار اور مقصد زندگی بنایا تو دوسری نسل نے جلد

دولت مند بننے کے لیے قتل، ڈکیتی، چوری، چھین کر بھاگنے اور اب دن دہاڑے قتل اور لوٹ کا طریقہ کار اختیار کیا۔ گزشتہ دو دہائی سے فلموں میں فیشن ڈیزائننگ اور اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کے پیغام نے لڑکیوں اور لڑکوں کو آوارگی، عیاشی، عیش کوشی، عصمت فروخت کرنے اور عصمت لوٹنے کی جانب راغب کیا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ آج دہلی جیسے شہر میں اوسطاً تین لڑکیوں کی روزانہ عصمت فروخت اور اس سے زائد کی لوٹی جا رہی ہے، ان فلموں کے ذریعے شادی شدہ زندگی کے باوجود غیروں سے جنسی تعلق، اوباش، 'لوان ریلیشن شپ' اور 'انٹر کاسٹ' شادی کے رجحان کو فروغ دیا ہے بلکہ اس قسم کی شادیوں کے ہونے کے پاداش میں 'آنر کلنگ' جیسے لفظ کو فروغ حاصل ہوا ہے، تو عزت و ناموس کی خاطر قتل کیے جانے والے لڑکے لڑکیوں کی تعداد بھی سو میں پانچ فیصد ہے۔

ایسے میں بھی ہر طرح کی پریشانیوں، تنقید، شور، ہنگامہ اور احتجاج کے باوجود ہندوستان میں سینما کا اس مقام تک پہنچ پانا یقیناً اس کی طاقت کا احساس کرنے کے لیے کافی ہے۔ سینما کی طاقت اور اس کی اثر انگیزی کی سب سے بڑی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ ہم ان چیزوں اور واقعات کو ویسے ہی دیکھتے ہیں، جیسا وہ ہے یا ہوا ہو۔ بلکہ ذہنی طور پر ہم بھی واقعات کے اندر ہوتے ہیں۔ اصل میں کسی بھی فلم کو دیکھنے کے دوران شائقین کی آنکھ اور کان کے ساتھ دماغ کی بھی شراکت ضروری ہوتی ہے۔ سینما کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ جتنی سامنے نظر آتی ہے اتنی ہی ہمارے دماغ میں بھی بنتی ہے۔ ہم کسی اداکار کو پہاڑ پر چڑھتے آنکھوں سے دیکھتے ہیں، کانوں سے اس کے پیروں کی آواز، کیلیں گاڑنے کی آواز، ارد گرد کے ماحول، جنگل جھرنے وغیرہ کو بھی نہ صرف دیکھتے بلکہ محسوس کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سب کچھ اصلی ہے، لیکن یہاں صرف ہمیں اس کا احساس کرایا جاتا ہے، سات دن کے حقیقی وقت میں پوری ہونے والی چڑھائی کو صرف سات شوٹ میں سات منٹ سے بھی کم وقت میں دکھا دیا جاتا ہے، باقی کی کمی ہمارا دماغ پوری کرتا ہے۔ اصل میں اداکار کو پہاڑی چڑھتے ہم محض دیکھتے ہی نہیں، اس کے ساتھ ہوتے ہیں، وہ بھی ذہنی طور پر، اور ظاہر ہے جب ہم ذہنی طور پر کہیں ہوتے ہیں تو ذہن زیادہ چاہے کم، مثبت یا منفی اثر ضرور قبول کرتا ہے۔ تبھی 'ولے بنویل' نے مانا تھا کہ سینما ہمارے دماغ پر افیون جیسا اثر کرتا ہے۔ ذہنی طور پر اپنے آپ کو مناظر کے اندر محسوس کرانے کی صلاحیت ہی ہے جو سینما کو اس قدر جاذب نظر بناتی ہے کہ کروڑوں لوگ بغیر کسی فلمی زبان اور ٹیکنالوجی کی سمجھ کے ٹکٹ خریدتے ہیں، فلم دیکھتے ہیں اور اپنی ضرورت کے مطابق اسے سمجھتے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ادب یا فن کو یہ سہولت دستیاب نہیں ہے ادب یا فن کا استعمال ہم تب تک نہیں کر سکتے جب تک کہ ہماری اس کے اصول وقواعد سے واقفیت اور فنی نزاکتوں سے آشنائی نہ ہو، لیکن سینما نے اپنے لیے ایسی فطری زبان کا انتخاب کیا ہے جو عام انسان کے صرف مجازی صلاحیت کے اصول پر مبنی ہوتی ہے۔ اسی لیے ہندوستانی ثقافت نے جب سینما کو معصوم بچوں اور نوعمروں کے لیے ضرورت تسلیم کیا تھا تو اس کی وجہ صرف یہ نہیں تھی کہ اس وقت نام نہاد 'اچھی فلموں' کی بہتات تھی، اس کی صحیح وجہ اس وقت کے ہندوستانی سماج کی یہ واقعی ضرورت اور واجبی سمجھ تھی کہ سینما کہیں نہ کہیں ہمارے سوچنے سمجھنے اور تصور کرنے کی صلاحیت کو متاثر کرتا ہے۔ انھیں احساس تھا کہ 'پیراشوٹ' کی پرواز بچوں کے دماغ کو اس قدر تیز بنا سکتی ہے کہ وہ اندھے کنویں میں بھی چھلانگ لگا سکتے ہیں جبکہ ان کا آزاد دماغ 'پیراشوٹ' سے بھی اونچی اڑان بھر سکتا ہے۔ لیکن اسے المیہ ہی کہا جائے گا کہ ہمارے یہاں دل میں کوئی تصور جنم لیتا ہے یا کچھ کرنے کی امید جاگتی ہے تو ہم اس کو شرمندہ تعبیر کرنے کی کوشش کے علاوہ اسے دلیلوں پر تولنے لگ جاتے ہیں، جبکہ سامنے شرمندہ تعبیر ہوتے 'سچ' کو دیکھ کر ہمیں دلیل کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

ہم میں سے کتنے لوگ ہوں گے، جنھوں نے سینما دیکھنے کے لیے کبھی نہ کبھی ڈانٹ نہ سنی ہو یا مار نہ کھائی ہو، تمام تر پابندیوں کے باوجود یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ سینما عام انسانوں میں تفریح کا سب سے محبوب اور موثر ذریعہ ہے۔ ہندوستان میں ہی نہیں، دنیا بھر میں پاکستان، ایران، سری لنکا سے لے کر انگلینڈ، امریکہ، جاپان تک حتیٰ کہ مورکو اور طالبانیوں کو اپنے انقلابی خیالات وافکار کی تشہیر کے لیے سینما کی راہ اپنانی پڑی اور تو اور معروف زمانہ 'ڈیوڈ دھون' کو اپنی حرکتوں سے شائقین کو خوش کر کے پیسے اینٹھنے کے لیے بھی سینما ہی بھائی دیا۔ صورتحال آج یہاں تک پہنچ چکی ہے کی سینما بازاروں اور تھیٹروں سے ہوتے ہوئے ہمارے گھر کے اندر داخل ہو چکا ہے۔ ہم اسے دیکھیں یا نہیں یہ بھی اب ہماری خواہش پر منحصر نہیں ہے۔ سینکڑوں چینلوں نے اس کو لے کر جہاں دھوم مچا رکھی ہے وہیں نیوز چینلوں نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ محض ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے یا ریت میں سر چھپا کر طوفان کو روکا جانا ممکن ہے۔ آج ٹیلی ویژن کی توسیع نے پورے ہندوستانیوں کے ذہن و دماغ کو مفلوج اور تذبذب کا شکار بنا دیا ہے۔ سینما کی ثقافت اب صرف کپڑے کی بناوٹ اور بالوں کی سجاوٹ کو ہی متاثر نہیں کر رہی ہے بلکہ اب اس نے سماجی اقدار کو بھی درہم برہم کر دیا ہے۔ سماجی مسائل کو فلم نے اپنے مسلسل اثرات سے اتنی کم اہمیت کی شے بنا دیا ہے کہ تشدد، جرائم، زنا، عصمت دری، خودکشی ان میں سے اب کوئی حادثہ ہمارے اندر اس جرم کا احساس نہیں جگا پاتا گویا ہماری حسیت ہی فنا ہو گئی ہے۔

فلم شوٹنگ کا ایک منظر

سینما کے اس اثر کو سمجھتے ہوئے مغربی ممالک نے 50 کی دہائی میں ہی فلم مطالعہ پر سنجیدگی سے غور و خوض کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس وقت سے ہی ان ممالک میں ریسرچ اسکالر اور ماہرین نفسیات کے لیے یہ تشویش کا موضوع تھا کہ بچے جتنا وقت اسکول میں گزارتے ہیں اس سے کہیں زیادہ ٹیلی ویژن کے سامنے، اس لیے اس کا کوئی حل تلاش کیا جانا چاہیے اور انھوں نے اپنے اسی مطالعے کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ دو سال کی عمر سے ہی جب بچے مادری زبان سیکھنے کی ابتدا کرتے ہیں ٹیلی ویژن اور فلم جیسے مناظر سے پیغام قبول کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ دو تین سال کے بچے کا کارٹون نیٹ ورک کے آگے خاموش پڑے رہنا کوئی اتفاق نہیں، بلکہ ہمیں یہ قبول کرنا چاہیے کہ بچہ باقاعدہ اسے دیکھ اور محسوس کر رہا ہوتا ہے۔ سینما آج ہماری طرز زندگی میں رچ بس گیا ہے۔ کھانا کھانا، آفس جانا، اسکول جانا اور اسی طرح دوسری

ضروریات کی طرح ہم نے اس کو بھی اپنی زندگیوں میں شامل کرلیا ہے۔ اس کے باوجود فلم بینی کا انتخاب ہمارے نزدیک کوئی موضوع ہی نہیں رہا، یہاں تک کہ ذہن وفکر کو پراگندہ کر دینے والی فلمیں بھی ہم اپنے بچوں کے ساتھ دیکھنے میں عار محسوس نہیں کرتے اسی کا نتیجہ ہے کہ فلم دیکھتے ہوئے بچے کسی گالی کا مطلب ہم سے پوچھتے ہیں تو ہم مسکرا کر جواب دیتے ہوئے بھی نہیں شرماتے، نام نہاد جدیدیت کی طرف گامزن ہندوستانی معاشرے کی یہ بدقسمتی ہی ہے کہ یہ مسلسل سمٹتا جارہا ہے، بے شک اصلی خاندان اور معاشرے سے ہوتی دوری کو سماج سے پاٹنے کی اس مجازی دنیا کے پاس مجبوری ہوتی ہے، اور سماج کو اس کے لیے کچھ نہ کچھ چاہیے اور اس چاہیے کے لیے متبادل اسے سنیما سے ملا، یہ 'مجازی دنیا' سماج کی خاصیت تھی، یہ اس کے مطالبے پر دستیاب تھا۔ جب بھی تنہائی یا اکیلا پن محسوس ہو، چلو سنیما، ایک خوشگوار بھرے پُرے ماحول سے مطمئن لوٹ کر پھر لگ گئے اپنے روز کی جدوجہد میں شاید اسی لیے سنیما دیکھنا جو پہلے سال چھ مہینے کا تہوار ہوتا تھا، اب ہفتہ بلکہ روزانہ کا شغل بن گئے۔

یہ بھی غور طلب ہے کہ گاؤں، قصبہ، شہر ومحلہ جات میں جیسے جیسے خاندانی عناصر چھوٹے ہوتے گئے اس شغل کی تبدیلی بڑھتی گئی۔ جس نے سب سے زیادہ بچوں کو متاثر کیا کیونکہ پورے خاندان میں سب سے اکیلا اور تنہا وہی تھا۔ تعجب کی بات نہیں کہ خاندانوں کے اس رویہ سے فلم کے انتخاب کا فیصلہ دھیرے دھیرے بچوں کے ہاتھوں میں سمٹتا چلا گیا۔ انھیں مطلب سنیما سے نہیں، بس سنیما گھر کی رونق اور سنیما کے پردے پر رسائی 'مجازی دنیا' سے تھا اور حقیقت میں سرپرستوں کے لیے انھیں بھرے پرے سماج سے کاٹنے کا یہ ایک پیش خیمہ تھا اور یہ پیش خیمہ کس طرح ان کی سمجھ کو اپنی دنیا کے تئیں غیر ذمے دارانہ اور مطلب پرستانہ بنا دیا، یہ ہم اپنے بچوں خاص کر نوجوان نسل کو 'آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے' اور 'ہماری زندگی ہم جیسے چاہیں گزاریں' جیسے الفاظ اپنے والدین اور ذمے داروں سے بے باکانہ اور بدتمیزانہ انداز میں کہنے اور اس پر فخر واصرار کرنے کے رویہ سے لگا سکتے ہیں۔ شریف سے شریف گھرانے کی لڑکیوں میں عریانیت، ننگے پن، ڈسکو کلچر، اور مغربی لباس جبکہ لڑکوں میں شراب شباب کا بڑھتا جنون، گرل فرینڈ کو خوش کرنے کی خاطر بائک چوری، کار چوری، لوٹ، ڈکیتی، فراڈ، دھوکہ دھڑی اور منشیات کی جانب عملی رغبت اور اس سے پیدا ہونے والی تباہی اسی کا نتیجہ ہیں۔

فلم ایڈیٹنگ اسٹیوڈیو

اس لیے آج اس حالت میں جب کہ سنیما کے اثرات کو روکا نہیں جا سکتا، بہتر یہی ہے کہ لوگوں کو سنیما دیکھنے سے روکنے کے بجائے اسے سنیما دیکھنا سکھائیں۔ سکھانے کا مطلب ہے باقاعدہ فلم مطالعہ، اس باقاعدہ مطالعے کا مطلب دماغ کو ایسے ذرائع سے لیس کیا جانا ہے کہ وہ علم کی مخفی دنیا کو سمجھ سکیں کیونکہ کسی بھی موضوع کو ایک شخص اپنی سمجھ سے ایک حد تک ہی سمجھ سکتا ہے۔ سنیما تو فن کا سب سے پیچیدہ ذریعہ ہے، جس میں ادب بھی ہے،

> اس لیے آج اس حالت میں جب کہ سنیما کے اثرات کو روکا نہیں جا سکتا، بہتر یہی ہے کہ لوگوں کو سنیما دیکھنے سے روکنے کے بجائے اسے سنیما دیکھنا سکھائیں۔ سکھانے کا مطلب ہے باقاعدہ فلم مطالعہ، اس باقاعدہ مطالعے کا مطلب دماغ کو ایسے ذرائع سے لیس کیا جانا ہے کہ وہ علم کی مخفی دنیا کو سمجھ سکیں کیونکہ کسی بھی موضوع کو ایک شخص اپنی سمجھ سے ایک حد تک ہی سمجھ سکتا ہے۔ سنیما تو فن کا سب سے پیچیدہ ذریعہ ہے، جس میں ادب بھی ہے، فن بھی، سائنس بھی اور ٹیکنالوجی بھی۔ سنیما پر ہر نقطہ نظر سے غوروخوض اور مطالعہ کی ضرورت ہے۔

فن بھی، سائنس بھی اور ٹیکنالوجی بھی۔ سنیما پر ہر نقطہ نظر سے غوروخوض اور مطالعہ کی ضرورت ہے۔ ایک باضابطہ فن کے طور پر، ایک مقبول عوامی تفریح کے طور پر، معلومات اور سماجی اقدار کو بدلنے والے ذرائع کے طور پر، ثقافتی ماحول کی تعمیر کرنے والا ایک ایجنسی کے طور پر، جس میں تعمیری اور مثبت طرز فکر کا خیال رکھا گیا ہو۔ یقیناً اگر اسے اس طور سے برتا گیا اور باقاعدہ مطالعے کے ذریعے کوئی لائحہ عمل بنانے کی کوشش کی گئی تو یہ صرف فلم کی ہی نہیں پورے ثقافتی ماحول کے لیے کارآمد اور مدومعاون ثابت ہوگا۔

یہاں پر یہ بات بھی عرض کر دینے کی ہے کہ 1980 میں 'نیشنل فلم پالیسی' کمیٹی کی طرف سے فلم مطالعے کو قومی تعلیمی نظام میں اور کالج و یونیورسٹی کی سطح پر رسمی تعلیم میں شامل کرنے کی سفارش کی گئی تھی۔ ہندوستان کی حکومت نے سفارش قبول کرتے ہوئے یو جی سی اور این سی ای آر ٹی کو فلم مطالعے کی سمت میں ضروری اقدام کرنے کی ہدایت بھی جاری کی تھی۔ لیکن آج بھی دوردرشن کے پروگراموں میں 'انڈر اسٹینڈنگ' کی ایک سیریز نشر کرنے اور یونیورسٹیوں میں تحقیق اور تدوین کی سطح پر اسے محض ایک موضوع کے طور پر قبول کر لینے کے، فلم کا مطالعہ جوں کا توں برقرار ہے۔ حالانکہ اسے چھوڑ کر آج ایک اور ثقافت کو حاشیہ پر ڈال دینے کی نہیں بلکہ نفرت کرنے کا سیاسی دباؤ، ثقافت کو یونیفارم بنانے کا دباؤ اور تیسری طرف عالمی ثقافت کو فروغ دینے کی کوشش سے خبردار ہونے کا ہے۔ اگر ابھی بھی سنیما پر ہم نے اپنا کنٹرول نہیں قائم کیا تو سر سے پانی کے گزر جانے کے بعد پھر آگے لاکھ کوشش کر لیں نتیجہ ہاتھ نہیں آ سکتا۔ اس کے لیے ایک بار پھر سے نیشنل فلم پالیسی 1980 کو یاد کرنے کی بھی ضرورت ہے تاکہ سنیما کے تئیں بچپن سے ہی ایک صحیح سمجھ پروان چڑھ سکے۔ یہ ایک دن کی کوششوں سے نہیں ہوسکتا، مسلسل اور باقاعدہ مطالعے اور اس سلسلے میں عوامی بیداری سے ہی صحیح اور غلط سنیما کی سمجھ کو تیار کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ اب کسی بھی صورت میں لوگوں کو سنیما دیکھنے پر روک یا پابندی عائد نہیں کی جاسکتی ہے۔ ہاں! اس بات کی کوشش کی جاسکتی ہے کہ ایک صحت مند نقادانہ ذہنیت اور تجزیاتی فکر کے ساتھ سنیما کو سنیما کی طرح دیکھا اور قبول کیا جائے۔ اس کے لیے عام لوگوں کے علاوہ حکومت اور پڑھے لکھے یعنی طبقہ اشراف کو بھی آگے آنا ہوگا کہ......ع

''ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی''

■

Md.Alamullah,MA in Mass Communication
AJK MCRC, Jamia Millia Islamia, New Delhi- 110025

بدلتے وقت کی ضرورتیں اور اچھا کیریئر

اسما مسعود

آج کے دور میں کیریئر (Career) بنانے کے کئی راستے ہیں لیکن اپنا من پسند کیریئر بنانے کی راہ ڈھونڈنا اتنا آسان نہیں کیونکہ موجودہ زمانے میں کتابی کیڑا بن کر یا ڈگریوں کا ڈھیر لگا کر کامیابی کی امید نہیں کی جاسکتی۔ اپنے اندر جھانک کر دیکھیے اپنی قابلیت کو پہچانیے کہ وہ کون سا میدان ہے جس میں آپ اپنی لیاقت کو فروغ دے کر بازی مار سکتے ہیں آج Employers کی ضرورتیں بدلی ہیں اس لیے ضروری ہے کہ بدلتے وقت کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلا جائے۔ یہ دور مقابلے کا دور ہے اس لیے کسی بھی میدان میں نوکری ہمارے پاس چل کر نہیں آتی بلکہ ہمیں خود کو اس کے لیے تیار کرنا پڑتا ہے۔ اگر آپ کو اچھا کیریئر بنانا ہے تو خود کو بہتر ثابت کرنا ہوگا۔ خاص طور پر اپنی لیاقت کو اَپ ڈیٹ کرنا آج کے دور کی اہم ضرورت ہے۔ آیئے ہم یہاں کیریئر کے مختلف میدانوں میں ضروری لیاقتوں پر بات کرتے ہیں۔

(1) میڈیکل: انسانیت، لگن، سپردگی اور ذہنی پختگی کی ضرورت:

پری میڈیکل ٹسٹ میں اچھی رینکنگ کے بل پر ایم بی بی ایس اور بی ڈی ایس کی پڑھائی کرنے والے نوجوان ڈاکٹر بن کر ایک معزز کیریئر بنانے کا خواب دیکھتے ہیں۔ لیکن ہمیں خواب کی تعبیر پانے کے لیے کڑی محنت کے ساتھ ہمیشہ اپنے ہدف پر نظر رکھنی ضروری ہے۔ اے آئی پی ایم ٹی کا پری اگزام پاس کرنے کے لیے فزکس کیمسٹری اور بایولوجی (زولوجی اور بوٹنی) کے Basics پر مضبوط پکڑ۔ این سی ای آر ٹی کی کتابوں کا گہرا مطالعہ اور پچھلے دس سالوں کے پیپرس کو حل کرکے آپ اس پروفیشن میں آ تو جائیں گے لیکن اسی میدان میں کامیابی کے لیے آپ میں کچھ لیاقت بھی ہونا ضروری ہے۔

> اگر آپ مینجمنٹ کے میدان میں اتر رہے ہیں تو آپ میں ٹیم ورک کی صلاحیت ہونا بہت ضروری ہے۔ ایک کمپنی تبھی چلتی ہے جب اس کو چلانے والے سب کو ساتھ لے کر چلنا جانتے ہوں۔ اکیلے چلنے اور خود کو بادشاہ سمجھنے کی غلط فہمی آپ کے ساتھ ساتھ آپ کی کمپنی کو بھی لے ڈوبے گی۔ ہر فرد میں کوئی نہ کوئی صلاحیت ہوتی ہے۔ بے کار کوئی نہیں ہوتا۔ اس کے لیے فرد کی صلاحیت کو پہچان کر اس سے بہتر کام کروانے کا ہنر اگر آپ میں ہے تو اس میدان میں آپ کامیاب ہیں ورنہ نہیں۔

ڈاکٹر کو ہمارے معاشرے میں خدا کا دوسرا روپ مانا جاتا ہے۔ بے شک میڈیکل سائنس نے آج بہت ترقی کرلی ہے اور ہم لاعلاج بیماریوں کے علاج کرنے میں بھی خود کو قابل پاتے ہیں لیکن ایک ڈاکٹر کو خدا کے بعد جو عزت دی جاتی ہے وہ درد اور تکلیفوں میں ڈوبے ہوئے انسان کے دکھ کو دور کرنے کے لیے اس کی لگن اور سپردگی کی وجہ سے دی جاتی ہے اس لیے ایک کامیاب ڈاکٹر کے لیے انسانیت کے تئیں اپنی ذمے داری کا احساس ہونا سب سے زیادہ ضروری ہے۔

میڈیکل میں ایک معرف میدان بایوٹیکنولوجی کا ہے جو ایک روشن مستقبل کے ساتھ ساتھ عوام کے مفاد کے لیے بہت سی نئی تحقیقات کے لیے بھی نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے چونکہ اس میدان میں کام کرنے والوں کا رجحان میڈیکل ٹیسٹ اور علاج کے لیے نئی تکنیک کی طرف ہے جس میں مونوکلونل اینٹی باڈیز سے لے کر انسولین سائٹوکینس وغیرہ شامل ہیں۔ انسان اور جانوروں کی صحت کے لیے نئی دوائیں ایجاد کی گئی ہیں اس کے ساتھ ایگری کلچر بایوٹیکنولوجی میں ہوئی ترقی نے نہ صرف مختلف طرح کی فصلوں کی پیداوار کو بڑھایا ہے بلکہ صحت مند اور اچھی فصلوں کی ترقی میں بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ فصلوں کی صحت کے لیے مختلف کیڑے مار دواؤں کا ایجاد ہونا غرض فوڈ اور بیوریج انڈسٹری میں ایزائم سے لے کر گھریلو چیزوں میں استعمال ہونے والی پولیمر تک سب کچھ بایوٹیکنولوجی کی ہی دین ہے۔ آج اس میدان کا

دائرہ لگاتار بڑھ رہا ہے اور بایولوجی کے بہت سے طالب علم اس میدان کی طرف رخ کر رہے ہیں لیکن یہ میدان نئی تکنیک کی تحقیق سے جڑا ہونے کی وجہ سے یہاں وہی نوجوان کامیاب ہو سکتے ہیں جو سائنس کی تحقیق میں دلچسپی رکھتے ہوں۔ نئی تکنیک کی ایجاد ایک صبر آزما عمل ہے اور یہاں وہی کامیاب ہوتا ہے جو لگاتار محنت اور تحقیق کا مادہ رکھے۔ جسے سائنس سے فطری لگاؤ ہو اور جو نئی تکنیک کی ایجاد کی قابلیت رکھتا ہو۔

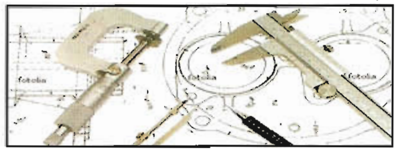

(2) انجینئرنگ— قابلیت ضروری:

کڑے داخلی امتحان کے بعد جب نوجوان انجینئرنگ میں ایڈمیشن پاتا ہے تو اس کی آنکھوں میں ایک سنہرے مستقبل کا خواب ہوتا ہے اور بے شک پچھلے پندرہ سالوں میں انجینئرنگ کا میدان کیریئر بنانے والوں کی ہاٹ لسٹ میں ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہاں Selection Criteria کافی اونچا ہونے کی وجہ سے یہ راہ کانٹوں سے بھری ہے۔

ایک اچھا اور کامیاب انجینئر بننے کے لیے ضروری ہے کہ فزکس، کیمسٹری اور میتھس پر ہماری بھرپور پکڑ ہو خصوصاً میتھس اور کیمسٹری میں مہارت رکھنا انجینئرنگ کے میدان میں قدم رکھنے والے نوجوانوں کے لیے بہت ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ نوجوانوں میں ہر تکنیکی گتھی کو سلجھانے کی قابلیت ہو کیونکہ پوری مہارت کے ساتھ تکنیکی پیچیدگیوں کو اب حل کرنے کی صلاحیت انجینئرنگ میں کامیابی کی دلیل ہے۔ آج کمپیوٹر کی معلومات ہر میدان میں کیریئر بنانے کے لیے بنیادی قابلیت میں شمار ہے۔ یہاں بھی یہ ضروری ہے لیکن صرف یہاں کمپیوٹر کی معلومات ہی کافی نہیں بلکہ آپ جس میدان کا انتخاب کر رہے ہیں اس میں پوری مہارت حاصل کرنا آج کے دور کی ضرورت ہے۔

(3) مینجمنٹ— ٹیم ورک اور کارپوریٹ سیکٹر کی سمجھ:

مینجمنٹ بھی کیریئر کا اچھا میدان ہے جو آج کے نوجوانوں کو اپنی جانب کھینچ رہا ہے۔ لیکن پھر بھی کیا وجہ ہے کہ ہم ایم بی اے کیے ہوئے بے روزگار نوجوانوں کی خاصی تعداد دیکھتے ہیں۔

اگر آپ مینجمنٹ کے میدان میں اتر رہے ہیں تو آپ میں ٹیم ورک کی صلاحیت ہونا بہت ضروری ہے۔ ایک کمپنی تبھی چلتی ہے جب اس کو چلانے والے سب کو ساتھ لے کر چلنا جانتے ہوں۔ اکیلے چلنے اور خود کو بادشاہ سمجھنے کی غلط فہمی آپ کے ساتھ ساتھ آپ کی کمپنی کو بھی لے ڈوبے گی۔ ہر فرد میں کوئی نہ کوئی صلاحیت ہوتی ہے۔ بے کار کوئی نہیں ہوتا۔ اس کے لیے فرد کی صلاحیت کو پہچان کر اس سے بہتر کام کروانے کا ہنر اگر آپ میں ہے تو اس میدان میں آپ کامیاب ہیں ورنہ نہیں۔

مختصر یہ کہ آج مقابلے کے اس دور میں اگر ایک اچھا کیریئر بنانا ہے تو ہر پل سیکھنے کے لیے خود کو تیار رکھنا اور اپنی صلاحیت کو بڑھانا آپ کے لیے بہت ضروری ہے۔ اپنا مقصد طے کیجیے اس کے مطابق اپنی صلاحیتوں کو نکھاریے۔ کالج لیول پر چلنے والے Internship Courses آپ کی قابلیتوں کو نکھارنے میں مدد گار ہوسکتے ہیں کیونکہ عملی میدان میں آپ کے سیکھنے کا کوئی انتظار نہیں کرے گا۔ یہاں تو اگر آپ میں کام کرنے کی خاص قابلیت ہے، ہنر ہے، اور مہارت ہے تو آپ اپنے کیریئر مارکیٹ میں خود کو منوا سکتے ہیں۔

کارپوریٹ سیکٹر کی سمجھ اور اس میدان میں ہو رہی تبدیلیوں کی معلومات ایک باسند ایم بی اے کے لیے بہت ضروری ہے۔ مارکیٹ میں کون سے نئے برانڈس آ رہے ہیں وہ کیسے ہیں۔ سرکار کارپوریٹ سیکٹر کے لیے کون سی نئی پالیسی اور اسکیم بنا رہی ہے۔ آنے والے وقت میں بازار میں کون سے نئے برانڈس آ رہے ہیں۔ بازار میں آنے والے وقت میں کون سی نئی تبدیلیاں ہونے کے امکانات ہیں یہ اور اس طرح کی معلومات سے آپ خود کو اپ ڈیٹ رکھ کر اس میدان میں کامیابی سے آگے بڑھ سکتے ہیں۔

اس میدان میں کام کرنے والوں کے لیے انگلش اسپیکنگ بہت ضروری ہے۔ یوں تو آج یہ ہر فیلڈ کی ضرورت ہے کیونکہ انگلش ایک گلوبل اثر رکھتی ہے لیکن کارپوریٹ سیکٹر میں انگلش بولنے والوں کی زیادہ ضرورت اس وجہ سے ہے کہ ان کا واسطہ ہر طرح کے لوگوں سے جتنا زیادہ پڑتا ہے اتنا کسی اور فیلڈ میں نہیں پڑتا اور انگلش ہر ملک ہر زبان اور ہر طرح کے لوگوں تک اپنی بات پہنچانے کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔

(4) بینکنگ سیکٹر— کچھ خاص اسکلس کی ضرورت:

بینکنگ سیکٹر میں آج روزگار کے زبردست مواقع ہیں۔ اس لیے نوجوان تیزی سے اس طرف بڑھ رہے ہیں۔ اب تک بینک میں نوکری کے لیے ہر بینک الگ الگ ایگزام لیتا تھا لیکن اب انسٹی ٹیوٹ آف بینکنگ پرسنل سلیکشن کے ذریعے زیادہ تر بینکوں میں نوکریوں کے لیے ایک ہی ایگزام ہے۔ آئی بی پی سی کے ڈائریکٹر کا کہنا ہے کہ یہ ایگزام سال میں دو بار لیں گے اور اس ایگزام میں شامل ہونے والے ہر امیدوار کو ایک اسکور دیا جائے گا جو سال بھر تک Valid رہے گا۔

یہ فیلڈ پوری طرح کیلکولیشن پر ٹکی ہے اگر آپ کی Calculation Power اچھی ہے تو آپ کے لیے کوئی مشکل نہیں۔ بینک میں کام روٹیشن سے ہوتا ہے اور کچھ وقت بعد ایک سیٹ کا کام دوسری سیٹ والے کو ٹرانسفر کر دیا جاتا ہے۔ یہاں آنے والے نوجوانوں میں جلد سیکھنے کی صلاحیت بہت ضروری ہے جو جلد سیکھنے کے لیے خود کو تیار رکھے گا وہ آگے بڑھے گا۔ بینک میں پبلک ڈیلنگ کا کام ہے اس لیے یہاں کام کرنے والوں کے لیے ٹھنڈے دماغ سے کام کرنے کی صلاحیت ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ اکثر بینک میں کام کرنے والوں کا واسطہ Short tempered لوگوں سے ہوتا ہے ایسے میں ٹھنڈے دماغ سے کام کرنے والے نوجوان معاملے کو سلجھانے میں کامیاب رہتے ہیں۔

بینکنگ سیکٹر میں کیریئر بنانے کی تیاری کرنے والوں کے لیے دوسرے میدانوں کی طرح کمپیوٹر کی معلومات اور اپ ڈیٹڈ نالج ضروری ہے۔

(5) ڈفینس— فزیکلی اور مینٹلی فٹنیس کے ساتھ ڈسپلین ضروری:

ڈفینس میں کیریئر بنانا ایک فخر کا احساس پیدا کرتا

ہے کیونکہ یہاں اپنے وطن کی خدمت اور حفاظت کا مقصد بھی پوشیدہ ہے لیکن آپ اس مقصد کو تبھی حاصل کر سکتے ہیں جب آپ جسمانی اور دماغی طور پر پوری طرح فٹ ہوں اور آپ میں ڈسپلن کوٹ کوٹ کر بھرا ہو کیونکہ ڈفینس کی فیلڈ کا پہلا قدم ہی ڈسپلن کا ہے۔

Defence کے میدان میں بات چاہے ملٹری فورس کی ہو یا پیراملٹری فورس یا پولس سروس کی ہر جگہ Entry کرنے کے لیے آپ میں غیر معمولی Staming اور فزیکلی فٹ نیس کی بہت ضرورت ہے۔ ہمارا معاشرہ جو بے ہنگم زندگی جی رہا ہے۔ کھانے پینے اور روزمرہ زندگی کے جس انداز کو اپنا رہا ہے اس میں فزیکلی فٹ نوجوان اس فیلڈ کی کسوٹی پر کم ہی اتر رہے ہیں اس لیے اگر آپ اس میدان میں آنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو اپنے قوت عمل کو بڑھایئے اور جسمانی اور ذہنی طور پر خود کو مضبوط کیجیے۔ جنرل اویئرنیس، ریزننگ، نیومیریکل ایبلٹی اور بیسک انٹیلی جینس کے ساتھ زبان سے متعلق امتحان پاس کرنے کے بعد Recruitment drive کی کسوٹی پر پورا اترنے کے لیے نوجوانوں کو فزیکل ٹیسٹ کی اچھی تیاری کرنی چاہیے۔ خاص طور پر ریس، ہائی جمپ، لونگ جمپ، شارٹ پُٹ وغیرہ کی۔ پولس فورس میں سب انسپکٹر سے اوپر کی پوسٹ کے لیے اسٹیٹ پبلک سروس کمیشن کے ذریعے فارم بھرے جاتے ہیں اور سب انسپکٹر اور اسٹنٹ سب انسپکٹر کی پوسٹ کے لیے سیدھے فارم منگائے جاتے ہیں پیراملٹری فورس میں اسسٹنٹ کمانڈنٹ کی پوسٹ کے لیے کافی مشکل سلیکشن پروسیز سے گزرنا ہوتا ہے اور 20 سال کی سروس کے بعد ڈی آئی جی اور آئی جی جیسے آفیسر رینک کو حاصل کر سکتے ہیں۔

ڈفینس کی فیلڈ کے لیے آپ میں مینٹل فٹ نیس کی بھی بہت ضرورت ہے۔ امن ہو یا جنگ کا میدان ہر جگہ یہ آپ کے لیے ضروری ہے۔ بہت سے موقعے ایسے آتے ہیں کہ ایک سیکنڈ کی غفلت یا فیصلہ لینے میں ذرا سی چوک آپ کی زندگی کے ساتھ ساتھ آپ کے ہم وطنوں کی زندگی بھی تباہ کر سکتی ہے۔

(6) ٹیچنگ— وسیع و گہرا مطالعہ اور اَپ ڈیٹڈ نالج:

ٹیچنگ ایک معزز کیریئر ہے۔ آج کے دور میں تو اچھی سیلری اور سہولتوں نے ٹیچنگ کو نوجوانوں کے لے قابل توجہ بنا دیا ہے۔ لیکن اس فیلڈ میں کامیابی کے لیے اپنے موضوع کا وسیع اور گہرا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ اگر آپ کا مطالعہ وسیع اور گہرا نہیں ہے تو آپ اس فیلڈ میں آ کر بھی کامیابی اور اپنے طالب علموں سے عزت نہیں پا سکتے اس لیے اس فیلڈ کی بنیادی ضرورت مطالعہ ہے۔ ساتھ ہی آپ کسی بھی موضوع کے ہوں آپ کو اپنے موضوع سے متعلق نئی معلومات کی بنا پر خود کو اَپ ڈیٹ رکھنا ہوگا۔

(7) میڈیا— ٹائم مینجمنٹ اور مسلسل جدوجہد کا جذبہ:

اوپری چمک دمک سے بھری ہوئی یہ فیلڈ میڈیا پروفیشنلس سے مسلسل جدوجہد کا تقاضا کرتی ہے۔ اس فیلڈ میں ٹکے رہنے کے لیے وقت کے پہیوں کے ساتھ تیز بھاگنے اور پابندی سے جدوجہد کرتے ہوئے دوسروں سے آگے بڑھنے کی صلاحیت ہونا بے حد ضروری ہے۔ چونکہ یہ ایک Dead line based profession ہے اور اس پل کی خبر اگلے پل پرانی قرار دے دی جاتی ہے اس لیے یہاں ٹائم مینجمنٹ کی اہمیت بہت زیادہ ہے یہ ایک ایسی فیلڈ ہے جہاں آپ کو کسی بھی وقت اور کسی بھی جگہ جا کر اپنی رپورٹ کے لیے ڈاٹا اکٹھے کرنے ہوں گے اس لیے کام کرنے کے وقت اور جگہ طے نہیں ہے آپ اگر آزادانہ ہمہ وقت کام کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں تبھی کامیاب ہو سکتے ہیں۔

(8) آئی ٹی انڈسٹری— قابلیت ہے تو مشکلیں نہیں:

آئی ٹی انڈسٹری کے انسٹی ٹیوٹ Nescom کے صدر کا کہنا ہے کہ آج چھوٹے شہروں میں آئی ٹی انڈسٹری تیزی سے اپنے پاؤں پھیلا رہی ہے اور زیادہ تر نوآموز و فارغ اس فیلڈ میں منتخب ہوں گے ہندوستانی آئی ٹی کمپنیاں 65 سے 70 فیصد فریشرس کا ہی انتخاب کرتی ہیں۔ اس لیے یہ دور اس فیلڈ میں نوجوانوں کے لیے بہترین موقع فراہم کرتا ہے لیکن ان مواقع کے بہتر استعمال کے لیے ہمارے نوجوانوں میں کمپیوٹر اور اس کی تکنیکی زبانوں پر عبور ہونا بہت ضروری ہے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اس دور میں کمپیوٹر سائنس ایک ہاٹ کورس بن گیا ہے۔ اس میں سسٹم سافٹ ویئر، ملٹی میڈیا ایپلی کیشن، سوفٹ ویئر انجینیئرنگ، ڈجیٹل الیکٹرانکس، کمپیوٹر نیٹ ورکنگ، ڈیٹا بیس سسٹم وغیرہ کی پڑھائی کرائی جاتی ہے۔

جی پی او کمپنیوں میں کام کرنے والے نوجوانوں کے لیے کمپیوٹر میں مہارت کے ساتھ انگلش بولنے کی صلاحیت ہونا بے حد ضروری ہے۔ نہ صرف انگلش اسپیکنگ بلکہ برٹش اور امریکی لہجے کو سمجھنے کی قابلیت اگر آپ میں نہیں ہے تو آپ اس میدان میں آنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ آئی ٹی جی پی او کمپنیوں میں کام کا پریشر زیادہ ہے اس لیے نوجوانوں کا تھکا دینے والے ورکنگ آورس میں کام کرنے کے لیے خود کو تیار رکھنا ہوگا اس کے لیے آپ کی جسمانی اور دماغی صحت بہت اچھی ہونا ضروری ہے۔

مختصر یہ کہ آج مقابلے کے اس دور میں اگر ایک اچھا کیریئر بنانا ہے تو ہر پل سیکھنے کے لیے خود کو تیار رکھنا اور اپنی صلاحیت کو بڑھانا آپ کے لیے بہت ضروری ہے۔ اپنا مقصد طے کیجیے اس کے مطابق اپنی صلاحیتوں کو نکھاریے۔ کالج لیول پر چلنے والے Internship Courses آپ کی قابلیتوں کو نکھارنے میں مددگار ہو سکتے ہیں کیونکہ عملی میدان میں آپ کے سیکھنے کا کوئی انتظار نہیں کرے گا۔ یہاں تو اگر آپ میں کام کرنے کی خاص قابلیت ہے، ہنر ہے، اور مہارت ہے تو آپ اپنے کیریئر مارکیٹ میں خود کو منوا سکتے ہیں۔

N·S·D·C
National
Skill Development
Corporation

اس بدلے ہوئے زمانے میں ڈگریوں کے ساتھ خاص استعداد کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے ہماری سرکار نے National Skills development Corporation کی شروعات کی جو مختلف سیکٹرس میں کام کرنے والوں کی قابلیتوں کو بڑھانے کا کام انجام دے رہی ہے۔

آج اچھا کیریئر بنانے کی راہ آسان نہیں ہے۔ اس لیے اس کی ضرورتوں کے مطابق ہمیں خود کو تیار کرنا ہے۔ کیا معلوم کون سا لمحہ ہمارے خواب کو حقیقت میں تبدیل کر دے۔

■

Dr. Asma Masood, Lecturer Govt P.G. Dungar College, Bikaner (Rajasthan)

مصنف: سوئیکت مکھوپادھیائے   مترجم: نسیم عزیزی

بنگلہ کہانی:

برکھا کی کائنات

برکھا صحن میں کھڑی طوطے کو ہری مرچ کھلا رہی تھی۔ اسے کھلانے سے کہیں زیادہ وہ اپنا دل بہلا رہی تھی۔ پنجرے کے جھروکوں سے وہ اس کے منھ کے قریب مرچ لے جاکر ہٹا لیا کرتی تھی۔ اس کی چال کو سمجھتے ہوئے طوطا یکا یک گردن ٹیڑھی کرکے اونچی آواز میں چلایا۔ برکھا نے ہنستے ہوئے کہا ''اوہ! اس بوڑھے کا مزاج تو دیکھو۔''

موسم سرما کی دھوپ 'اکا دکا' کھیلتے ہوئے ٹیوب ویل کے نچلے حصے سے اوپر کی جانب اٹھی۔ امرود کے پتے اینٹ گارے سے تعمیر کردہ حصار کے اردگرد منڈلاتے رہے سہ پہر کی آغوش میں پناہ لیتی دھوپ کی کرنوں کو برکھا نے ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ''کھیل کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ تم نے سمجھا۔ غسل کرنا ہوگا۔ یہ لو! تمھیں دے دیا۔'' اس نے طوطے کے کھلے ہوئے چونچ میں ہری مرچ ٹھونستے ہوئے اپنا ہاتھ ساڑی کے آنچل میں پونچھ کر گھر کی طرف قدم بڑھانے ہی والی تھی کہ کسی نے صدر دروازے پر اونچی آواز میں پکارا۔ برون! برون، کیا تم گھر پر ہو؟ آخر اس وقت اس کے شوہر کا نام لے کر کون پکار رہا ہے۔ برکھا نے اپنے کپڑے درست کرتے ہوئے اور دروازے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ کون؟ چند لمحے بعد ہی وہ آدمی صحن میں آکر کھڑا ہوگیا۔ اس کی عمر پچاس، پچپن کے درمیان ہوگی۔ اس نے کہا کہ یہ گھر بیرون ہلدار کا ہے؟ برکھا نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔ اس شخص کا اندازہ صحیح نکلا۔ اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں فقط ایک سوال کا تاثر لیے ہوئے وہ اس شخص کو غور سے دیکھتی رہی۔ اس کے پرکشش چہرے پر کرب و اضمحلال کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے اپنے بالوں میں بے قاعدگی سے انگلیاں پھیریں پھر ادھر اُدھر دیکھا ٹیوب ویل کے قریب غسل خانہ ہے۔ اس کے عقب میں سپاری کے کئی پیڑ ہیں اس کی شاخوں کو دیکھتے ہوئے کچھ دیر کے لیے اس کی خوش مزاجی نے انگڑائی لی۔ وہ بول اٹھا ''واہ، بہت خوب! ایک طویل عرصے بعد میں نے بیا کا گھونسلہ دیکھا۔'' برکھا بھی اسی طرف دیکھنے لگی۔ زردی مائل چڑیا کی مانند یہ پرندے تنکے وغیرہ اپنی چونچ میں لاکر بنت کاری میں مشغول ہیں۔ دراصل یہ چیزیں کچھ اس قدر عام سی لگتی ہیں کہ برکھا نے ان کی جانب خاص طور سے دیکھنے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی تاہم اس نے اس وقت اسی جانب دیکھا۔ اتنے میں اس آدمی کا چہرہ ایک بار پھر شگفتگی سے محروم ہوگیا۔ اس کی جانب دیکھتے ہوئے برکھا نے پوچھا۔ ''کہاں سے آرہے ہو؟'' اس نے اپنی جیب سے ایک سفید رومال نکالا اور اپنا قیمتی چشمہ اتار کر صاف کرتے ہوئے جواباً کہا ''فی الوقت تو میں ہوڑہ ہسپتال سے آرہا ہوں۔ میرا گھر سونار پور میں واقع ہے۔ کیا تم سونار پور کو جانتی ہو؟

برکھا سونار پور کبھی نہیں گئی لیکن اس کا نام سن کر اس کے دل میں سونے کے زیور کی کھنک مرتعش ہوئی۔ اس کا شوہر برسوں وہیں رہا۔ تعلیم حاصل کی، جدوجہد کی، تمام تر کام وہیں انجام دیے جسے اس نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ برکھا نے فوراً گھر سے ایک بید کی کرسی لے کر آنگن میں رکھ دی جہاں دھوپ پھیلی تھی۔ اپنا انداز تخاطب بدلتے ہوئے کہا ''اسے گھر لوٹنے میں شام کے سات بج جاتے ہیں۔ آپ یہاں آکر بیٹھیے نا۔''

''بیٹھوں گا — اچھا۔ چلو بیٹھ ہی جاؤں۔'' اس کے بعد سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا ''درحقیقت برون سے فی الحال کوئی کام نہیں ہے۔ اس طرف آیا تھا تو سوچا کہ وہ کیسے اپنی زندگی بسر کر رہا ہے، ذرا دیکھ کر تو لوں۔'' برکھا اچھی طرح جانتی ہے کہ وہ سونار پور کے سلسلے سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا ہے کیونکہ وہ ان مصائب و آلام کے تھے۔ بڑی تنگ دستی تھی۔ ٹیوشن کرکے اپنی تعلیم جاری رکھتا، تقریباً 9 کیلومیٹر کی مسافت بذریعہ سائکل طے کرکے روزانہ کالج کے لیے آمد و رفت کرنا، گھنٹوں کی فاقہ کشی بھلا اپنی پریشانیوں کے دن کو کون یاد رکھنا چاہتا ہے۔ اس کے باوجود کوئی تو ایسا نیک انسان ضرور ہوگا جو اس کے برے وقت میں کام آیا ہوگا؟ ایک لڑکا خود اپنے بل بوتے پر اتنے کم وقت میں اتنی ترقی کیسے کرسکتا ہے؟ برکھا کو اب اس بات کا یقین ہوگیا کہ یہ وہی رحم دل ہم سایہ ہیں۔ ریت کے سینے میں محفوظ پانی کی طرح برکھا کا دل جذبۂ تشکر سے مچل اٹھا تھا۔ ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے اسے برون جیسا شوہر نصیب ہوا ہے۔ یہی لوگ اس آزمائشی دور میں اسے کتابیں خرید کر دیتے رہے ہیں۔ اسے پہننے کو کپڑے دیے۔ سائکل مرمت کرنے کے لیے پیسے دیے۔ امتحانات کے فارم جمع کرنے کے لیے رقوم دیے۔ اگر وہ اس کے کام نہ آتے تو وہ کہاں سے اتنی رقم لاتا؟

آج انھیں فرصت ملی ہے تو وہ بذات خود دیکھنے آئے کہ جو پودا برسوں پہلے انھوں نے لگایا تھا وہ شجر کی

صورت میں کیسے سایہ فراہم کر رہا ہے۔ کتنے لوگ ہیں جو اس طرح خبر گیری کرتے ہیں۔ انھیں بٹھا کر برکھا تیز قدموں سے گھر میں داخل ہوئی، مورتی کے سامنے رکھی ہوئی پرساد کی تھالی سے چار عدد مٹھائی، اٹھایا اور کالی چیونٹیوں کو بھگایا۔ محلے سے خریدے گئے پلاسٹک کے گل دار طشت کو آنچل سے صاف کرتے ہوئے اس پر مٹھایاں رکھی۔ پہلی بار اس طشت کا استعمال ہوا ہے۔ کوئی تو آتا ہی نہیں کہ اس میں اسے کوئی چیز پیش کی جاسکے۔

برکھا کو بچپن سے ہی گھر کی تزئین و آرائش میں دلچسپی تھی۔ شادی کے بعد سے وہ ہر حال میں اپنا شوق پورا کر رہی تھی لیکن اگر کوئی اس کے گھر کی سجاوٹ پر توجہ نہ کرے تو وہ آخر کب تک اپنے شوق کی تکمیل کرتی رہے گی۔ برون کے اپنے بے گانے تو نظر نہیں آتے ہاں برکھا کے ساتھ اس کی بیمار ماں اور صرف ایک بھائی— مگر وہ بھی آسنسول میں مقیم ہیں۔ اس کا بھائی اپنی دکان چھوڑ کر بار بار آنا جانا نہیں کرسکتا۔ پوجا کے تہوار سے قبل ایک بار آیا تھا۔ دوپہر کو وارد ہوا اور شام ہوتے ہی واپس چلا گیا۔ دکان بند کرنے سے کاروبار پر منفی اثر پڑتا ہے۔

آج یہ شخص اچانک اس کے گھر آکر صحن، خواب گاہ، گوشے گوشے کو گھوم گھوم کر یوں دیکھے گا بھلا کون جانتا ہے۔ برکھا نے دل ہی دل میں سوچا کہ اس نے کیوں اپنی سستی کا مظاہرہ کیا۔ ذرا دیکھو تو صحن میں سوکھے پتے کیسے بکھرے پڑے ہیں۔ شام کے وقت انھیں پھینک دوں گی۔ اسے اچھا لگ رہا تھا کہ ایک شخص قریبی رشتہ دار نہ ہونے کے باوجود اس کے گھر کی ایک ایک شے کو بغور دیکھ رہا ہے۔ کیا کیا نہ کچھ وہ جاننا چاہتا ہے۔ برکھا نے آنگن میں ایک جانب قطار در قطار گیندا پھول کے بیج بوئے تھے، اب تو وہاں پھول اُگ آئے ہیں۔ انھوں نے بڑی شفقت کے ساتھ ان پھولوں پر ہاتھ پھیرا ''پنجرے کے قریب جاکر لحہ بھر کو رکے اور پھر ٹیوب ویل کے اردگرد پختہ حصار کو دیکھ کر کہا کہ دلہن تم نے اسے کس طرح محفوظ کر رکھا ہے۔

اس نے غیر ارادی طور پر جواب دیا ''ذرا تنگی تھی نا؟'' یہ بات کہنے میں برکھا کو ایک ذرا بھی شرم نہیں آئی کیونکہ نہ جانے کیوں اس شخص کو دیکھ کر اسے اپنے باپ کا خیال آیا۔ ہر چند کہ ان کا لباس اور ان کی شکل و شباہت اس کے باپ سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ یہ بہت امیر آدمی ہیں۔ کتنے خوب صورت جوتے ہیں، شرٹ پینٹ کتنی اچھی ہے، برکھا کے باپ نے زندگی بھر ہوائی چپل پہنی تھی تاہم اتنی مماثلت تو ضرور ہے کہ ان کا مشفقانہ لہجہ اس کے باپ سے حد درجہ مماثل تھا۔ اس کے باپ بھی جب گفتگو کرتے تھے تو کچھ ایسا ہی لگتا تھا۔ یہ بھی دوران گفتگو سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھ رہے ہیں۔

برکھا نے ان سے استفسار کیا۔ ''کیا آپ گھر دیکھیں گے؟''

''چلو، دیکھ لوں۔''

انھوں نے دیکھا کہ پرانی ساڑی کو کاٹ چھانٹ کر کھڑکی کے پردے تیار کیے گئے ہیں۔ بوتل کے اندر رکھے ہوئے منی پلانٹ کی پتلی پتلی لڑیاں برآمدے کے گرل سے لپٹی ہوئی ہیں۔ کئی پر سکوت دوپہر کی قربانی دے کر اس نے ٹیبل کلاتھ پر پھول پتیوں کے نقش و نگار ابھارے تھے جس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جانے وہ کس خیال میں چلے گئے۔ چند لمحوں تک خاموش رہنے کے بعد وہ خواب سے گویا حقیقت کی دنیا میں داخل ہوا اور اعتراف کرتے ہوئے کہا ''تم نے اپنے گھر کو کسی باغ کی صورت سجا سنوار کر رکھا ہے۔ خوب، بہت خوب!''

وہ دونوں پھر دالان میں آکر بیٹھ گئے۔ برکھا چھوٹی چوکی پر جب کہ وہ بید کی کرسی پر— برکھا نے کہا ''چاچا! کیا آپ کے لیے چائے بناؤں؟'' اگر بنانا چاہتی ہو تو بناؤ۔ چائے پینے کے بعد ہی گھر جاؤں گا۔ تمھیں بھی تو فریش ہونے میں خاصی تاخیر ہو رہی ہے۔ برکھا نے فوراً کہا ''نہیں۔ نہیں— دیر کہاں ہوئی؟ گھر کے سارے کام انجام دیتے دیتے ڈھائی بج ہی جاتے ہیں۔'' ''اتنا وقت لگ جاتا ہے'' انھوں نے حیرت ظاہر کی اور کہا ''کیا کرتی رہتی ہو؟ تم نے تو مجھے بتایا کہ برون ساڑھے نو بجے دفتر کے لیے روانہ ہوتا ہے۔''

''ہاں، وہی اور کیا—'' برکھا نے صحیح جواب نہیں دیا اس لیے وہ کچھ شرما سی گئی۔ یہی کھلونے سے تعمیر کردہ گھر کی طرح دو کمروں پر مشتمل چھوٹے مکان کی صفائی ستھرائی اور اسے سنوارتے سنوارتے وقت کسی طور گزر جاتا ہے۔ برکھا کو ندامت کا احساس ہوا کیونکہ یہ راز کوئی اور نہ جانے۔ اسے بخوبی معلوم ہے کہ یہ گھر صرف گھر نہیں بلکہ اسی کے وسیلے سے وہ دن بھر اپنے شوہر کے لمس کو محسوس کرتی رہتی ہیں۔ شرٹ کی بٹن ٹانکتے ہوئے وہ لمحوں اسے دانتوں تلے دبائے رکھتی ہے۔ پسینے اور نکوٹن کی ملی جلی بھینی بھینی خوشبو مادرانہ محبت کے احساس سے اُسے سرشار کیے دیتی ہے۔ اس کے شوہر کا تصور اسے بے فکری اور احساس تحفظ کی نعمت عطا کرتا رہتا ہے۔ برون نے دیوار کے اوپری حصے پر تصویر آویزاں کرنے کے لیے برکھا کی جانب ہاتھ بڑھایا تھا۔ ان دونوں کی فریم شدہ تصویر اپنے شوہر کی جانب بڑھائی تھی۔ اس نے پھول کی کیاری لگانے کے لیے کدال سے زمین کھودی تھی جس پر برکھا نے بیج کا چھڑکاؤ کیا تھا۔ اس نے چھٹی کے دن سرخی مائل تکیے کو چھت پر دھوپ میں سکھایا اور بڑے توشک کو کئی بار بلا کسی کد و کاوش کے اپنے کندھے پر اٹھایا تھا۔ توشک اور تکیوں پر چمکیلے پھول دار غلاف چڑھائے تھے۔

ایک اجنبی شخص پر برکھا نے نہ جانے کیسی کیسی راز کی باتیں ظاہر کردی ہیں۔ اس گھر کی ایک ایک شے پر دونوں کے ہاتھوں کا لمس منور رہے۔ اس سپاری کے درخت پر برون نے ڈوریاں باندھ رکھی ہیں جہاں اس کی ساڑی ٹنگی ہوئی ہے۔ اس کے اوپر جو ڈوری ہے وہ برون کی ہے جس پر برکھا کے رنگین کپڑے ہیں۔ اس طرح اس کے شوہر نے گھر کو آگ، پانی، طوفان اور ہوا سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنی بیوی کو بہت مضبوطی سے تھامے رکھا ہے۔ ایسی صورت میں کھانے پینے کا کوئی مقررہ وقت بھی ہوسکتا ہے؟ اس نے بات کو طول نہ دیتے ہوئے خاموشی اختیار کرلی۔ وہ بھی جواب طلبی کے لیے آرزومند نہ تھے اور چائے کی پیالی کو میز پر رکھتے ہوئے ایک بار پھر صحن دیکھنے کے بعد اپنی نشست پر آکر بیٹھ گئے اور چائے کی پیالی اٹھائی۔

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ اس شخص کی بے چینی اس کے چہرے پر صاف طور پر نمایاں تھی۔ ان کا نام معلوم نہ ہونے کے سبب وہ انھیں چاچا بابو کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔ برکھا نے سوچا کہ کیا انھیں چاچی ماں کے ساتھ آنے کے لیے کہا جائے؟ اب تو ان کا نام بھی پوچھنا ضروری ہے ورنہ جب برون دفتر سے گھر لوٹے گا تو اس سے کیا کہے گی کہ اس سے ملنے کون آیا تھا؟ ابھی وہ اس قسم کی باتیں سوچ ہی رہی تھی کہ انھوں نے کہا ''ہمارے گھر میں ایک کرسی ہے— آرام چیئر— رومی اور سومی— میری بیٹیوں نے اس کا نام رکھا تھا— ''برون کا سنگھاسن''— برکھا ان کی بات سمجھ نہ سکی اس لیے وہ حیرت سے ان کا منھ تکنے لگی۔

''تم نے کچھ نہیں سمجھا؟ برون ہمارے گھر اکثر آیا جایا کرتا تھا۔ یوں سمجھ لو کہ تقریباً روزانہ۔ وہ خاموش طبع تھا۔ کچھ کہنے سے احتراز کرتا تھا۔ ایسی ویسی حرکت سے خود کو باز رکھتا تھا۔ بس خاموشی سے اس تخت پر بیٹھا رہتا تھا۔ رومی اور سومی اپنی مختلف مصروفیات کے باوجود ایک آدھ بار اسے دیکھ جاتی تھیں۔ تمھاری کاکی ماں اسے خوب عزیز رکھتی تھی۔ گھر پر جو کچھ کھانے کے لیے ہوتا اسے دیا جاتا تھا۔ وہ خاموشی سے کھالیا کرتا تھا۔ وہ کب

اپنے کام کے لیے نکل جاتا تھا مجھے اس کا اندازہ قطعی نہیں ہوتا لیکن میں رومی اور سومی کو دیکھتا کہ ہنستے ہنستے ان کا برا حال ہو رہا ہے بالخصوص سومی جو اپنی کم عمری کی وجہ سے کچھ زیادہ شرارت کرتی تھی۔ وہ چھیڑتے ہوئے کہتی کہ باجی تمھارے عاشق آئے ہوئے ہیں۔ ایک ذرا دیدار کی صورت نکال کر اسے خوش ہونے کا موقع دیں۔ رومی اسے مارنے کو دوڑتی— آج بھی کئی صوفہ سیٹ کے درمیان وہ آرام چیئر ہے جس پر کوئی بیٹھتا نہیں ہے— برکھا کو دفعتاً خیال آیا کہ دھوپ کچھ زیادہ تیز ہے۔ اس کی پیشانی اور کان کی لویں گرم ہو رہی تھیں اپنے آنچل سے چہرہ صاف کرتے ہوئے وہ تحیر زا نگاہوں سے اس معمر شخص کو دیکھتی رہی— وہ لڑکا کسی روز ہمت و حوصلے کے ساتھ اتنا سب کچھ کرے گا، سوچا نہیں تھا۔ انھوں نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ دو برس پہلے شادی کے سلسلے سے جب میں دوڑ دھوپ کر رہا تھا تو ایک روز وہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ وہ رومی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ وہ ایک شریف اور محنتی لڑکا ہے اور اس وقت وہ برسرِ روزگار بھی ہو گیا تھا لیکن کچھ سوچتے ہوئے میں نے انکار کر دیا تھا۔ میں نے خفگی یا ناراضی ظاہر کرتے ہوئے نہیں بلکہ سمجھاتے ہوئے کہہ دیا تھا۔ رومی سے کچھ پوچھنے کا خیال بھی نہ آیا۔ اس وقت میں سمجھنے سے قاصر تھا جس لڑکے کے ساتھ دونوں بہنیں دن بھر ہنسی مذاق کرتی ہیں بھلا ایسے لڑکے کے دل و دماغ میں شادی بیاہ کا معاملہ کیسے راہ پائے گا؟ تمھاری چاچی ماں جانے کیا بڑبڑاتے ہوئے مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر میں نے اسے سخت وارننگ دیتے ہوئے خاموش کر دیا تھا اس کے کئی روز بعد سونار پور کو خیرباد کہہ کر وہ یہاں شیام پور چلا آیا اور تقریباً ڈیڑھ سال بعد رومی کی شادی ہوگئی۔ ہوڑہ کے ایک اعلیٰ خاندان کے لڑکے کے ساتھ جو پیشے سے وکیل ہے۔ اس کی مالی حالت بہت اچھی ہے۔ اپنے باپ کے گھر سے رخصت ہوتے وقت رومی دہاڑیں مار کر روتی رہی حالانکہ تمام لڑکیاں ایسے موقعوں پر روتی ہیں۔ اس کو اس طرح سے روتے ہوئے دیکھ کر میں نے استعجابیہ لہجے میں اس کی ماں سے استفسار کیا تھا۔ وہ اتنا کیوں رو رہی ہے؟ اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا تھا کہ اس کی آب دیدہ آنکھوں میں کئی قسم کے آنسو ہیں۔ کیا تمھیں معلوم ہے؟

رومی کی شادی راحت بخش ثابت نہیں ہوئی۔ اس کے سسرال والے اسے جسمانی و جذباتی اذیتیں پہنچاتے تھے۔ ہم اگر فون پر ان سے رابطہ قائم کرتے تو وہ میری بیٹی کو فون اٹھانے کی اجازت نہیں دیتے۔ اس لڑکے کا کسی اور لڑکی کے ساتھ معاشقہ چل رہا ہے۔ رومی اتنی جلدی مایوس ہو جائے گی مجھے اس کا قطعی اندازہ نہ تھا۔ کوئی حل تلاش کرنے کا موقع ہی مجھے نصیب نہ ہوا۔ کیا ایسا بھی کوئی کرتا ہے، کہو تو، انھوں نے سپاری کے درخت کی چوٹی کی جانب یاس آمیز نگاہوں سے دیکھا جہاں بیا کا ایک غول آمد و رفت میں مشغول تھا۔ ''کیا— آپ کی لڑکی نے کیا کیا ہے،'' برکھا نے کانپتے ہوئے لہجے میں

پوچھا۔ ''اس کے سسرال والے اسے محض ایک حادثہ کہہ رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے آنچل کے نچلے حصے میں آگ لگی تھی لیکن میں نے دیکھا کہ اس کے جسم کا اگلا حصہ جلا ہوا ہے۔ اس کی پلکیں— ہونٹ— سینہ کچھ بھی باقی نہیں ہے۔ سب کچھ آگ کی حدت سے گل کر باہر آ گیا ہے۔ رومی تو کچھ کہنے کی حالت میں نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اب وہ ہوش میں نہیں آئے گی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آج شام تک— لیکن میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ کسی بھی حال میں خودکشی نہیں کر سکتی ہے۔

ہسپتال سے باہر نکلنے کے بعد نہ جانے کیا ہوا کہ میں نے سوچا کہ اس کا اپنا سسرال اسے تو راس نہ آیا مگر وہ گھر جو اسے ملنے والا تھا اور جہاں اسے میں نے ہی جانے سے روکا تھا— چلوں ایک بار اس گھر کو دیکھ آؤں کہ آیا وہاں جا کر میری بیٹی کس حال میں اپنی زندگی گزر بسر کرتی! یہی وجہ ہے کہ ہوڑہ سے بذریعہ ٹرین میں یہاں آیا— انھوں نے عالم بے خودی میں اپنے سیاہ و سفید بالوں کو مٹھی میں دبوچا اور کہا مجھے تو اب یہ بھی معلوم نہیں کہ ایسی باتیں تم سے کہنا مناسب بھی ہے یا نہیں؟ دراصل میری ذہنی کیفیت فہم و دانش کے تمام دروازے مجھ پر بند کر چکی ہے۔ رومی کی عمر جب پانچ سال کی تھی تب اس نے جلتی ہوئی پھلجھڑی کے ایک ٹکڑے پر پاؤں رکھ دیا تھا۔ اس نے تین دنوں تک مارے درد کے زمین پر پاؤں نہیں رکھے تھے میں اسے اپنی گود میں لیے پھرتا رہا اور وہی لڑکی آج burn injury % 70 لیے ہسپتال میں پڑی ہوئی ہے۔ کیا ایسی صورت میں میری دماغی حالت درست رہ سکتی ہے۔ تم ہی بتاؤ تو؟'' اتنا کچھ کہنے کے بعد وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

ان کا نام نہ معلوم ہو سکا۔ برکھا جانتی تھی کہ اب وہ ان کا نام نہیں پوچھ سکتی ہے کیونکہ اب اس کے اندر اتنی سکت باقی نہ رہی کہ وہ نام بھی پوچھے۔ صدر دروازے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے دفعتاً وہ ٹھٹھک کر رہ گئے اور حسرت و یاس بھری نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔ برکھا کو یوں لگا کہ وہ پھولوں کے پودوں، پرندوں کے گھونسلے، کانسے کا گلاس حتیٰ کہ ایک ایک شے کو وہ اپنے چشم تصور میں بسا لینا چاہتے ہیں اور تہہ دل سے اعتراف کیا کہ ان سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے۔ انھوں نے اپنے سر کو جھٹکا دیا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے وہ باہر نکل گئے۔

برکھا ایک ستون سے ٹیک لگائے ایک نحیف و نزار لڑکی کی طرح انھیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ برون شام کو جب گھر لوٹا تو دیکھا کہ اس کی بیوی بت بنی بیٹھی ہوئی ہے۔ گھر میں کہیں بھی روشنی کا نام و نشان نہیں ہے۔ برون نے انتہائی حیرت سے برکھا کے چہرے کو قریب جھک کر پوچھا ''کیا ہوا ہے برکھا؟'' اس کی آنکھوں میں آنسو خشک ہو چکا تھا۔ اس نے کسی بھی طرح ہوش و حواس کو مجتمع کر کے اپنے شوہر سے پوچھا۔ ''میں یہ کس کا گھر آباد کر رہی ہوں؟''

■

Nasim Azizi, 172, G.T. Road (South)
Howrah - 711102

دماغ اور دماغی صحت

شمس الاسلام فاروقی

ہمارے جسم میں دماغ ایک مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ جسم کے مختلف حصوں سے جو بھی کام انجام پاتے ہیں وہ سب ہی دماغ کے مرہونِ منت ہیں۔ ہمارے پورے جسم میں عصبی نسوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے جس کا رابطہ دماغ سے ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے حسی پیغامات وصول ہوتے ہیں اور پھر ہر ایک کے لیے ہمارا یہ دماغ مناسب احکامات انتہائی برق رفتاری سے جاری کرتا ہے جن کے مطابق ہی جسم کے مختلف کام انجام پاتے ہیں۔

دماغ کیونکہ جسم کا سب سے قیمتی عضو ہے اس لیے اسے جسم کے سب سے اوپر کے حصے میں ایک مضبوط کھوپڑی کے اندر محفوظ کیا گیا ہے۔ انسانی دماغ کی ساخت پر نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ وہ دو نصف کروں پر مشتمل ہے۔ ان دونوں کروں کے درمیان ایک واضح شگاف نظر آتا ہے جو سامنے سے شروع ہوکر دماغ کے پچھلے حصے تک چلا جاتا ہے۔ یہ دونوں نصف کرے اپنی اساس پر بجلی کے گھنے تاروں کی مانند نسوں کے ذریعے ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ دونوں کروں کو دو انتہائی قوت والے کمپیوٹروں سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جن میں سے ہر ایک کو الگ الگ نوعیت کے پروگراموں کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔

ہمارے دماغ کی سب سے زیادہ دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے جسم کا بایاں حصہ نسوں کے ذریعے دماغ کے دائیں نصف سے جب کہ دایاں حصہ دماغ کے بائیں حصے سے مربوط ہے۔ دایاں نصف کرہ دیگر باتوں کے علاوہ ہمارے جذبات اور احساسات کو کنٹرول کرنے میں زیادہ موثر رول ادا کرتا ہے جب کہ بایاں نصف کرہ دیگر باتوں کے ساتھ دلائل پیش کرنے کی قوت اور غور وفکر کرنے کی صلاحیتوں پر زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔

وہ لوگ جن کے دماغ کا دایاں نصف کرہ زیادہ قوی ہوتا ہے۔ طبعاً جذباتی اور حساس ہوتے ہیں۔ وہ خودنمائی کے مواقع تلاش کرتے رہتے ہیں اور ان امتحانات میں ان کی کارکردگی زیادہ اچھی ہوتی ہے جہاں بیانیہ قسم کے سوالات پوچھے جائیں۔ یہ لوگ فطرتاً آرٹ کے دلدادہ ہوتے ہیں اور فنونِ لطیفہ میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ان لوگوں میں حس لطیف زیادہ ہوتی ہے اور تخلیقی صلاحیتیں بھی بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہیں۔ انوکھی طرز کی پراسرار کہانیاں بہت دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ مطالعے کے دوران بھی موسیقی سننا یا ٹیلی ویژن دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ یار باشی کا انھیں شوق ہوتا ہے اور عموماً ایسی چیزوں کے خواب دیکھتے ہیں جو شاید کبھی واقع نہیں ہوتیں۔ جیومیٹری ان کا پسندیدہ مضمون ہے۔ وہ چیزوں کی تنظیم میں دلچسپی لیتے ہیں تاکہ ان کے مابین تعلق کو اجاگر کرسکیں۔ لوگوں سے مباحثہ کرنا انھیں اچھا لگتا ہے۔ ان کا اندازِ فکر

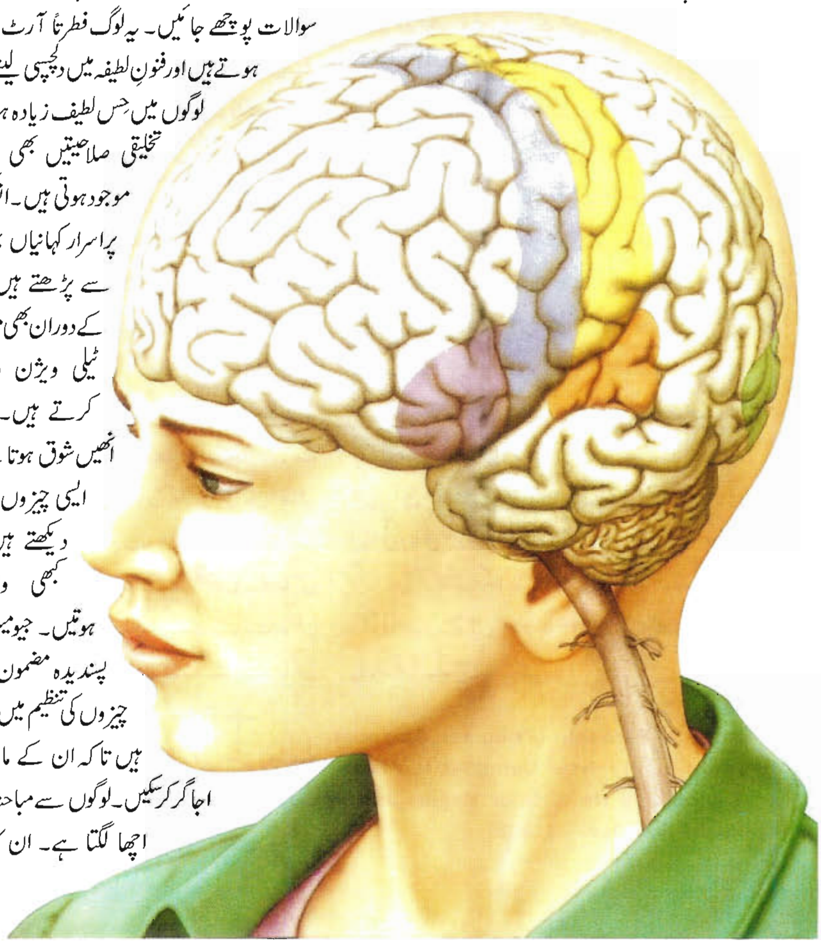

فلسفیانہ ہوتا ہے اور وہ خواب بننا پسند کرتے ہیں۔ البتہ یہ لوگ اکثر غائب دماغی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

جہاں تک ان لوگوں کا سوال ہے جن کے دماغ کے بائیں نصف کرے کی کارکردگی زیادہ بہتر ہوتی ہے انھیں اپنی زبان اور سیدھے ہاتھ پر زیادہ قابو ہوتا ہے۔ معاملے میں یہ لوگ ضابطوں اور قاعدے قانون کے پابند ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ہر بات کا تجزیہ کرکے قانونی نتائج اخذ کرتے ہیں ایسے لوگ سائنسی مزاج رکھتے ہیں اور ریاضیات میں اچھے ہوتے ہیں۔

بائیں نصف کرے کی بہتر کارکردگی والے لوگوں کو آسانی سے پینوٹائز نہیں کیا جاسکتا۔ ایسے لوگوں کو اگر کوئی بات خصوصیت سے بتائی جائے تو وہ اسے یاد رکھتے ہیں۔ انھیں حقیقت پر مبنی کہانیاں پڑھنا اچھا لگتا ہے۔ مطالعے کے وقت ان لوگوں کو مکمل سکون کی ضرورت ہوتی ہے۔ خود بھی یہ لوگ غیر فکشن لکھنا پسند کرتے ہیں۔ انھیں ایسے کاموں میں حصہ لینا اچھا لگتا ہے جو ضابطے کے ساتھ مرتب کیے گئے ہوں۔ الجبرا انھیں محبوب ہوتا ہے۔ خاموشی سے بیٹھ کر یہ لوگ زیادہ اچھی طرح سوچ سکتے ہیں۔ زبانی تقاریر توجہ سے سنتے ہیں اور کہانیاں سنانا انھیں پسند ہے۔ یہ لوگ کبھی بھی غائب دماغ نہیں ہوتے۔

یہ کہنا کسی بھی طرح مناسب نہیں کہ وہ لوگ زیادہ بہتر ہوتے ہیں جن کے دماغ کے کسی ایک کرے کی کارکردگی زیادہ بہتر ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ وہی لوگ زندگی میں کامیاب ہوتے ہیں جہاں دماغ کے دونوں نصف کرے یکساں طور پر کام کرنے والے ہوں۔ دیکھا جائے تو ہم میں سے ہر ایک تقریباً روزانہ ہی اپنے دماغ کے دونوں حصوں کا استعمال کرتا ہے، فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ کسی میں جذبات کا فیصد زیادہ اور دوسروں میں دلیل اور قانونی انداز فکر کا فیصد زیادہ ہوتا ہے تاہم زندگی میں ایک متوازن شخص وہی کہلائے گا جس کے لیے اقبال نے کہا ہے:

لازم ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

(یہاں 'دل' کو دماغ کے جذباتی نصف کا ترجمان تصور کیجیے)

اگر موجودہ دور میں ایک آدمی کی عام زندگی کا جائزہ لیا جائے تو پتا چلے گا کہ اس کا زیادہ تر طرز زندگی میکانکی

ہوکر رہ گیا ہے۔ یہ کمپیوٹر کا دور ہے، انسان عقل کا استعمال کم اور مشینوں کا زیادہ کرنے لگا ہے۔ اگر آپ کے سامنے کوئی موضوع ہے تو آپ اس پر سوچتے نہیں ہیں بلکہ موضوع سے متعلق مواد بٹن دبا کر حاصل کر لیتے ہیں۔ عمومی طور پر اس انداز زندگی سے ہر شخص کی تخلیقی صلاحیتیں متاثر ہوتی ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ وہ لوگ بھی جو طبعاً ایک تخلیقی مزاج لے کر پیدا ہوئے تھے بلکہ ابتداء ایک تخلیقی طرز زندگی ہی کو اپنائے ہوئے تھے وہ بھی میکانکی انداز اختیار کرنے کی وجہ سے اپنی تخلیقی صلاحیتیں کھو بیٹھتے ہیں اور صرف ضابطوں اور قاعدوں کے پابند ہوکر رہ جاتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے دماغ کے تخلیقی حصے کو قوی بنانے کی کوشش کریں۔ اس سلسلے میں حسب ذیل طریقے مفید ہوسکتے ہیں۔

1. آپ کو اپنے جس ہاتھ پر قابو نہیں ہے اس کا استعمال کیجیے۔ مثلاً اگر آپ اپنے کام سیدھے ہاتھ سے کرتے ہیں تو گاہے بہ گاہے الٹے ہاتھ کا استعمال کریں جیسے اپنے دانت الٹے ہاتھ سے برش کریں یا پھر ہر روز چند منٹ الٹے ہاتھ سے کچھ لکھنے پر صرف کریں۔ ابتدا میں آپ کو خود اپنی تحریر دیکھ کر ہنسی آئے گی تاہم رفتہ رفتہ اس میں سدھار آتا جائے گا اور آپ بہتر لکھنے لگیں گے۔ یہ عمل آپ کے سیدھے نصف کرے کی صلاحیتوں میں بھی بہتری لائے گا۔

2. بند آنکھوں کے ساتھ اپنے کمرے میں داخل ہوں اور تصور کریں کہ مختلف فرنیچر کہاں کہاں رکھا ہے۔ یہ عمل ہفتے میں دو ایک بار ضرور کریں۔ آنکھیں بند کرنے کے بجائے آپ کمرے میں اندھیرا کر کے بھی اس عمل کو دہرا سکتے ہیں۔

3. کوئی تخلیقی کام کریں مثلاً آنکھیں بند کر کے خواب دیکھیں جیسے آپ کہیں جا رہے ہیں، کیسے جا رہے ہیں، کہاں کہاں سے گزرتے ہیں، کیا کچھ دیکھتے ہیں، اور کن کن لوگوں سے ملتے ہیں وغیرہ۔ پنسل لے کر بے مقصد بھی کچھ بنانے کی کوشش کریں۔

4. اپنے معمول یعنی لگے بندھے طریقوں میں تبدیلی پیدا کیجیے جیسے کسی نئے بازار کی نئی دوکان سے خریداری کریں۔ الٹے ہاتھ سے کھانا کھائیں۔ دفتر یا بازار سے گھر آنے کے لیے معمول کا راستہ چھوڑ کر نئے راستے تلاش کریں۔ اپنے بچوں کے ساتھ کسی کھلونوں کی دوکان پر جائیں اور وہاں مشاہدہ کریں کہ مختلف الکٹرانک کھلونے کس طرح چلتے ہیں۔ مختلف شوق اپنانے کی کوشش کیجیے۔

دماغ کے بائیں نصف کرے کی صلاحیتوں میں اضافہ کرنے کے لیے آپ اپنے دماغ کو ایک عضلہ تصور کیجیے اور ایسے موقعوں میں رہیے جب آپ اسے موڑ یا کھینچ سکیں۔ مثلاً معمے حل کیجیے یا پہیلیاں بوجھیے۔ کسی بیرونی زبان کو بولنا سیکھیے۔ غرض کوئی بھی ایسا کام کیجیے جو دماغ کو متحرک کرنے والا ہو اور وہ آپ کو معمول سے ہٹ کر مختلف انداز سے سوچنے پر مجبور کردے۔

دماغ کے تمام حصوں کی صلاحیت میں اضافہ کرنے کے لیے علی الصباح جاگنے کے بعد بستر پر لیٹے لیٹے اپنے انگوٹھوں کو اندر باہر حرکت دینا شروع کیجیے، پھر پورے جسم کو اکڑائیے، اینٹھائیے اور کھینچنے کی کوش کیجیے جیسے انگڑائی لیتے ہیں۔ ایسا کرنے سے آپ کی عصبی نسیں متحرک ہوں گی۔ جماہیاں لینے سے بھی جسم میں خون کا دوران بڑھ جاتا ہے۔

پانی زیادہ پئیں۔ دماغ میں بھی 75 فیصدی پانی ہوتا ہے۔ یہ مقدار قائم رہنا چاہیے۔

دماغ کو متحرک رکھنے کے لیے لوگوں سے کسی بھی موضوع پر تھوڑی دیر گفتگو کرنا فائدے مند ہوتا ہے۔ دماغ کی ورزش ضروری ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا کہ معمول کے خلاف عمل کرنے سے دماغ کی ورزش ہوتی ہے اور وہ متحرک رہتا ہے، جیسے الٹے ہاتھ سے کام کرنا وغیرہ۔ ہاتھوں پیروں کو جھلانا، دوڑنا اور چہل قدمی کرنا بھی دماغ کے دونوں حصوں کی کارکردگی بڑھانے میں مفید ہوتا ہے۔ محنت والی ورزشوں کے مقابلے چہل قدمی دماغ کے لیے زیادہ مفید ہوتی ہے۔ آہستہ آہستہ چلتے وقت پیروں کے عضلات کو نہ تو غیر معمولی مقدار میں آکسیجن درکار ہوتی ہے اور نہ ہی توانائی کے لیے گلوکوز بلکہ ٹہلتے وقت دل کے تیز دھڑکنے سے دماغ کی طرف خون کا دوران تیز ہوجاتا ہے اور سانس تیزی سے چلنے کی وجہ سے آکسیجن بھی زیادہ مقدار میں دماغ تک پہنچتی ہے جس سے گلوکوز کی شکل میں اسے توانائی ملتی رہتی ہے۔

سفر کرنا بھی ایک اچھی دماغی ورزش ہے۔ ہمارے آبا و اجداد جو خانہ بدوش زندگی کے عادی تھے، انھوں نے جگہ جگہ کی خاک چھان کر اپنی دماغ صلاحیتوں میں اضافہ کیا اور ترقی کی منازل طے کیں۔

باری باری سے سیدھے اور الٹے نتھنوں سے سانس لینا بھی دماغ کے لیے مفید ہے۔ سیدھے نتھنے سے سانس لیتے وقت دماغ کا الٹا نصف اور الٹے نتھنے سے سانس لیتے وقت دماغ کا سیدھا نصف متحرک ہوتا ہے۔

بعض غذائیں بھی دماغی صلاحیتوں میں اضافے کے لیے مفید ہیں جیسے تازہ پھل اور ترکاریاں، کلہ پھوٹے ہوئے اناج کے دانے جیسے گیہوں، براؤن چاول، دالیں، پھلیاں وغیرہ۔ بادام، اخروٹ اور مونگ پھلی جو وٹامن، ای کا خاص وسیلہ ہیں دماغ کی صحت کے لیے بہت مفید ہیں۔

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ بڑی عمر دماغی صلاحیتوں کو رفتہ رفتہ کم کرتی جاتی ہے اور کبھی کبھی تو بالکل ہی ختم کرڈالتی ہے۔ یہ خیال درست نہیں ہے۔ بعض جدید دور کے ڈاکٹروں کے بموجب ایک پچیس سالہ نوجوان اور 75 سالہ بزرگ کے دماغ میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ دراصل ہمارے معاشرے میں بالخصوص برصغیر میں بزرگ خود کو عضو معطل سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ عموماً سب سے الگ اتھلگ خاموش پڑے رہتے ہیں۔ نہ تو کوئی کام کرتے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کی گفتگو اور بحث و مباحثہ میں حصہ لیتے ہیں۔ دماغی ورزشیں تو بہت دور کی بات ہے وہ تو عام جسمانی ورزشیں بھی نہیں کرتے۔ عموماً ان کی غذا بھی ناقص اور ناکافی ہوجاتی ہے۔ ایسی صورت میں دماغی انحطاط کا ایک لازمی عمل ہے اور دیکھا جائے تو اس کی اصل وجہ ان کا یہی انداز فکر ہوتا ہے۔ آسٹریلیا کے کیوینسلینڈ برین انسٹی ٹیوٹ کے سائنس دانوں کی دریافت بھی یہی ہے کہ دماغ کے خلیوں کو اگر متحرک نہ رکھا جائے تو وہ انحطاط کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ لیبوریٹری آف روکیفیلر یونیورسٹی کے شعبہ نیوروانیڈ وکرائنولوجی کے صدر ڈاکٹر بروس کہتے ہیں کہ دماغ بہت لوچدار اور جلد بحال ہوجانے والا عضو ہے۔ دماغی خلیوں سے نکلنے والی باریک شاخیں جو ڈینڈریلس (Dendrils) کہلاتی ہیں اور ہر دو خلیوں کا درمیانی فاصلہ جو سائینیپس (Synaps) کہلاتا ہے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ اگر دماغ کو متواتر انحطاط کا شکار ہونے دیا جائے تو یہ دونوں ہی متاثر ہونے لگتے ہیں یعنی سکڑنے اور شکل تبدیل کرنے لگتے ہیں اور ظاہر ہے اس صورت میں ان کی کارکردگی متاثر ہوجاتی ہے لیکن اگر دماغ کو متحرک رکھا جائے تو یہ دونوں ہی اپنی پہلی جیسی حالت کو بحال کر لیتے ہیں۔ آج پرانا نظریہ مسترد ہو چکا ہے جس کے تحت عمر کی زیادتی دماغی خلیوں کو برباد کر دیتی ہے۔ اس کے برخلاف اگر دماغ کو متحرک رکھا جائے تو بڑی عمر میں بھی دماغی خلیے صحت مند رہتے ہیں اور لوگ ذہنی طور پر مستعد اور چاق و چوبند نظر آتے ہیں۔

■

Dr. S.I. Farooqi, (Principal Scientist. (Rtd.) I.A.R.I New Delhi) D-B/1, Ahata Tablib, Gali No.1, Noor Nagar, Jamia Nagar, New Delhi - 110025

پرویز احمد

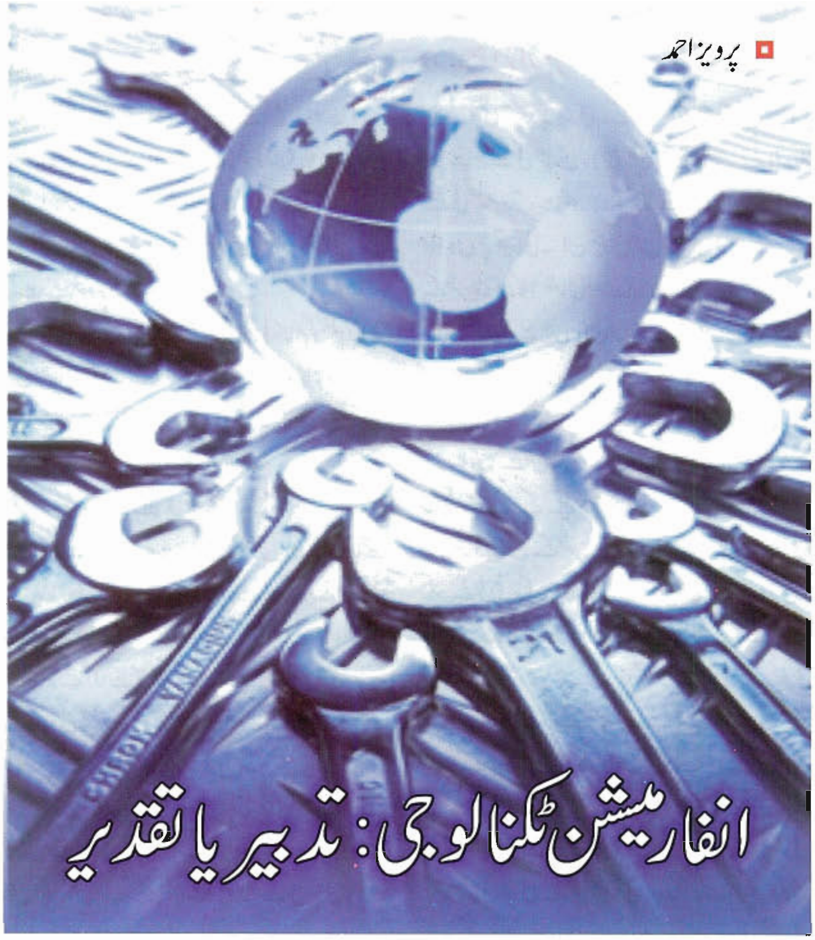

انفارمیشن ٹکنالوجی: تدبیر یا تقدیر

ہم جنگ میں شامل نہ ہوئے بس ہم نے

"... قوموں کی طاقت علم پر مبنی ہے۔ علم ہی معیشت کا محرک ہے ... اور ... ہم ... صنعتی انقلاب میں شریک نہ ہو سکے ... نتیجتاً ... وقت کی پکار کو نہ سنا تو اس عہد کے موجودہ انفارمیشن ٹکنالوجی کے انقلاب سے بھی فیضیاب نہ ہو سکے ... تو ... یہ بہت بڑا حادثہ ہوگا۔" اس قسم کے جملے ہمیں اکثر سیمیناروں، لکچروں اور تقاریر میں سننے کو ملتے ہیں۔ میں نے اس مضمون میں صنعتی انقلاب میں شریک نہ ہونے، انفارمیشن ٹکنالوجی کے انقلاب سے فیضیاب نہ ہونے اور علم سے معیشت کے رشتے کو نہ سمجھنے سے جو ہمارے سماجی نظام پر اثرات پڑے ہیں یا پڑنے والے ہیں ان کا جائزہ لیا ہے، صنعتی انقلاب کو انقلاب کیوں کہا جاتا ہے اس بات کا تجزیہ کیا ہے، ٹکنالوجی کے ارتقائی مراحل کو آنکنے کی کوشش کی ہے۔ ٹکنالوجی کے پیدا کردہ سماجی مسائل اور اس کے وہ عناصر جنھوں نے ہماری تہذیب وثقافت کے بنیادی ڈھانچے کو متاثر کیا ہے یا کرنے والے ہیں ان کی نشاندہی کی ہے۔ مضمون کے آخر میں اگلی نسل کی ٹکنالوجی کیا ہوگی اس کو سمجھنے اور اس کو حاصل کرنے کے طریقے، شرائط، ضروریات اور اس سے جڑے تعلیمی، اقتصادی و دیگر مسائل کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ اس مضمون میں بہت سے الفاظ اور اصطلاحیں عام فہم نہیں ہیں اس لیے ان کی فہرست سب سے پہلے پیش ہے تاکہ مضمون کو پڑھنے میں آسانی ہو۔

انفارمیشن: معلومات، ٹکنالوجی: فنی مہارت، انفارمیشن ٹکنالوجی: آنکڑوں سے معلومات حاصل کرنے کی فنی مہارت، پروسس: طریقہ کار، پروڈکٹس: تیار مال، پروفشنلزم: پیشہ ورانہ مہارت، Psychology: انسانی فطرت اور نفسیات کو سمجھنے کا علم، Epistemology: سائنسی ارتقا کا علم، Ethnology: مختلف انسانی سماج میں مشترک اقدار کو سمجھنے کا علم، Neurology: انسانی دماغ کی اندرونی ساخت کو سمجھنے کا علم، Cognitive Psychology: انسان کے سیکھنے اور منطقی نتیجہ اخذ کرنے کے عمل کو سمجھنے کا علم اور Pedagogics: تعلیم کے سائنسی اصول، سافٹ ویر: ہدایتوں کا سلسلہ جو کمپیوٹر انفارمیشن اخذ کرنے کے لیے کرتا ہے، نالج ٹکنالوجی: انفارمیشن ٹکنالوجی سے نالج حاصل کرنے کی ٹکنالوجی،
نالج اکونامی: انسانی ذہن اور نالج ٹکنالوجی کی بنیاد پر قائم اقتصادیات،
Interdisciplinary research: بین المضامین ریسرچ۔

مرے شجر مجھے موسم نیا بتاتے رہے

بات صنعتی انقلاب سے شروع کرتے ہیں۔ انقلاب سے مراد ہے پہلے سے رائج طور طریقوں میں بنیادی تبدیلی۔ صنعتی انقلاب سے مراد ہے رائج صناعی کے طریقہ کار میں بنیادی تبدیلی۔ صنعتی انقلاب سے قبل صناعی کے رائج طور طریقے کیا تھے؟ اس کو سمجھنے کے لیے ہمیں انسانی سماج میں ٹکنالوجی کے ارتقائی مراحل کا جائزہ لینا ہوگا۔

آگ کی دریافت کے بعد انسانی تاریخ میں ٹکنالوجیکل ڈیولپمنٹ کا پہلا باب پہیے کی ایجاد سے شروع ہوتا ہے۔ پہیے کی ایجاد سے پہلا صنعتی انقلاب رونما ہوا۔ رائج صناعی کے طور طریقوں کو پہیے کے استعمال سے بدل دیا گیا۔ ذریعۂ آمدورفت میں نمایاں تبدیلیاں ہوئیں۔ لوگ پہلے کی نسبت آسانی سے نقل مکانی کرنے لگے لہٰذا روزگار کے مواقع بھی بڑھے اور ان سے جو سماجی تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کے اثرات ہم آج تک محسوس کر رہے ہیں۔

پہلے انسانوں یا جانوروں کی توانائی سے پہیے چلائے جاتے رہے، پھر ان کو ہوا اور پانی سے حاصل شدہ توانائی سے چلایا جانے لگا۔ یہ بھی اپنے آپ میں ایک انقلابی عمل تھا لیکن جب پہیے کو آگ کی توانائی سے چلایا گیا تو پہیے اور آگ کے اس اشتراک سے جو انقلاب برپا ہوا وہ صنعتی انقلاب کہلایا، کیونکہ اس اشتراک سے جو کاریگری کے اوزار وجود میں آئے اور ان کے استعمال سے اشیا کی کاریگری میں جو مثبت بنیادی تبدیلیاں آئیں انھوں نے ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اس اشتراک نے سائنس اور ٹکنالوجی کے بہت سے راز افشا کیے اور سائنس اور ٹکنالوجی کے درمیان طرح طرح کے رشتے قائم کیے جن کی چند مثالیں ذیل میں رقم ہیں۔

- جب مختلف کاموں کے لیے مختلف دھاتوں کے پہیوں کی ضرورت ہوئی تو دھاتوں کی سائنس کے ساتھ ساتھ ان دھاتوں کو بنانے کی ٹکنالوجی بھی دریافت ہوئی جس سے Metallurgy نام کے نئے علم کی شروعات ہوئی۔

- جب مختلف ساخت کے پہیوں، مثلاً Gear وغیرہ، کی ضرورت ہوئی تو ساخت کی سائنس اور اس کو بنانے کی ٹکنالوجی وجود میں آئی اور مشین ٹول ڈیزائن جیسے علوم کی شروعات ہوئی۔
- جب ایسی مشینیں وجود میں آنے لگیں جن میں پہیے سے مخصوص کام لیا جانے والا تھا تو اس کے لیے نئے ایندھن کی دریافت ہوئی تا کہ حسب ضرورت توانائی حاصل کی جا سکے۔ اس نے ایندھن کے اجزا کی سائنس اور ان اجزا کو بنانے کی ٹکنالوجی کا جنم دیا اور ایک نئے علم کی بنیاد پڑی۔

غرضیکہ توانائی اور پہیے کے اشتراک نے طرح طرح کے نئے سائنسی اور تکنیکی علوم کو جنم دیا اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ یہ تو رہا پہیے کا چکّر اور نئے نئے علوم کی دریافت کا قصہ۔ اب ہم نئے علوم کے سماجی اثرات کا جائزہ لیتے ہیں۔

یہ تو ہر دور میں ہوتا ہے سو اب بھی ہو جائے

ہر دور میں نئے علوم کو طاقت کا ذریعہ سمجھا گیا اور اسے برتری ثابت کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ صنعتی انقلاب کو بھی اس مقصد کے لیے استعمال کیا گیا۔ اس انقلاب نے کئی طرح سے دنیا کے سماج کو متاثر کیا ہے پر سبھی کا جائزہ لینا اس مضمون میں ممکن نہیں ہے۔ یہاں اس کے جنگی پہلو کا مختصر جائزہ پیش ہے کیونکہ نئے جنگی سازوسامان اور ان سے جڑی جنگی حکمتِ عملی نے انسانی سماج کو گزشتہ دو صدیوں میں ہر طرح سے متاثر کیا ہے اور نئی دریافت شدہ انفارمیشن ٹکنالوجی اسے اور مہلک بنا رہی ہے اور انفارمیشن ٹکنالوجی کے انقلاب کے اثرات کو سمجھنے کے لیے صنعتی انقلاب کے اثرات کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

مجھے بھی وحشتِ صحرا پکار میں بھی ہوں

اب یہ کوئی راز نہیں رہا کہ صنعتی انقلاب برپا کرنے والی اقوام نے دنیا کے ہر خطے پر اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے اس انقلاب کی دین خاص طور سے جنگی سازوسامان کا استعمال کیا اور ہمارا معاشرہ بھی اس کے اثرات سے نہیں بچ سکا۔ 1857 میں اس انقلاب کا قہر پوری طرح سے ہم پر ٹوٹا۔ ہمارا پورا معاشرتی نظام درہم برہم ہو گیا۔ اس سانحے کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس کا ہر پہلو سے جائزہ لیا جا چکا ہے اور ان اسباب و وجوہات کی بھی نشاندہی کی جا چکی ہے جن کی وجہ سے ہم اس مصیبت میں گرفتار ہوئے۔ آج کسی کو بھی اس بات سے انکار نہیں ہے کہ ہمارے حریف کے جنگی آلات کی برتری اور جدید جنگی حکمتِ عملی کی وجہ سے ہمیں ذلت آمیز شکست کا سامنا کرنا پڑا اور ہمارا معاشرہ غلامی کی زنجیروں میں ایسا جکڑا کہ اس سے نجات حاصل کرنے میں ہمیں تقریباً ایک صدی کا عرصہ لگا اور آج تک ہم اس کے اثرات سے خود کو نہیں بچا پا رہے ہیں۔

مشینی جنگی آلات نے میکانائزڈ نظام کو جنم دیا جو صنعتی انقلاب کی بہت بھیانک دین ہے۔ میکانائزڈ نظام کے دو عناصر ہیں۔ ایک عنصر مشینی آلات کا نظام ہے اور دوسرا مشینی آلات کے استعمال کا نظام۔

مشینی آلات کے نظام میں ایک مشین کے آلات کے نظام سے لے کر بہت ساری مشینوں کے ایک ساتھ اور ایک دوسرے کے اشتراک سے کام کرنے والے آلات کے نظام تک شامل ہیں۔ مثلاً ایک جنگی طیارہ بہت سارے آلات کا نظام ہے، ایک اسکوڈرن بہت سارے جنگی طیاروں کا نظام ہے اور مواصلاتی نظام کے آلات طیاروں کو کنٹرول کرتے ہیں۔

مشینی آلات کے استعمال کے نظام میں ضابطۂ استعمال سے واقف باصلاحیت افراد کا عملہ اور وہ اوزار شامل ہیں جن سے مشینی آلات کی مرمت کی جاتی ہے۔ ہوائی فوج میں اس نظام میں پائلٹ سے لے کر جہازوں کی صفائی کرنے والے افراد تک شامل ہیں۔

بہتر میکانائزڈ نظام ہونے کی وجہ سے فوج یا جنگی سازوسامان سرعت کے ساتھ اور منظم طریقوں سے محاذوں تک پہنچائے جا سکتے ہیں۔ آج کل اس پورے نظام کو 'وار تھیٹر' کہا جا رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب جنگیں اک دم شروع نہیں ہوتی ہیں بلکہ پورے وار تھیٹر کی باضابطہ ریہرسل ہوتی ہے، پھر اس کے بعد جنگ شروع کی جاتی ہے۔ گویا اب برتری صرف اسلحوں کی برتری تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ اس کا دارومدار اچھے ریہرسل کرنے والے تھیٹروں پر ہے جن میں سیاسی، جنگی اور اقتصادی منصوبہ بندی کی اچھی طرح سے مشق کی جا سکے۔ ساری منصوبہ بندیوں کے بارے میں گفتگو کرنا اس مضمون میں ممکن نہیں ہے، یہاں صرف جنگی منصوبہ بندی کے وہ اہم نکات پیش ہیں جن کا تعلق براہ راست سائنس اور ٹکنالوجی سے ہے اور جسے آج کی جدید ٹکنالوجی، یعنی انفارمیشن ٹکنالوجی مزید بہتر بنانے میں بہت مؤثر طریقے سے استعمال ہو رہی ہے۔

درپئے آزار ہر موسم ہمارے ہی لیے

جنگی منصوبہ بندی کے تین اہم پہلو ہیں: (1) آلاتِ جنگ کی تیاری، (2) ان کو استعمال کرنے والے عملے کی تعلیم و تربیت اور (3) آلاتِ جنگ اور عملے کی محاذوں پر تعیناتی۔ ان تینوں میں سائنس اور انجینئرنگ کے طریقۂ کار کا استعمال ہوتا ہے۔ ظاہر ہے یہ طریقۂ کار آناً فاناً نہیں بنے ہیں۔ ان کو بنانے میں انسانی ذہانت کی صدیاں صرف ہوئی ہیں۔ یہ فطری عمل ہے اور کسی بھی فطری عمل کو پروفشنلزم تک پہنچنے کے لیے جن مراحل سے گزرنا ہوتا ہے ان میں صدیاں گزر جاتی ہیں۔ پروفشنلزم حاصل کرنے کے لیے سائنسی تھیوریز، ریاضی کے ماڈلز، درست ڈیزائن کے طریقے، ان ڈیزائن پر سختی سے عمل کرنے کی ٹریننگ اور ان ڈیزائن پر مبنی اشیا کی کوالٹی کو چیک کرنے کے مؤثر طریقے اور نہ جانے ایسے کتنے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ پروفشنلزم تک پہنچنے کے سفر کی شروعات کرافٹ سے ہوتی ہے جب ذہین نوسکھیے اندازے سے ڈیزائن بنا کر اور اٹکل سے کسی شے کو بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے اس کا پلان کسی بہت سوچی سمجھی ترکیب پر نہیں ہوتا ہے اس لیے اس میں ترقی بھی اتفاقی ہوتی ہے اور علم بھی بہت آہستہ آہستہ لوگوں تک منتقل ہوتا ہے۔ اس میں خام مال کا استعمال بھی پھوہڑ طریقے سے ہوتا ہے۔ تیار اشیا بیچنے کے لیے نہیں بلکہ ذاتی استعمال کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ کرافٹ کے بعد انہیں اشیا کو بنانے میں سائنسی طریقۂ کار استعمال ہونے لگتا ہے۔ ماہر اور ہنرمند کاریگر طے شدہ طریقے سے اشیا بنانے لگتے ہیں اور اس میں طرح طرح کی تبدیلیاں لاتے ہیں۔ اس کو بنانے اور استعمال کرنے کی ٹریننگ کے اصول ایجاد ہوتے ہیں۔ تیار اشیا کی اقتصادیات، لاگت، خام مال کی فراہمی، بنانے کے مؤثر طریقوں اور بیچنے کے نظام کے مراحل دریافت ہوتے ہیں۔ آخر میں پڑھے لکھے ایسے پروفشنلز تیار کیے جاتے ہیں جو پورے عمل کا سائنسی تجزیہ کر سکتے ہیں اور نئی نئی تھیوری دے کر اشیا کو بنانے کے عمل کو مزید پختہ اور پیشہ ورانہ کرتے ہیں۔

یہاں پر میں ایک مثال علم الکیمیا سے دینا چاہوں گا جس کا مقصد کرافٹ سے پروفشنلزم تک کے سفر کی مزید وضاحت ہے۔ کیمیکل انجینئرنگ کا عمل کرافٹ کی شکل میں تقریباً 1300 میں الکوحل کی دریافت سے شروع ہوا۔ 1700 میں پیڑ پودوں سے صابن بنایا گیا۔ اس کے بعد 1775 میں فرانسیسی اکادمی نے alkali

بنانے کے طریقۂ کار کو دریافت کرنے کے لیے انعام کا اعلان کیا۔ گویا کہ اب سے صناعی کا عمل شروع ہوا اور اس کا تجارتی عمل 1823 سے شروع ہوا جب alkali بنانے کی صنعت کی بنیاد پڑی۔ با ضابطہ سائنسی عمل 1774 سے شروع ہوا جب آکسیجن کو الگ کیا گیا، 1808 میں ایٹمی تھیوری شائع ہوئی، 1887 میں عملی طریقۂ کار کی نشاندہی کی گئی اور 1992 میں polymerization کو بیان کیا گیا اور پروفشنل انجینئرنگ کا درجہ اسے 1915 میں ملا جب کیمیکل بنانے والی یونٹ کو آپریٹ کر کے دکھایا گیا اور اس کے بعد یہ عمل بڑے پیمانے پر 1994 سے شروع ہو جب Du Pont نے بڑا کارخانہ لگایا۔ اس مثال سے مراد یہ ہے کہ صنعتی انقلاب چند سالوں میں برپا نہیں ہوا بلکہ اس میں صدیاں لگیں۔ اور صدیوں کی ریاضت کا صلہ وہ پختہ عملی طریقہ کار ہے جس سے جس طرح کی اشیا ہم چاہتے ہیں بنا لیتے ہیں۔ آگے مضمون میں صنعتی انقلاب کی ٹکنالوجی کو ہم روایتی ٹکنالوجی کے حوالے سے بیان کریں گے۔

یہ دیکھنا ہے کرن کس طرف سے گزرے گی

صنعتی انقلاب کے بعد انفارمیشن ٹکنالوجی انسانی تاریخ میں تیسرا ٹکنالوجیکل انقلاب برپا کر رہی ہے۔ انفارمیشن ٹکنالوجی کے پروڈکٹس گزشتہ کی سبھی ٹکنالوجی کے پروڈکٹس سے مختلف ہے۔ دونوں کے پروڈکٹس کو بنانے کے عوامل بھی بالکل مختلف ہیں۔ روایتی ٹکنالوجی کے سبھی پروڈکٹس مادی اور مرئی ہیں کیونکہ ان کو ہم دیکھ سکتے ہیں ہیں۔ لیکن انفارمیشن ٹکنالوجی کے پروڈکٹس منطقی اور غیر مرئی ہیں۔ انفارمیشن ٹکنالوجی کے پروڈکٹس کو سوفٹ ویئر کہا جاتا ہے جو ایک منطقی مشین ہے۔ یہ منطقی مشین نظر نہیں آتی ہے اس کے وجود کو ہم اس وقت محسوس کرتے ہیں جب یہ کام کر رہی ہوتی ہے۔ ذیل میں انفارمیشن ٹکنالوجی اور روایتی ٹکنالوجی کے پروڈکٹس کی صفات کا موازنہ پیش ہے تاکہ دونوں میں تفریق کرنے میں آسانی ہو۔

انفارمیشن ٹکنالوجی کے پروڈکٹس کی صفات	روایتی ٹکنالوجی کے پروڈکٹس کی صفات
منطقی مشین	مادی مشین و دیگر اشیا
ماحولیاتی تبدیلی سے خراب نہیں ہوتی ہے	ماحولیاتی تبدیلی سے خراب ہوتی ہے
غیر مرئی	مرئی
نہایت پیچیدہ	کم پیچیدہ
بہت آسانی سے ردّ و بدل ممکن	ردّ و بدل بہت مشکل

اس موازنے سے صاف ظاہر ہے کہ انفارمیشن ٹکنالوجی کے پروڈکٹس کی صفات روایتی ٹکنالوجی کے پروڈکٹس کی صفات سے بالکل مختلف ہیں اس لیے ان کی صناعی بھی بنیادی طور پر مختلف ہے۔ انفارمیشن ٹکنالوجی کے پروڈکٹس اور ان کی صناعی میں بنیادی فرق کی وجہ سے اسے انسانی تاریخ کا تیسرا ٹکنالوجی کا انقلاب کہا جانے لگا ہے۔ ذیل میں انفارمیشن ٹکنالوجی کے صحیح معنی کو بیان کیا گیا ہے۔ اس ٹکنالوجی کی افادیت یا اس کے اثرات کو سمجھنے کے لیے اس کے صحیح معنی سمجھنا ضروری ہے۔

گھر ہی تبدیل کرو کچھ تو نیا ہو جائے

انفارمیشن ٹکنالوجی میں دو الفاظ ہیں: ایک انفارمیشن اور دوسرا ٹکنالوجی۔ اس کو سمجھنے کے لیے ہمیں دونوں لفظوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے لفظ انفارمیشن کو لیتے ہیں۔ انفارمیشن کو اطلاع یا معلومات کہتے ہیں۔ یہاں پر انفارمیشن کو آنکڑے کے تناظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ آنکڑہ اعداد کا سلسلہ ہوتا ہے جو کسی حقیقت کو ظاہر کرتا ہے اور آنکڑے میں پوشیدہ حقیقت سے مطلوب معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر کسی مضمون میں طلبا کے امتحان کے آنکڑوں سے معلومات حاصل کرنا چاہیں تو بہت ساری معلومات حاصل کر سکتے ہیں جیسے ہم سب سے ذہین طالب علم کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ اس عمل کے لیے آنکڑوں کی فہرست میں سے سب سے بڑے آنکڑے کے ساتھ اس طالب علم کا نام منسوب کرنا ہوگا جس نے امتحان میں سب سے زیادہ نمبر پائے ہیں۔ اس چھوٹی سی مثال سے یہ ظاہر ہے کہ انفارمیشن آنکڑوں اور کسی تصور کے بیچ تعلق قائم کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً امتحان کے آنکڑوں میں سب سے بڑے آنکڑے اور اس کو حاصل کرنے والے طالب علم کے نام کے ساتھ تعلق قائم کرنے سے اس مضمون میں سب سے ہونہار طالب علم کے بارے میں معلوم ہوا۔ اس اطلاع کو حاصل کرنے کے لیے جو مرحلہ وار عمل کیا گیا وہ انفارمیشن ٹکنالوجی کا ایک عنصر ہے۔ اس کو سوفٹ ویئر کہتے ہیں۔ انفارمیشن ٹکنالوجی کا دوسرا عنصر ہارڈ ویئر ہے۔ ہارڈ ویئر الکٹرانک سرکٹس کا مجموعہ ہوتا ہے جب کہ سافٹ ویئر وہ مرحلہ وار ہدایتیں ہوتی ہیں جو ہارڈ ویئر کو استعمال کر کے آنکڑے سے انفارمیشن اخذ کرتی ہیں۔ ان معنوں میں انفارمیشن ٹکنالوجی ہارڈ ویئر اور سوفٹ ویئر بنانے اور ان کے استعمال سے آنکڑوں سے انفارمیشن اخذ کرنے کی تدبیر ہے۔

بدن کے بحر میں کیا کیا بلائیں ہیں خدا جانے

انفارمیشن ٹکنالوجی کے سسٹم کا موازنہ ہم انسانی دماغ سے کر سکتے ہیں جس میں مغز ہارڈ ویئر ہے اور سوچنے سمجھنے کا عمل سافٹ ویئر۔ موجودہ سوفٹ ویئر آنکڑوں کے جوڑ توڑ میں انسانوں سے بہتر ہیں لیکن وہ نہ تو حادثاتی مراحل اور ان دیکھے حالات سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور نہ ہی نتائج کو انسانی دماغ کی طرح منظم کر سکتے ہیں۔ لیکن کوشش جاری ہے کہ ایسے سافٹ ویئر بنائے جا سکیں جو ہر وہ کام کر سکیں جو ایک انسان کا ذہن کر سکتا ہے۔ اس کے لیے Psychology، Neurology، Ethnology، Epistemology، Cognitive Psychology اور Pedagogics جیسے علوم کے ریسرچ کے نتائج کو استعمال کرنے کی کوشش ہو رہی ہے اور سوفٹ ویئر کو ذہین سے ذہین تر بنانے کی مسلسل کوشش ہو رہی ہے۔ ایسا اس لیے ہو رہا ہے کہ روایتی ٹکنالوجی سے تیار شدہ گونگی، بہری، اندھی اور بے دماغ مشینوں کو آواز، سماعت اور بصارت دی جا سکے، ان کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دی جا سکے اور ان کو قوتِ لمس اور قوتِ شامہ دی جا سکے۔ ان کوششوں کے کچھ نتائج اسمارٹ بم جیسے مہلک ہتھیار اور کمپیوٹرائزڈ جنگی نظام (جو کمان اینڈ کنٹرول سنٹر کو چلانے میں معاونت کرتا ہے) کی شکل میں حالیہ فیصلہ کن جنگوں میں نظر آئے ہیں۔ ہمارے پاس ان سے بچنے کا کوئی چارہ نہیں ہے۔ المیہ یہ ہے کہ ابھی ہم روایتی ٹکنالوجی کے اثرات سے نکل بھی نہیں پائے ہیں کہ انفارمیشن ٹکنالوجی کے اس عفریت نے ہمیں آ دبوچا ہے۔

اب کے ہنگامہ نئی طرح ہوا ہے آغاز

یہ ہمارے لیے لمحۂ فکریہ ہے کہ گزشتہ کی سبھی ٹکنالوجی کے برعکس یہ ٹکنالوجی جو 1950 میں ایک کرافٹ کی شکل میں نمودار ہوئی اور نصف صدی ہی میں ایک پختہ ٹکنالوجی بن گئی اور اتنے کم عرصے میں اس ٹکنالوجی نے جو اثرات مرتب کیے ہیں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ یہ انسانی تاریخ کا تیسرا ٹکنالوجیکل انقلاب ہے۔ اگر ہم اس ٹکنالوجی کے انقلاب سے فیضیاب نہیں ہو سکے تو ہمارا انجام پہلے سے بھی برا ہوگا۔ اس سے پہلے ہم صرف ایک صدی تک ہی غلام رہے مگر اس بار عجب نہیں کہ غلامی ہی ہمارا مقدر بن جائے۔

لمحۂ آئندہ میری دسترس میں کیوں نہیں؟

یہاں پر میں چند حقائق آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں جن سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ ہم نے اس ٹکنالوجی کو اس وقت اپنی گرفت میں کرنا چاہا تھا جب یہ کرافٹ کی شکل میں تھی۔ 19 دسمبر 1968 کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ طبیعات کے قابلِ احترام پروفیسر رئیس احمد مرحوم کی سفارش پر یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے ایک کمیٹی تشکیل کی جس کا کام ایک کمپیوٹر خریدنے کے امکانات کا جائزہ لینا تھا۔ مارچ 1970 میں اس کمیٹی نے اپنی سفارشات یو. جی. سی کو بھیجیں جو منظور کر لی گئیں اور اپریل 1971 میں IBM 1130 نام کا کمپیوٹر درسگاہ نے خرید لیا اور ایک کمپیوٹر سنٹر وجود میں آیا۔ اس کمپیوٹر سنٹر کے بارے میں 22 اکتوبر 1971 میں یو. جی. سی کی وزیٹنگ کمیٹی نے سفارش کی کہ یہ کمپیوٹر سنٹر صرف سروس سنٹر ہی نہ رہے بلکہ یہ ایک اکاڈمک ڈیپارٹمنٹ کی طرح کام کرے۔ کمپیوٹر سائنس کے کورسز پڑھائے اور ریسرچ کا کام کرنے کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی اسٹاف کو جدید ریسرچ اور ٹیچنگ کے طریقہ کار جن میں کمپیوٹر کا استعمال لازمی ہو اس کی ٹریننگ بھی دے۔ اس کے بعد اس زمانہ ساز ٹکنالوجی کا کیا حشر ہوا اس باب میں تو فقط یہی کہا جاسکتا ہے، بہرحال ایک موقع ہم نے گنوا دیا۔

ہمارے پاؤں الٹے تھے فقط چلنے سے کیا ہوتا
بہت آگے گئے لیکن بہت پیچھے نکل آئے

وہ مملکت کی اَنا کو بڑھائے جاتا ہے

بات ہو رہی تھی انفارمیشن ٹکنالوجی کے اثرات کی۔ اس مختصر سے عرصے میں اس ٹکنالوجی نے دنیا کو ایک عالمی گاؤں بنا دیا ہے اور دنیا کو چھ طبقات میں بانٹ رہی ہے۔ پہلا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو اس ٹکنالوجی کے موجد ہیں اور ہر روز اس میں نت نئی سوچ کا اضافہ کر رہے ہیں۔ دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو ان کی سوچوں کو سمجھتے ہیں اور اس کی بنیاد پر نئے نئے انفارمیشن ٹکنالوجی کے پروڈکٹس ڈیزائن کرتے ہیں۔ تیسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو ان ڈیزائنس کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اس کے بلو پرنٹس سے پروڈکٹس بناتے ہیں۔ چوتھا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو ان پرڈکٹس کو استعمال کرتے ہیں۔ پانچواں طبقہ ان لوگوں کا ہے جو ان پروڈکٹس کے صرف تماشائی ہیں اور چھٹا طبقہ ان لوگوں کا ہے جن کو معلوم ہی نہیں ہے کہ کچھ ہو بھی رہا ہے یا نہیں۔

آج پہلے تین طبقات کے لوگ آقا کی حیثیت رکھتے ہیں اور آخری تین طبقات کے لوگ غلام کی۔ گویا یہ ٹکنالوجی ہم کو غلامی کی زنجیریں پھر سے پہنا رہی ہے۔ کیا ہم ان غلامی کی زنجیروں سے خود کو محفوظ رکھ سکتے ہیں؟ میں سمجھتا ہوں ایسا ممکن ہے لیکن اس کی شرائط بہت سخت ہیں۔

ابھی امکان کے صفحے بہت خالی ہیں دنیا میں

ابھی انفارمیشن ٹکنالوجی کا سفر صرف نصف صدی کا ہے۔ ابھی وقت ہے کہ ہم اس ٹکنالوجی کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ لیکن اس کے لیے ہمیں انفارمیشن ٹکنالوجی کی تعلیم کے نظام اس طرح درست کرنا ہوگا کہ اس کی باگ ڈور صحیح کمپیوٹر سائنٹسٹس کے ہاتھ میں ہو۔ اس کی تعلیم و ترقی کے لیے الگ کالج بنانا ہوگا جس میں کمپیوٹر سائنس، کمپیوٹر انجینئرنگ، کمپیوٹر اپلی کیشنز، انفارمیشن سسٹمس، انٹلی جنٹ سسٹمس، کمپیوٹر ٹکنالوجی جیسے الگ الگ شعبے ہوں تاکہ ہر سطح پر تعلیمی اور تدریسی کام ہو سکے۔ کمپیوٹر اپلی کیشن کے کورسز پر کمپیوٹر سائنس کے کورسز کو ترجیح دینی ہوگی کیونکہ اپلی کیشن کے کورسز صرف کنزیومر پیدا کرنے کے لیے ڈیزائن کیے گئے ہیں۔ انفارمیشن ٹکنالوجی میں ایڈوانس ڈگری پروگرام شروع کرنا ہوگا۔ نئے نئے ہارڈ ویئر بنانے کی صلاحیت حاصل کرنی ہوگی۔ اپنا آپریٹنگ سسٹم (وہ سافٹ ویئر جو کمپیوٹر ہارڈ ویئر کو چلاتا ہے) بنانا ہوگا۔ اپنی پروگرامنگ لینگویج بنانی ہوگی۔ ایسے انٹلی جنٹ سسٹمس بنانے کی کوشش کرنی ہوگی جو آنکڑوں سے انفارمیشن اور انفارمیشن سے نالج حاصل کر سکیں۔

سبھی کے اپنے مسائل ہیں اپنی تدبیریں

یاد رہے ابھی تک صرف آنکڑوں سے انفارمیشن حاصل کرنے کی ٹکنالوجی پر ہی کام ہو رہا ہے۔ ابھی انفارمیشن سے نالج حاصل کرنے پر کام بہت ہی ابتدائی مراحل میں ہے۔ انفارمیشن ٹکنالوجی کے ماہروں کا کہنا ہے کہ مستقبل کا دور Knowledge Economy (نالج اکونامی) کا دور ہوگا، کیونکہ نالج سے دولت کمانا بہت منافع بخش اس لیے ہوگا کہ اس میں توانائی کا استعمال بہت ہی کم ہوگا۔ اس میں صرف انسانی ذہن کا استعمال ہوگا اس لیے جس ملک کے پاس اچھی نالج اکونامی کی ورک فورس ہوگی وہ دنیا کی قیادت کرے گا۔ نالج اکونامی کی اچھی ورک فورس تیار کرنے کے لیے ہمیں Interdisciplinary ریسرچ سنٹرس بنانے ہوں گے تاکہ Interdisciplinary کورسز وقت پڑنے پر ڈیزائن کیے جاسکیں اور پڑھائے جاسکیں۔ میرے اندازے کے مطابق اگر ہم آج اس میں صحیح افرادی قوت کے ساتھ عملی قدم اٹھائیں تو ہم نالج ٹکنالوجی میں اپنا مقام بنا سکتے ہیں کیونکہ جو ممالک انفارمیشن ٹکنالوجی میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں ان کو بھی تقریباً 20 سے 25 سالوں کا عرصہ لگے گا نالج ٹکنالوجی کو پوری صنعت بنانے میں:

جو عالم ایجاد میں ہے صاحبِ ایجاد
ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ!

■

Dr. Pervez Ahmad, Head Society of Muslim Computer Scientist and Computer Professions, 10 Alig Shopping Complex, Shamshad Market, Aligarh UP

تبصرہ وتعارف

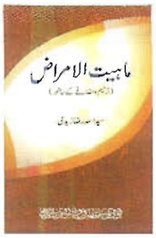

ماہیت الامراض (ترمیم واضافہ کے ساتھ)

مصنف: سید اسد رضا زیدی
صفحات: 286، قیمت: 60 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: وسیم احمد، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، کوٹیگیپالیہ، مگڈی روڈ، بنگلور

زیرِ تبصرہ کتاب طب یونانی کے انتہائی اہم موضوع ماہیت الامراض جس کو علم الامراض بھی کہتے ہیں، پر مشتمل ہے، طب کے اغراض و مقاصد صحت کی حفاظت اور ازالۂ مرض سے بحث ہے۔ بیماریوں کا مطالعہ اور ان کی تشخیص، اسباب (Causes) اور علامات (Signs & Symptoms) پر منحصر ہے۔ دراصل اسباب وعلامات ایسی بنیاد ہیں جو مرض کی وجودی حیثیت پر غماز ہیں، جنھیں علم الامراض سے موسوم کیا گیا ہے۔ اسباب و علامات کے تعلق سے نئی ریسرچ و تحقیق نے گرانقدر اضافے کیے ہیں، جس سے امراض کی تشخیص اور اس کے تدارک میں اہم مدد ملی، قدیم علم الامراض جہاں خلطی اور مادّی تصور پر قائم ہے وہیں جدید علم الامراض صرف اعضا کے ٹوٹ پھوٹ اور ان سے رونما ہونے والی تبدیلیوں پر ملتفی ہے، یہی وجہ ہے کہ قدیم اور جدید کے مابین ایک حد فاصل نمایاں ہے۔ چنانچہ پریشانی اس وقت بڑھ جاتی ہے جب یونانی کالجز سے فارغ ہونے والے طلبہ و طالبات میدان عمل میں قدم رکھتے ہیں تو انھیں وجع المفاصل جیسے مرض کے علاج ومعالجے میں بہت زحمت اٹھانی پڑتی ہے کیونکہ اطبائے قدیم نے اس کی ماہیت کو خلطی اور مادّی اعتبار سے سمجھا اور لکھا ہے مثلاً وجع المفاصل دموی، بلغمی، صفراوی، سوداوی، ریحی اور مدّی وغیرہ چنانچہ اطبائے متقدمین نے اس کی Underlying Pathology کے مطابق اس کا تدارک اور علاج قائم کیا ہے یعنی منضجات، مسہلات، مبردات، مقویات اور مسکنات وغیرہ۔ لیکن جب خالص جدید علم الامراض کو بنیاد بنا کر علاج ومعالجے کا تعین کیا جاتا ہے تو کم ہی مریضوں میں شفائے کلّی ممکن ہو پاتی ہے، ایسا اس لیے ہے کہ دونوں کے نظریات میں کافی کچھ تضاد ہے اس لیے اطبائے قدیم نے معالجاتی پہلو کو خالص طبّی ماہیت المرض کو بنیاد بنا کر قائم کیا تھا نہ کہ جدید نظریات ان کی اساس اور بنیاد ہیں۔

انگریزی زبان میں جدید ماہیت المرض کے موضوع پر لکھی گئیں کتابیں معدودے چند ہیں، جن میں ایک قلمی شاہکار ڈاکٹر محمد غفران کا ہے، چونکہ اس خاص موضوع پر تمام یونانی کالجز کے اساتذہ اور طلبہ انگریزی زبان میں لکھی گئیں کتابوں سے مستفید ہوتے رہے اس لیے شروع سے ہی یہ خاص ایریا بے توجہی اور عدم التفات کا شکار رہا ہے، فاضل مصنف کا یہ قلمی شاہکار پہلی بار 1996 میں منظر عام پر آیا، اس کا دوسرا ایڈیشن اپنی گوناگوں اور متنوع صفات کے ساتھ آپ سب کے سامنے ہے، فاضل مصنف نے سی سی آئی یم نصاب کے مطابق تمام توجہ طلب پہلوؤں کو جگہ دی ہے نیز زبان عام فہم اور سلیس ہے، دوران مطالعہ کہیں کہیں رکاوٹ اور خالص ترجمانی معلوم ہوتی ہے۔ مصنف نے موضوعات کو تدریجی انداز میں اٹھایا ہے یعنی ان کا یہ سفر عمومی ماہیت الامراض (General Pathology) سے ترتیب وار ماہیت الامراض (Systemic Pathology) کے طرز پر مربوط ہے اور یہ طبّی شاہکار اپنے اندر موجود سارے ہی مضامین کا احاطہ (تعریف، تقسیم، اسباب وعلل مع عوارضات) کیے ہوئے ہے، کہیں کہیں موضوعات کی تقسیم کافی طویل ہے۔ لہٰذا مصنف نے اس کو باقاعدہ جدول کی شکل میں پیش کر کے اس کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے مثلاً اقسام سلعات بلحاظ ساخت، یرقان کی تینوں قسمیں لیب میں کی گئیں مختلف جانچوں کے درمیان تفریق وغیرہ۔ اس کے علاوہ تمام طبّی اصطلاحات کی توضیحات کا اضافہ ہے جو جدید اردو سے ناواقف طلبہ کے لیے موزوں اور مفید ہے۔ کتاب کے آخر میں اصطلاحات کا ایک انوکھا باب (chapter) قائم کیا ہے، جس میں ممکنہ تمام بیماریوں کی اصطلاحات مع انگریزی کے درج ہے جو ایک قابل قدر کوشش ہے۔

چونکہ یہ کتاب انڈر گریجویٹ طلبہ کے لیے سی سی آئی ایم نصاب کے مطابق لکھی گئی ہے، لہٰذا مستند انگریزی کتب کا بدل تو نہیں ہو سکتا مگر BUMS طلبہ کے لیے ممکنہ حد تک مفید ہوگی، نیز اس سطح کے طالب علموں کو انگریزی کتب سے کسی حد تک بے نیاز کر سکتی ہے، اس کے علاوہ علاج ومعالجے سے وابستہ اردو داں طبقے کے لیے بھی بیماریوں کو طب جدید کے نقطہ نظر سے دیکھنے اور سمجھنے میں یہ کتاب مفید ہوگی۔ پہلی اشاعت پر نظر ثانی اور ترمیم واضافے کے لیے ڈاکٹر سید اسد رضا زیدی شکریہ کے حقدار ہیں۔ انھوں نے جس احساس ذمے داری اور مہارت فن کے ساتھ اس عظیم کام کو بروئے کار لائے ہیں اس سے علم الامراض کے میدان میں کام کرنے والوں کو ترغیب وتحریص کے لیے نت نئے تجربات کی راہیں ہموار اور منور ہوں گی۔

یہ کتاب حسن باطنی کے ساتھ ساتھ حسن ظاہری سے بھی آراستہ وپیراستہ ہے اور طباعت کا اعلیٰ معیار پیش کرتی ہے، ہمیں یقین ہے کہ یہ علمی دنیا میں ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔

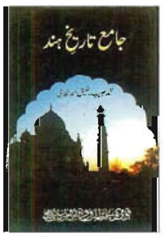

جامع تاریخ ہند

مصنف: محمد حبیب۔ خلیق احمد نظامی
صفحات 1000، قیمت -/222 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 25
مبصر: عبد الصبور جی 50 ابوالفضل انکلیو پارٹ 1، جامعہ نگر اوکھلا نئی دہلی 25

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے بنیادی مقاصد میں اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم وادب کے شائقین تک پہنچانا بھی شامل ہے اور اس پروگرام کے تحت قومی کونسل نے اپنی تشکیل کے فوراً بعد سے اب تک مختلف علوم وفنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو بعض نقائص کے باوجود کسی حد تک اہل علم کی ضرورتوں کی تکمیل کرتی ہے۔ دراصل یہ کتاب اس بڑے پروجیکٹ کا ایک حصہ ہے جس کا خواب

آزادی سے قبل ماہرین تاریخ نے دیکھا تھا اور انڈین ہسٹری کانگریس میں اس منصوبے پر عمل آوری کا لائحہ عمل طے کیا گیا تھا۔

انڈین ہسٹری کانگریس نے 1940 میں اپنے لاہور کے سیشن میں جدید ترین تحقیقات پر مبنی 'جامع تاریخ ہند' (A Comprehensive History of India) کی تیاری اور بارہ جلدوں میں اس کی اشاعت کا فیصلہ کیا تھا تاکہ وہ ہندوستانی تاریخ کے طلبہ کے لیے ایک حوالہ کی کتاب کی حیثیت سے کام آسکے لیکن سیاسی اور تاریخی پس منظر اس قدر بدلا کہ یہ پروجیکٹ اس کا شکار ہو گیا لیکن عرصۂ دراز تک اس پروجیکٹ پر عمل آوری تعطل کا شکار رہی ماہرین تاریخ کی انتھک کوششوں اور محنتوں اور قارئین کے کافی انتظار کے بعد جب اس بڑے پروجیکٹ کے کچھ حصے منظر عام پر آئے تو ان کی خاطر خواہ پذیرائی بھی ہوئی۔

زیر بحث کتاب 'تاریخ ہند' کے سلسلے کی پانچویں کڑی ہے۔ اس سے قبل چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس جلد کا خاکہ انڈین ہسٹری کانگریس کی کمیٹی نے مرتب کیا تھا۔ جب اس کی میٹنگ علی گڑھ میں 1943 میں ہوئی تھی۔ ابتداً کمیٹی کا منصوبہ یہ تھا کہ دہلی سلطنت کے ہر شاہی خاندان پر ایک ایک باب ہو اور ہر صوبے کے شاہی خاندانوں کے لیے ایک باب ہو لیکن فراہم شدہ تاریخی مواد کی کثرت اصل منصوبے کے ردوبدل کا سبب ہوئی اور ابواب کو کئی فصلوں میں منقسم کرنا پڑا لیکن مرتبین کی عرق ریزی نے اس کتاب کو تاریخ کے طلبہ و اساتذہ کے سامنے ہندوستانی تاریخ کی اہم تبدیلیوں اور ترقیوں سے بھری تقریباً چار صدیوں پر محیط مستند تاریخ پیش کر دی۔

یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب ایشیائی ماحول ہے گرچہ ایشیا کی تاریخ نویسی اس کتاب کے دائرۂ عمل سے باہر ہے لیکن ہندوستان کی تاریخ ہمارے شمال اور شمال مغرب کے ممالک سے وابستہ ہے۔ لہٰذا اسلام کے عروج سے لے کر بابر کے عہد تک ان ممالک کے ایک عام جائزے سے اس جلد کا آغاز کیا گیا تاکہ ہندوستانی اور ایشیائی تاریخ کے ارتقا کو زیادہ وسیع تناظر ''Wider Perspective'' میں دیکھا جا سکے۔

دوسرے ابواب اس طرح ہیں۔ دہلی سلطنت کی بنیاد، دہلی کے ابتدائی ترک سلاطین، خلجی خاندان، تغلق خاندان، سید خاندان، لودی خاندان۔ ان ابواب کے عنوانات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ سلطنت مغلیہ کی پوری تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس کتاب کو ہر اعتبار سے مکمل اور جامع بنانے میں اصل ماخذ تک پہنچنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔

اس کتاب کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس کو محمد حبیب اور خلیق احمد نظامی نے تیار کیا ہے۔ یہ دونوں نہ صرف یہ کہ اعلا پائے کے مورخ تھے اور ہندوستانی تاریخ اور تاریخ کے مصادر پر گہری نظر رکھتے تھے بلکہ اردو زبان پر بھی قدرت رکھتے تھے اور اس قدرت کا اظہار ان کی درجنوں ان تصانیف میں ہوتا رہا ہے جو اس پروجیکٹ کے علاوہ ان کے نجی علمی منصوبوں کے طور پر سامنے آ چکے ہیں چنانچہ تاریخ جیسے موضوع کو اردو کے قالب میں پیش کرتے ہوئے جو ایک بڑی دشواری بالعموم پیش آتی ہے، کہ تاریخ کی اصطلاحات کے قرار واقعی متبادل کی جستجو بیش تر مورخین و مترجمین کو ان کے مقصد میں پوری طرح کامیاب نہیں ہونے دیتی، اس کا احتمال بھی اس کتاب میں بہت کم ہے چنانچہ یہ کتاب نہ صرف یہ کہ تاریخ کے طلبہ کے لیے بے پناہ اہمیت رکھتی ہے بلکہ اردو زبان کے ان شائقین کے لیے بھی بیش بہا تحفہ ہے جو اس زبان میں مختلف علوم و فنون کی کتابیں یا تو ملتی نہیں یا ملتی ہیں تو وہ کتابیں اس فطری حسن سے عاری ہوتی ہیں جو طبع زاد تحریروں کا خاصہ ہوتا ہے۔

دوسرے یہ کہ ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ ہمارے مورخین نے آزادانہ کم اور اپنی ترجیحات کی روشنی میں زیادہ کیا ہے۔ جس میں چند فرقوں کی خدمات اور تاریخی فتوحات کو بہت سے تعصبات کی روشنی میں کم کر کے دیکھنے اور دکھانے کا رویہ حاوی رہا ہے۔ محمد حبیب اور خلیق احمد نظامی ہمارے ان مورخین میں سے ہیں جن کے بارے میں یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ ان مسائل کو نہایت معروضیت اور باریک بینی سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے چنانچہ اس کتاب میں ان تعصبات کی پرچھائیاں بھی نہیں ملیں گی جو انگریزی حکومت کے منصوبے کے تحت ہمارے بہت سے مورخین کی کتابوں میں کبھی دانستہ تو کبھی نادانستہ طور پر راہ پاتی رہی ہیں۔ چنانچہ اس کتاب کو قومی اردو کونسل کا ایک قیمتی تحفہ کہہ سکتے ہیں، اور قومی کونسل کو اس قسم کی کتابوں کی مزید اشاعت پر زیادہ سے زیادہ توجہ دینی چاہیے کیوں کہ اس ادارے کا قیام انھیں مقاصد کے لیے عمل میں آیا تھا۔

اس کتاب کا اسلوب بیان سادہ اور دلکش ہے، پروف ریڈنگ کی غلطیاں کم ہیں۔ صاف ستھری طباعت اور دیدہ زیب گیٹ اپ نے ظاہری حسن میں بھی اضافہ کر دیا ہے۔ امید ہے کہ اسے اہل ذوق حضرات پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے۔

مغلیہ سلطنت کا عروج و زوال

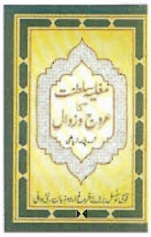

مصنف: آر پی ترپاٹھی، مترجم: ریاض احمد خاں شروانی
صفحات: 583، قیمت: 118 روپے
رابطہ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: عطاء الرحمٰن قاسمی، N-80/C، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی 25

پیش نظر کتاب 'مغلیہ سلطنت کا عروج و زوال' 21 ابواب پر مشتمل ہے جس کے فاضل مصنف آر پی ترپاٹھی ہیں۔ اگرچہ کتاب میں صاحب کتاب کے حالات زندگی اور ان کے علمی کمالات کا ذکر نہیں ہے۔ مگر اس کتاب کے معیار تحقیق و تدقیق اور استنباط و استدلال سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف تاریخ کے اسکالر ہیں ان کو مغلیہ سلطنت کی عمومی تاریخ پر گہری نظر اور قدیم و جدید منابع و مآخذ پر کامل دسترس ہے۔ سب سے خاص بات یہ ہے کہ مغربی مصنّفین و مورخین کے خیالات و تحقیقات کے اسیر ہونے کے بجائے قدیم عربی و فارسی مصادر و آثار پر ہی انحصار کرتے ہیں۔ اور حقائق و واقعات کو صحیح روپ میں پیش کرتے ہیں۔ خود ان کا خیال ہے کہ صحت بیان ہی تاریخ کا اصل جوہر ہے اور اس کی خاطر وقائع کو بغیر کسی آمیزش اور رنگینی کے سیدھے سادے واضح اور پر روز طریقے سے بیان کر دینا ہی ایک ایماندار مصنف کا اصل کارنامہ ہے۔

دراصل یہ کتاب مصنف کے پندرہ سالہ مطالعات و مشاہدات کا نچوڑ ہے، مصنف نے مسلم حکمرانوں کے جنگی کمالات و مہارتوں کو بیان کرنے کے ساتھ، ان کی علم پروری و علم دوستی کا بھی کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔

پیش نظر کتاب میں وسط ایشیا کے اہم تاریخی مقامات، اماکن، مثلاً سمرقند، بخارا، کاشغر، ختن آذربائجان، مرغیان اور فرغانہ کے سیاسی و جغرفیائی تحفظ و بقا اور ثقافتی و تمدنی حالات کے ساتھ افغانستان و ایران کے قدیم تمدنی جلوے بھی پیش کیے گئے ہیں اور ان خطوں اور ان کی سرحدوں پر وقتاً فوقتاً رونما ہونے والی معرکہ آرائیوں اور خانہ جنگوں میں علاقائی عصبیت و سیاسی رقابت، تہذیب و ثقافت کے تحفظ و بقا کا جذبہ بھی پہلو بہ پہلو موجود ہے۔ اس کتاب کے اکثر ابواب اہم سیاسی و معاشی اور ثقافتی و تجارتی مسائل و مباحث اور عروج و زوال اور ترقی و انحطاط کے اسباب و محرکات پر محیط ہیں۔

باب اول میں سلطنت مغلیہ کے بانی و موسس ظہیر الدین محمد بابر کے خاندانی حالات اور اس کے آبا و اجداد کے حالات زندگی اور ذاتی اوصاف و کمالات کا بھی بڑا دلچسپ ذکر ہے۔

مصنف آر، پی ترپاٹھی نے بابر کے دادا شیخ حسین بایقرا کی افتادِ طبع اور رومانی مزاج کا ذکر کیا ہے۔ جو بڑا ہی جنگجو اور جفاکش تھا۔ جس کے آئینہ میں خود بابر کی شخصیت بھی ابھر کر سامنے آتی ہے۔

بابر میں باپ کی جملہ طبعی خصوصیات موجود تھیں وہ باپ ہی کی طرح مے خوار اور جنگجو تھا، وسائل کے فقدان کے باوجود ہمہ وقت پا بہ رکاب رہتا۔ سخت سے سخت معرکہ آرائیوں میں کود پڑنے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ گو کبھی ہارتا، کبھی جیتتا مگر ہمت نہیں ہارتا ہر وقت مست و مگن رہتا۔ اس باب میں بابر کے ذاتی اخلاق و کردار کے بیان کے ساتھ اس کی نثر نگاری، شاعری، مثنوی نگاری، خطاطی، باغبانی، شجر کاری، فن معماری اور فن موسیقی کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ وہ فارسی اور ترکی زبان کا قادر الکلام شاعر اور نثر نگار تھا۔ بابر نے اپنے شاہزادے کامران کے لیے ایک مثنوی لکھی تھی، جس کا نام مثنوی مبین ہے۔ اس میں دو ہزار اشعار ہیں جن میں دینی، قانونی و اخلاقی مضامین بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ بابر نے مشہور بزرگ خواجہ عبیداللہ احرارؒ کے رسالہ والدیہ کا ترکی زبان میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ مزید برآں علم عروض پر بھی ایک فنی کتاب لکھی ہے۔

تزک بابری تو شہرہ آفاق کتاب ہے ہی، بابر نے ایک اچھوتا خط بھی ایجاد کیا تھا۔ جسے خط بابری کہتے ہیں۔ اس کتاب میں اس کے علمی کارناموں پر اچھی خاصی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے تجربات و مشاہدات نے ہندوستان میں خربوزہ اور انگور کی جنس کو بہتر سے بہتر بنانے میں بہت مدد کی ہے، بابر کو فن معماری میں اس قدر دلچسپی تھی کہ اس کی خواہش تھی کہ راجپوتانہ کی سرحد پر ایک ٹھنڈی رہائشی عمارت (ایر کنڈیشن مکان) تعمیر کرائے مگر اس کی خواہش کی تکمیل نہ ہو سکی۔ البتہ اس کی ہدایت پر آگرہ، سیکری، بیانہ، دھولپور، گوالیار، کول (علیگڑھ) اور دوسرے شہروں میں عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ بیانہ میں ایک پہاڑ کو تراش کر ایک شاندار و پرشکوہ مسجد بھی تعمیر کی تھی۔

مصنف جہاں ہمایوں کے اخلاق و کردار سے متاثر ہیں وہاں ہمایوں کے بھائیوں کی شورش پسندی اور جاہ طلبی پر بے حد برہم و خفا نظر آتے ہیں۔ مصنف کا خیال ہے کہ شورش پسند امرا سے کہیں زیادہ خطرناک وہ شہزادے تھے، جن کی رگوں میں شاہی خون موجزن تھا۔ مصنف نے ہمایوں کی حکمت عملی، اس کی جنگی تدبیروں کی تحسین کی ہے اور اس کی فتوحات کا بھی ذکر کیا ہے۔

پانچویں باب میں شیر شاہ سوری کی جائے پیدائش، فیروزہ جسے اب نارنول بھی کہتے ہیں جس کو تاریخ میں مساجد و مقابر کا شہر کہا جاتا ہے۔ یہاں کے سیاسی و ثقافتی حالات پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ فرید خاں نے شیر کو مار کر شیر خاں کا خطاب حاصل کیا تھا اس کا بھی ذکر ہوا ہے، فرید خاں مشہور بہ شیر شاہ کی جنگی قابلیت اور انتظامی صلاحیت پر بھی سیر حاصل بحث ہوئی ہے اور شیر شاہ کی ہمایوں سے جنگوں اور جھڑپوں کا ذکر بھی دلچسپ اور عبرت انگیز ہے۔ اسی باب میں اسلام شاہ کا بھی ذکر ہوا ہے۔ مصنف شیر شاہ کے فلاحی کاموں سے خوش نظر آتے ہیں۔

آٹھویں باب سے پندرہویں باب تک صرف اکبر بادشاہ کے حالات زندگی، سیاسی نظریات، مذہبی معتقدات اور ان کی فتوحات کا ذکر ہے۔ ان ابواب میں اکبر کی نوخیز عمری میں تخت نشینی، پانی پت کی پہلی اور دوسری جنگ، بیرم کی برطرفی، فتح مالوہ، خواجہ معین الدین چشتیؒ کی درگاہ کی زیارت، ادھم خاں کی موت، یاتری ٹیکس کا خاتمہ، جزیہ کا خاتمہ، چتوڑ کا محاصرہ، رنتھمبور کی فتح، بہار و بنگال کی فتح، ہلدی گھاٹی کی لڑائی، فتح سندھ، فتح اڑیسہ، ابوالفضل کا قتل، اکبر کا اضطراب، سلیم کی بغاوت اور اکبر کی موت وغیرہ مسائل زیر بحث آئے ہیں۔

آخر کے ابواب میں جہانگیر کی نور جہاں سے شادی، جہانگیر کی تاجپوشی، خسرو کی بغاوت، سکھ مذہب، مصالحت، سرحدی مسائل اور بغاوتوں کا ذکر ہے۔ انھیں ابواب میں شاہ جہاں کی تاجپوشی سے دوسری بندیلا جنگ کے حالات درج ہیں اور شاہ جہاں کی تعمیرات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مغلیہ سلطنت کے عروج و زوال کے بنیادی سبب اجتماعی عدل کا فقدان اور معاشی عدم توازن تھا۔ مصنف نے ان تمام ابواب میں سلطنت کے عروج و زوال پر بڑا معروضی تجزیہ پیش کیا ہے۔ غرضیکہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے شائع ہونے والی کتابوں میں ایک اہم تاریخی و ثقافتی کتاب ہے۔ جو یقیناً علمی و ادبی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اور قومی کونسل کی شہرت و ناموری کا باعث ہوگی۔

منزل بہ منزل

مصنف: سید مبارک علی
صفحات: 208، قیمت: 114
ناشر: سید مبارک علی، ممبئی والی چال، کولی واڑہ، کلیان
مبصر: محمد شمیم اختر، عبدل پور، رفیع گنج، اورنگ آباد، بہار

زیر تبصرہ کتاب منزل بہ منزل (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) میں کل سولہ مضامین شامل ہیں اور زیادہ تر مضامین شاعری سے تعلق رکھتے ہیں جن میں فن شاعری اور علم عروض کے مختلف پہلوؤں پر ناقدانہ نگاہ ڈالی گئی ہے۔ خاص طور پر شاعری میں علم عروض کی اہمیت پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ ان میں شعر یا نظم کی تخلیق کے لیے علم عروض کی اہمیت و ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ ان میں مصنف نے بہت حد تک موضوع سے انصاف کرنے کی سعی کی ہے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہیں جس سے کسی فنکار یا فن پارہ کا مثبت اور غیر جانب دار مطالعہ سامنے آتا ہے۔ "تقطیع مشکل گذار مرحلہ ہے جو ژرف نگاہی اور ریاض چاہتا ہے ورنہ صحیح کلام کی غلط تقطیع سے شاعر قصوروار ٹھہرے گا۔" شعر یا نظم کی اصل بنیاد وزن ہی ہے اور بغیر وزن و قافیہ کے کسی نظم و شعر کا تصور نہیں کیا جاسکتا ہے۔

اپنے پہلے مضمون 'روپ رباعی کے' میں مصنف نے رباعی کے فن پر گفتگو کرتے ہوئے اس کی ایجاد، اس کی عروضی ساخت اور رباعی کے اوزان کی تعداد پر ناقدانہ نگاہ ڈالی ہے۔ صنف دوہا سے متعلق تین مضامین شامل کتاب ہیں جن میں 'دوہا'، 'دوہا اور عروضی میزان' اور 'اردو دوہے: ایک تنقیدی جائزہ پر ایک نظر' میں دوہے کی انفرادیت، دوہے کی تاریخ، دوہا چھند، دوہا چھند اور عروض، دوہے کے بحر اور اوزان، دوہے کی قسمیں اور اس کی تقطیع کے حوالے سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

غزل کی تنقید سے متعلق مضمون 'آزاد غزل: تجربہ کا ایک اور قدم' کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ آزاد نظم اور آزاد غزل کے بحر و وزن میں سہو سے شعر کی روح مجروح ہوتی ہے۔ آج کل کی شعری اصناف میں جو بے ہنگمی اور بدنظمی کا بازار گرم ہے اس کی پاداش میں ارکان بحر کے شکست و ریخت کے مصنف قائل نہیں ہیں۔ مصنف نے نظم اور غزل کے اوزان اور ان کے متعلقہ بحر پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ایک مضمون طنز و مزاح پر ہے۔ اپنے اس مختصر مضمون میں مصنف مزاحیہ شاعری پر بے توجہی کو اس کی ترقی میں رکاوٹ بتاتے ہیں۔ چنانچہ مزاحیہ شاعری وہ فروغ نہ پا سکی جیسا کہ اس کا حق ہے۔ اگر مزاحیہ شاعری دوسرے درجے کی ہے تو یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ اردو میں اب تک پہلے درجے کا ادب لکھا ہی نہیں گیا۔ اب تک شاعری کو تنقید حیات سے تعبیر کیا جاتا ہے طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں تنقید حیات کی گنجائش سب سے زیادہ ہے طنزیہ اور مزاحیہ شاعری پر

خلوص تنقید حیات ہے اس لیے مزاحیہ شاعری کی بھی اپنی جگہ وہی اہمیت ہے جو سنجیدہ شاعری کی ہے۔ اس کے علاوہ 'عروض اور غالب' اور 'غالب علم الاعداد کی روشنی میں' کے عنوان سے جو مضامین شامل کتاب ہیں وہ بالکل منفرد نوعیت کے ہیں۔ ان میں غالب کی غزلوں کا عروضی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور اشعار کی تقطیع کے ذریعے غالب پر ناقدین کی رائے کی نفی کی گئی ہے۔ جن لوگوں میں موزونیت فطری طور پر پائی جاتی ہے وہ بلا تکلف شعر کہتے ہیں اور کسی علمی اور فنی ضرورت کی محتاجی محسوس نہیں کرتے لیکن یہ طرز فکر گمراہ کن ہے۔ مان لیں کہ عروضی واقفیت کسی شخص کو شاعر نہیں بنا سکتی لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ عروضی واقفیت اور شعور کے بغیر بڑے سے بڑا شاعر مشکل اور پیچیدہ بحروں میں بے نقص و بے عیب شعر نہیں کہہ سکتا۔ اگر شعر پرکھنے کا اس قسم کا میزان نہ ہو تو کوئی شعر افراط و تفریط کے اثر سے خالی نہ ہوگا اور شعر میں بے راہ روی پیدا ہو جانے کے امکانات وسیع ہو جائیں گے۔ یہاں اس نکتے پر بحث ہے کہ عروضی شعور بہت ضروری ہے اور ہم کسی طرح عروض کی اہمیت کو نہیں گھٹا سکتے۔ مرزا غالب کا جہاں تک تعلق ہے وہ شہرۂ آفاق شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین عروضی شعور رکھتے تھے اور عروض کی اہمیت کا انھیں بخوبی اندازہ تھا۔ مرزا غالب تقطیع کو شعر کا لباس قرار دیتے ہیں۔ مرزا نے اپنی فکری صلاحیت اور موضوع فکر کی مناسبت سے انھیں بحروں کا انتخاب کیا جو ان کی طرز ادا کی متحمل تھیں اور ان کے انداز فکر و سخن کو بخوبی سمو سکتی تھیں۔ فکر کی کامیاب ادائیگی کے لیے بہر حال ضروری ہے کہ صحیح بحر کا انتخاب کیا جائے۔ در اصل اسی انتخابی شعور پر شاعر کی کامیابی اور ناکامی منحصر ہے۔

گیان چند کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ ان کا شمار برصغیر کے چند اہم عروضیوں کے ساتھ ساتھ ماہر لسانیات اور ادیب و نقاد میں ہوتا ہے۔ وہ ہندستان گیر شہرت کے مالک تھے۔ مصنف نے اپنے ایک مضمون میں ڈاکٹر گیان چند کے عروضی گیان کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے اور اس میں عروض اور پنگل کے متعلقہ تمام گوشوں پر مدلل بحث کی ہے جس کے سبب یہ مضمون خاصا طویل ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ اپنے ایک مضمون میں نثار احمد ایلوی کی کتاب 'برق نیم شب' جو رباعیات اور سانیٹ جیسی دشوار گزار اصناف سخن کا مجموعہ ہے پر نہایت پر مغز اور جامع تبصرہ کیا ہے۔ کتاب ہذا کا آخری مضمون 'آسماں پہچانتا ہے' کا سرسری جائزہ ہے۔ 'آسماں پہچانتا ہے' ڈاکٹر مشتاق انجم کا مجموعۂ کلام ہے۔ آج کل اردو شاعروں کے شعری مجموعے بکثرت شائع ہو رہے ہیں جہاں شاعری کے معیار کا کوئی پیمانہ نہیں ہے مگر ڈاکٹر مشتاق انجم کا مجموعہ الگ قدر و منزلت کا حامل ہے۔

کتاب کی طباعت عمدہ ہے۔ پروف ریڈنگ کی غلطیاں کافی ہیں اگر اسے نظر انداز کر دیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ عروضی معلومات کے اعتبار سے یہ کتاب نہایت کارآمد اور مفید ثابت ہوگی۔ اس موضوع پر معدودے چند کتابیں ہی دستیاب ہیں اس لیے فن شاعری اور علم عروض سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کسی نایاب تحفے سے کم نہیں۔

لکھنؤ: کچھ ماضی کچھ حال

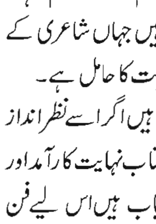

مصنف: رضوان احمد فاروقی

صفحات: 128، قیمت 100 روپے

ملنے کا پتہ: عارف علی انصاری، بک سیلر،
لطیف مارکیٹ، خیرآباد، ضلع سیتاپور (یوپی)

مبصر: عبدالناصر C-24، اوکھلا وہار، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

اپنے وطن کی مٹی سے ذہنی قربت ایک مستحسن فعل ہے اور رضوان احمد فاروقی کا تعلق چونکہ سرزمین لکھنؤ سے ہے اس لیے اپنی ذاتی مصروفیات کے باوجود انھوں نے اس علاقے کے صحافی اور شعرا کرام کا مختصر تذکرہ کرنا مناسب سمجھا۔ اگرچہ معاصر ادبا اور شعرا کے حالات زندگی اور روزمرہ کی مصروفیات پر کچھ بھی لکھنا آسان نہیں اور اس میں ہر لمحے بدگمانی پیدا ہونے کا خدشہ بھی رہتا ہے۔ لیکن یہاں مصنف کا کمال یہ ہے کہ وہ بڑی خوش اسلوبی سے ان سارے مقامات سے گزر گئے اور کہیں بھی بدگمانی کی بو پیدا نہیں ہوئی۔

اس کتاب میں بیسویں صدی کی اہم شخصیات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جن کی تعداد 200 سے زائد ہے۔ ان میں پہلے صحافیوں کا ذکر ہے۔ بعد ازاں شعرا و ادبا کا ذکر آیا ہے۔ پہلے حصے کی شروعات 'میرا کادمی' کے صدر، شاعر و ادیب پدم شری مقبول احمد لاری کے نام نامی سے ہوئی ہے۔ پھر دیگر شخصیتوں کا ذکر ہے جو صحافت سے وابستہ رہے ان میں سے چند اہم نام حیات اللہ انصاری، قیصر تمکین، منظر سلیم، احمد ابراہیم علوی، احمد جمال پاشا، عشرت علی صدیقی، عثمان غنی، جمیل مہدی، حفیظ نعمانی، سید اختر الملک، شمس بھارتی، صالح عبداللہ، محمد وصی اللہ حسینی اور غلام حسنین فاروقی کے ہیں۔ یہاں ان صحافیوں کا مختصر ذکر کہیں نصف صفحے پر محیط ہے تو کہیں یہ کم ہو کر تین چار سطور میں سما گیا ہے۔

دوسرے حصے میں شعر و ادب کی دنیا کا ذکر کیا ہے، جن میں شعرائے کرام کے ساتھ شاعرات کا بھی ذکر ہے۔ ان میں تسنیم فاروقی کا نام سرفہرست ہے جو تقریباً 13 چھوٹی بڑی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی شناخت کا ذریعہ بننے والے ایک شعر کو بھی درج کیا ہے:

بہت مشکل ہے نازک جسم والو سب کو خوش رکھنا
کئی ہاتھوں میں رہنے سے کھلونے ٹوٹ جاتے ہیں

دیگر شعرا میں چند اہم نام اس طرح ہیں۔ رفعت شیدا صدیقی، خالد فتح پوری، شکیل گیاوی، تجسس اعجازی، قادر صدیقی اور سعید اختر نظامی ہیں۔ ساحل عارفی کا ایک شعر جو کافی مشہور ہوا ہے۔ وہ یہاں نقل کیا گیا ہے:

سیم و زر کی چادروں میں عیب سارے ڈھک گئے
مفلسی بے عیب ہوکر، عیب ہی کہلائے ہے

اس کے علاوہ نجے مصرا شوق، خلیل الحسن، عبدالقیوم فرقت، بشارت لکھنوی، عبرت صدیقی، معراج ساحل، ذوالنورین رہبر، یقین فیض آبادی، سلیم تابش، مقیم دانش، بدر وارثی، حیات وارثی، شمس فرخ آبادی، والی آسی، منور رانا، خوشبیر سنگھ شاد، کرشن بہاری نور، حامد اللہ عمر لکھنوی، عمر انصاری، راہی پرتاپ گڑھی، رباب رشیدی، مشتاق پردیسی، عرفان عباسی، سعید رہبر، جسٹس آنند نرائن ملا، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، سعادت حسن علی صدیقی، شفاعت علی صدیقی، پروفیسر شارب ردولوی، ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی، مولانا شمس تبریز، مولانا آغا روحی اور جاوید ملک زادہ ہیں۔

شاعرات میں چند اہم نام عزیز بانو داراب وفا، شاہ جہاں بانو یاد دہلوی، برکھا رانی، مدھو اریما سنگھ، ڈاکٹر نسیم نکہت، ڈاکٹر رخسانہ، نکہت لاری، ام ہانی، صبیحہ ناز لاری، فاطمہ و سید جائسی، سلمیٰ حجاب، عائشہ صدیقی، ڈاکٹر شیمہ رضوی اور آصفہ زمانی وغیرہ ہیں۔

اس مختصر سی کتاب میں مصنف کو اس بات کا زبردست احساس ہے کہ یہ ایک طویل مضمون ہے۔ یہاں شامل تمام حضرات کی ترتیب کا بھی خیال نہیں رکھا گیا بلکہ جس انداز میں انھیں یاد آتا گیا وہ ان کو یکجا کرتے چلے گئے حالانکہ مراتب کا خیال رکھنا از بسکہ ضروری تھا۔ پھر بھی تیز رفتاری کی اس دنیا میں جتنا مصنف سے ہو سکا وہ اپنی جگہ قابل ستائش ہے۔ مستقبل میں اگر کوئی مصنف سرزمین اودھ کی ادبی تاریخ مرتب کرنا چاہے تو اس کے لیے ایک اشاریہ کا کام دے سکتا ہے۔ اس سے زیادہ کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

علی سردار جعفری (ترمیم واضافہ شدہ ایڈیشن)

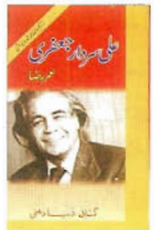

مصنف: عمر رضا
صفحات: 544، قیمت: 500
ناشر: کتابی دنیا، نئی دہلی 6
مبصر: امتیاز وحید، D-50/17 حجاب اسلامی،
ابوالفضل انکلیو، اوکھلا، نئی دہلی 25

یہ کتاب اولاً 2008 میں شائع ہوئی تھی۔ بعد ازاں 2011 میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ یہ ایڈیشن بعض ضروری حذف واضافہ کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے۔ حالیہ ایڈیشن میں ضمنی باب کے بطور شامل 'سردار جعفری' کو نکال دیا گیا ہے۔ موضوعات کی ترتیب میں بھی ردوبدل کیا گیا ہے اور تفصیلی فہرست کی جو کمی پہلے ایڈیشن میں رہ گئی تھی اس ایڈیشن میں اس کی بھرپائی کردی گئی ہے۔ اس اعتبار سے زیر نظر ایڈیشن میں مطلوبہ توازن کے ہدف کو کلیتاً پورا کرنے کی شعوری کوشش کارفرما ہے۔

کتاب 'علی سردار جعفری' بنیادی طور پر ترقی پسند تحریک کے ایک بنیاد گزار، ادبی مفکر اور مبلغ کا مفصل سوانحی مطالعہ ہے جو علی سردار جعفری کی پوری ادبی وفکری زندگی کو غیر جانبدارانہ انداز میں پیش کرتی ہے۔ یہ علی سردار جعفری کی پیدائش سے لے کر وفات اور مابین عہد کی ادبی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں کا ادبی وتنقیدی محاسبہ ہے۔ محاسبہ ان معنوں میں کہ نقد وتنقیح کا جو پیمانہ اس سوانحی مطالعہ کے لیے مقرر کیا گیا ہے وہ شخصی پسند وناپسند سے بالاتر ہے اور جب 'غیر جانبداری' نقد وتنقید کی شاہ کلید ہو تو پھر جانبداری اور یک رخے پن کا گزر نہیں ہوتا بلکہ حسن وقبح ترازو کے دو متوازی پلڑے میں رکھے جاتے ہیں۔ زیر تجزیہ کتاب میں مطالعہ کی یہی معروضیت روا رکھی گئی ہے جو عصری ادب میں نقد وتنقید کا پیمانہ ہے۔ عمر رضا نے مرور ایام کے ساتھ علی سردار جعفری کی ادبی وفکری زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور تضادات کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے مثلاً جواہر لعل نہرو کے تئیں علی سردار جعفری کے رویہ کا تضاد واضح کرتے ہوئے آزادی سے قبل ان کی عقیدت اور مابعد آزادی ان کی نفرت کو ان کے تخلیقی شواہد کی روشنی میں طشت از بام کیا ہے۔ ترقی پسند تحریک کی نظریاتی شدت اور توازن کے دونوں عرصے میں علی سردار جعفری کے متضاد رویوں کا فرق واضح کیا ہے۔ تحسین وتائید کی صورت میں کوشش کی ہے کہ معروضیت برقرار رہے اور تحسین وتائید وکالت نہ بننے پائے۔

ایک مخصوص سوانحی سیاق میں یہ کتاب بیسویں صدی کی ادبی اور تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ ترقی پسند ادبی تحریک کے تعلق سے جو معلوم دستاویزی حقائق روایتاً علمی حوالوں میں درج کی جاتی ہیں اس حوالے سے بھی عمر رضا کی تحقیقی کدوکاوش نے انحراف کی روش اختیار کی ہے مثلاً سجاد ظہیر وغیرہ نے 1935 میں لندن سے ترقی پسند ادبی تحریک کا جو سائکلو اسٹائل منشور ہندستان روانہ کیا تھا اور جو 'ہنس' کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ خلیل الرحمان اعظمی کی مقبول کتاب 'اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک' میں یہ اکتوبر 1935 کے حوالے سے مندرج ہے جبکہ عمر رضا نے تلاش بسیار کے بعد پایا کہ منشور 'ہنس' کے جنوری 1936 کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ لہٰذا محقق کے یہاں اس کا حوالہ شواہد کی روشنی میں جنوری 1936 ہی قرار پایا۔

عمر رضا کی یہ سوانحی کتاب نہ صرف سردار جعفری کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑتی بلکہ اس عہد کے ادبی ماحول، افکار وخیالات، ادبی مجالس اور نظریات، ان میں رونما ہونی والی تبدیلیاں، سماجی، سیاسی اور ثقافتی رویے اور سردار جعفری کے فکر وشعور کے سیاق میں ترقی پسند ادبی تحریک کے مجموعی تحریکی رویوں، عقل وفکر اور لائحہ عمل کو بھی سامنے لاتی ہے۔ بنیادی مآخذ کا جو اضافہ زیر نظر ایڈیشن میں کیا گیا ہے اس سے براہ راست سردار جعفری کی شخصی جہتیں، امیال وعواطف کے ساتھ ان کے تفاعل نقد پر بھی لکھنے کی نئی سمت ہموار ہوئی ہے۔ جامعات میں خود سردار جعفری کی زندگی میں کچھ مقالے تحریر کیے گئے تاہم بعد از مرگ ترقی پسند ادبی تحریک کے کسی سرخیل کے حوالے سے علمی، تحقیقی اور معروضیت کے معیار پر عمر رضا کی یہ علمی کاوش بطور خاص یہ حالیہ ایڈیشن ایک اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

امید قوی ہے کہ عمر رضا کا سہل اور رواں انداز بیاں جو علمی مقالوں کے مزاج سے عموماً مختلف ہوتا ہے، عام قاری، طلبہ اور اس راہ کے جویا کو بہت سے علمی فیصلوں اور حقائق کی توثیق میں معاون ہوگا۔

اردو تنقید میں اختر اورینوی کی خدمات

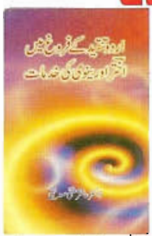

مصنف: ڈاکٹر عامر مصطفیٰ صدیقی
صفحات: 192، قیمت: 200 روپے
رابطہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 6
مبصر: فردوس بانو فلاحی
شاہین باغ، نئی دہلی 110025

علم وادب اور اشاعت کی دنیا میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے جن بے شمار مصنفین کو حلقۂ ادب وعلم میں متعارف کرایا ان میں ایک نام ہزاری باغ (جھارکھنڈ) کے ڈاکٹر عامر مصطفیٰ صدیقی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ونوبھا بھاوے یونیورسٹی ہزاری باغ (جھارکھنڈ) کے شعبۂ اردو میں صدر ہیں۔ مذکورہ تصنیف 'اردو تنقید کے فروغ میں اختر اورینوی کی خدمات' ان کا تحقیقی مقالہ ہے جو پانچ ابواب 'ادب خصوصاً' تنقید میں اختر اورینوی کا نقطۂ نظر' باب دوم 'اختر اورینوی کی نگارشات' باب سوم ''ممتاز اردو نقادوں سے اختر اورینوی کا موازنہ' باب چہارم 'اختر اورینوی کا اسلوب' اور باب پنجم کے تحت حرف آخر اور کتابیات ہیں۔

اختر اورینوی دبستان عظیم آباد کے ایک ہونہار ادیب تھے، جن کی انفرادیت اور شناخت فکشن نگاری کی ہے تاہم اختر اورینوی یک فنے نہیں ہیں بلکہ اردو دنیا میں افسانہ وناول نگار کے علاوہ ڈرامہ نویس وتنقید نگار کی حیثیت سے بھی ان کی شہرت ہے۔ 'کسوٹی' ان کا پہلا تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں چودہ مضامین شامل ہیں اور یہ کتاب 243 صفحات کو محیط ہے۔ 'منظر وپس منظر'، 'کلیاں اور کانٹے'، 'انار کلی اور بھول بھلیاں'، 'سمنٹ اور ڈائنامائٹ' اختر اورینوی کے افسانوی مجموعے ہیں 'شہنشاہ حبشہ' اور 'زوال کیٹن' اورینوی کے ڈرامے ہیں۔ 'شہنشاہ حبشہ' کی حیثیت تاریخی ہے جب کہ ان کا ناول 'حسرت تعمیر' اردو ناولوں کے امتیازی مقام رکھتا ہے۔ اختر اورینوی نثر نگاری کے میدان میں ایک مقام تو رکھتے ہیں وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ انھوں نے نظمیں بھی کہیں ہیں اور غزلیں بھی۔ ان کی شاعری میں مقامی رنگ وبو بھی ہے اور آفاقی فکر وخیال بھی۔

ڈاکٹر عامر مصطفیٰ صدیقی کا مزاج تنقیدی ہے۔ اسی لیے انھوں نے اختر اورینوی کی ایک خاص سمت نقد کو اپنی تحقیق کے لیے منتخب کیا اور اورینوی کی تنقیدی خدمات کا تجزیہ کیا۔ اولاً انھوں نے اختر اورینوی کے تنقیدی افکار ونظر کا مطالعہ ومحاکمہ کیا ہے۔ یہ بحث صفحہ 21 تا 38 کو محیط ہے۔ ادب اور تنقید کا تعلق براہ راست تعبیر حیات، مطالعہ کائنات اور تفسیر ذات سے ہے۔ اختر اورینوی کا مزاج اسلامی فکر وفلسفے اور اسلامی تنقید حیات سے ہم آہنگ ہے لہٰذا اس بحث میں عامر مصطفیٰ صدیقی نے اورینوی کے ادب و

تنقید اور افکار ونظریات پر گفتگو کی ہے اور اقتباسات نقل کیے ہیں، نیز ان کے افادی پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔

دوسرے باب میں ڈاکٹر عامر نے اختر اور ینوی کی نگارشات کو موضوع بحث بنایا ہے۔ اس ضمن میں 'کسوٹی'، 'تنقید جدید'، 'تحقیق وتنقید' کے تمام مضامین کا فرداً فرداً تجزیاتی مطالعہ کیا ہے اور اختر اور ینوی کے اسلوب وتنقیدی نظریے کا محاکمہ پیش کیا ہے۔ یہ بحث کافی طویل ہے۔ بعد ازاں باب سوم کے تحت 'ممتاز اردو نقادوں سے اختر اور ینوی کا موازنہ' کے موضوع پر گفتگو ہوئی ہے۔ یہ بحث کتاب کی اساسی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں عامر صدیقی نے بڑی دقت نظر کا ثبوت دیا ہے اور اختر اور ینوی کا موازنہ اردو کے معروف ومقبول نقاد، کلیم الدین احمد، احتشام حسین، آل احمد سرور اور مجنوں گورکھپوری سے کیا ہے۔ برسبیل تذکرہ پر، نظیر، حالی، شبلی، آزاد، اکبر، اقبال، جوش، ڈاکٹر عبدالحق، عبدالرحمٰن بجنوری، عبدالقادر سروری، محی الدین قادری، رشید احمد صدیقی کے اقتباسات اور ان کے نظریات سے موازنہ کیا ہے اور خود اختر اور ینوی کے تنقیدی نظریے کو اجاگر کیا ہے۔ اس باب میں دوران بحث عامر صدیقی نے کلیم الدین احمد کو نظر خاص نمایاں کرنے کی کوشش کی اور ان کے کارناموں کا مطالعہ وسعت کے ساتھ کیا ہے۔ حالی، شبلی، آزاد اور سرور کے موازنے میں کلیم الدین احمد کی ذہنی وفکری سطح کو کہیں ارفع ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بحث بھی کافی طویل ہے۔

آخری بحث 'اختر اور ینوی کا اسلوب' ہے۔ اس کے تحت عامر صدیقی نے اسلوب کی تعریف بیان کی ہے۔ نیز نظیر، انیس، داغ، اقبال، غالب، سرسید، نیاز اور ابوالکلام آزاد وغیرہ کے اسلوب کی مثال کے ساتھ اختر اور ینوی کے اسلوب پر بحث کی ہے اور ادب میں ان کی انفرادیت وشناخت پر روشنی ڈالی ہے اور 'کسوٹی' سے اقتباس بھی پیش کیا ہے۔ یہ گفتگو صرف سات صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد باب پنجم کے تحت حرفِ آخر کے نام سے سات صفحات پر مشتمل تحریر ہے جس کے شروع میں اختر اور ینوی کے تنقیدی نظریات سے متعلق احتشام حسین کے چند جملے نقل کیے گئے ہیں۔ آخر میں آٹھ صفحات کی کتابیات ہے۔ کتاب اغلاط سے پاک نہیں ہے تاہم پھر بھی تنقید ادب میں ایک اضافہ ہے۔

انشائیہ کے فنی سروکار

مرتب: ڈاکٹر احمد امتیاز

صفحات: 328، قیمت: 250

ناشر: ایم آر پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: ڈاکٹر علاء الدین خاں، شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی-7

صنف انشائیہ کے سلسلے میں بحث وتمحیص کا سلسلہ ایک طویل عرصے سے جاری ہے۔ اس زاویے سے کئی مضامین بھی رسالے میں وقفے وقفے سے منظر عام پر آتے رہے ہیں لیکن باضابطہ طور پر کتابی شکل میں ان مضامین کو یکجا کرنے کی طرف ڈاکٹر احمد امتیاز نے جو قدم بڑھایا ہے وہ لائق ستائش ہے۔ پوری کتاب 26 مضامین پر مشتمل ہے جس میں قدیم وجدید دونوں طرح کے لکھنے والوں کو شامل کیا گیا ہے تاکہ صنف انشائیہ کے سلسلے میں اول تا آخر جس طرح کے خیالات ابھرتے رہے اس کا کچھ اندازہ ہو سکے مثلاً جہاں ایک طرف وزیر آغا جیسے بزرگ ادیب کے مضامین شامل ہیں وہاں سلیم آغا قزلباش جیسے نئی نسل کے لوگوں نے بھی اس صنف کے سلسلے میں جو خیالات ظاہر کیے ہیں اسے بھی شامل کتاب کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ نظیر صدیقی، حامد برگی، احمد حسین آزاد، سلیم اختر، مشکور حسین یاد، عرش صدیقی، اطہر پرویز، جمیل آذر، انور سدید وغیرہ کے بھی انتہائی پُر مغز مضامین شامل ہیں۔

دیباچہ کے تحت 9 صفحات پر مشتمل اوراق میں انھوں نے اول سے لے کر آخر تک صنف انشائیہ نے جس طرح عہد بہ عہد پیر جمایا اور آج جس مقام پر ہے ان تمام باتوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

مرتب کے نزدیک بعض لوگوں کا یہ خیال کہ وزیر آغا انشائیہ کے موجد ہیں درست نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے قبل سرسید نے مضمون نگاری یا انشائیہ نگاری کا آغاز کیا تھا پھر محمد حسین آزاد کا 'نیرنگ خیال' ہے جس میں تخیل وتمثیل کے ذریعے انھوں نے اپنے تخلیقی جوہر پیش کیے ہیں۔

مزید دوسرے دور میں عبدالحلیم شرر، سجاد انصاری، مہدی افادی، میر ناصر علی، خواجہ حسن نظامی، فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، مولانا ابوالکلام آزاد، احمد شاہ پطرس بخاری، فلک پیما، کرشن چندر، کنہیا لال کپور، نے انشائیے کی سرزمین کو جس طرح سرسبز وشاداب بنایا ان سب کی عطا کا اعتراف کیا گیا ہے اور ہندوستان وپاکستان کے ناقدین کے یہاں ان لوگوں کو نظر انداز کرنے کا جو رویہ ملتا ہے اسے ڈاکٹر احمد امتیاز نے نادانی قرار دیتے ہوئے اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ کوئی بھی صنف یکا یک وجود میں نہیں آتی بلکہ اس کے وجود میں آنے سے قبل پورا پس منظر اس کے لیے زمین ہموار کرتا ہے۔ لہٰذا مرتب کے نزدیک سرسید کے زمانے میں انشائیہ صنف عہد طفلی میں تھی۔ پھر رشید احمد صدیقی کے زمانے میں بلوغت کو پہنچی اور رفتہ رفتہ وزیر آغا تک آتے آتے اپنے پورے خدوخال کے ساتھ ہم پر منکشف ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ جدید انشائیوں میں اسلوب کی تازہ کاری اور فکر کی آزادہ خرامی نے ایسی صورت پیدا کر دی ہے کہ آج یہ صنف دوسری زبانوں میں موجود انشائیوں کے مدمقابل بڑے ہی پُروقار انداز میں کھڑی ہوسکتی ہے۔

ڈاکٹر احمد امتیاز کے نزدیک یہ ایک المیہ ہے کہ انشائیہ جیسی زرخیز صنف پر پاکستان میں تو چند لوگوں نے توجہ دی بھی لیکن ہندوستان میں سرے سے اسے نظر انداز کر دیا گیا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ غیر افسانوی نثر کی جتنی بھی صورتیں ہیں مثلاً سوانح، خودنوشت اور خاکہ نگاری کی بھی یہی صورت حال ہے۔

آخر میں احمد امتیاز نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ چاہیے تو یہ تھا کہ ایسی صورت حال میں انشائیہ نگاری پر باضابطہ کوئی کتاب تحریر کی جاتی لیکن اس سے قبل یہ ضروری تھا کہ انشائیہ کے فن پر جو مضامین رسائل اور کتابوں میں منتشر ہیں انھیں یکجا کر کے کتابی شکل میں لایا جائے تاکہ اس صنف نثر کی طرف اہل قلم حضرات کی توجہ مرکوز ہو سکے۔

کتاب میں شامل مضامین میں انشائیہ کے فن، نظریاتی مباحث، اس کی ابتدا وارتقا، اس کے مبادیات ومسائل اور اس کی اہمیت وافادیت پر جس طرح نظیر صدیقی، حامد برگی، احمد حسین آزاد، سلیم اختر، مشکور حسین یاد، عرش صدیقی، وزیر آغا، رشید امجد، سید محمد حسنین، سلام سندیلوی، سلیم آغا قزلباش، مشتاق قمر، عطیہ رئیس، مرزا حامد بیگ، اقبال آفاقی، جمیل آذر، انور سدید، غلام الثقلین نقوی اور آخر میں جارج لوکاچ کے مضمون کا اردو میں ترجمہ شامل ہے جسے شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی کے سابق استاد ڈاکٹر عبدالحئی نے کیا تھا۔ ان مضامین سے اس کتاب کی اہمیت وافادیت کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔

امید ہے ادبی حلقوں میں خصوصاً انشائیہ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ڈاکٹر احمد امتیاز کی یہ کاوش انتہائی سودمند ثابت ہوگی۔

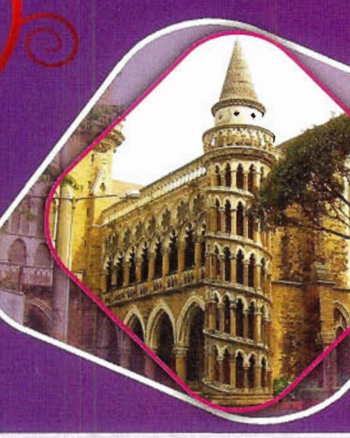

ماجد قاضی

ممبئی یونیورسٹی میں اردو تعلیم کے مسائل و امکانات

ممبئی یونیورسٹی سے جُڑے ہوئے صرف پندرہ کالجوں میں بی اے کی سطح پر اردو زبان و ادب کی تدریس ہوتی ہے۔ اِن پندرہ کالجوں کے علاوہ انسٹی ٹیوٹ آف ڈسٹنس ایجوکیشن اینڈ لرننگ IDEL سے فاصلاتی کورس کرنے والے طلبہ بھی اردو مضمون میں بی اے کر سکتے ہیں۔ لیکن اِس کے لیے نہ کوئی تعلیمی مواد Study Literature فراہم کیا جاتا ہے اور نہ ہی لیکچر منعقد ہوتے ہیں۔ اردو زبان و ادب کے ان پندرہ تدریسی کالجوں کی فہرست یہ ہے۔ (1) اسماعیل یوسف کالج، ممبئی (2) مہاراشٹر کالج، ممبئی (3) بُرہانی کالج، ممبئی (4) رضوی کالج، باندرہ۔ ممبئی (5) کموجعفر ویمنز کالج، ممبئی (6) معین الدین حارث کالج، سوپارہ (7) اے آر کالسیکر ویمنز کالج، ممبرا (8) حُسنیٰ عبدالملک مدعو ویمنز کالج، کلیان (9) B.N.N کالج، بھیونڈی (10) جی ایم مومن ویمنز کالج، بھیونڈی (11) صمدیہ کالج، بھیونڈی (12) گوکھلے کالج، رتنا گیری (13) وسنت راؤ نائک کالج مروڈ زنجیرہ (14) وسنت راؤ نائیک کالج، مہسلہ (15) ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر کالج، مہاڈ۔

آخری سال یعنی ٹی وائے بی اے کی سطح پر یونیورسٹی امتحان منعقد کرتی ہے۔ پہلے دو برسوں میں امتحانات کالج کی سطح پر ہوتے ہیں۔ ٹی وائے بی اے کے امتحانات میں شریک ہونے والے اردو طلبہ کی تعداد چار سو کے قریب ہوتی ہے۔ حالیہ برسوں میں اگرچہ اردو پڑھانے والے کالجوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے لیکن طلبہ کی تعداد کم ہو رہی ہے۔ یہ مسئلہ صرف اردو کا نہیں ہے بلکہ بی اے میں داخلے کا عمومی رجحان کم ہوتا جارہا ہے۔ بطورِ خاص ممبئی شہر کے تمام کالجوں میں کامرس اور سائنس کے شعبوں میں اور دیگر پیشہ ورانہ کورس میں طلبہ کی بڑی تعداد اپنے مستقبل کی منصوبہ بندی کرتی ہوئی نظر آرہی ہے۔

بی اے کی سطح پر اردو زبان و ادب کی تدریس سے متعلق مسائل اور امکانات کا جائزہ لینے سے پہلے ممبئی یونیورسٹی کے نصابِ تعلیم، طریقۂ امتحان اور طلبہ کی علمی و ذہنی استعداد سے متعلق کچھ باتیں پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے:

(1) ممبئی یونیورسٹی میں بی اے کی سند Three years integrated course کے مکمل کرنے پر تفویض کی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ طالبِ علم جس مضمون یا مضامین میں سند حاصل کرنا چاہتا ہے، اُنھیں لازمی طور پر پہلے دو برسوں میں اختیار کیا جائے گا۔ آخری سال میں کسی ایک مضمون کے چھ پرچے یا کسی دو مضامین کے تین تین پرچے دینے ہوں گے۔

(2) اِس طرح اردو مضمون اختیار کرنے والے طلبہ بھی ٹی وائے بی اے کے امتحان میں چھ پرچوں یا تین پرچوں کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔

(3) دی گئی پندرہ کالجوں کی فہرست میں سے صرف چار کالج ایسے ہیں جو طلبہ کو چھ پرچے اختیار کرنے کی سہولت فراہم کرتے ہیں ورنہ بقیہ گیارہ کالجوں میں طلبہ کو صرف تین پرچے کسی دوسرے مضمون کے تین پرچوں کے ساتھ منتخب کرنے ہوتے ہیں۔ چھ پرچوں کی سہولت فراہم کرنے والے کالجوں کی فہرست یہ ہے:

(1) اسماعیل یوسف کالج، ممبئی (2) مہاراشٹر کالج، ممبئی (3) بُرہانی کالج، ممبئی اور (4) حُسنیٰ عبدالملک مدعو کالج، کلیان IDEL کے طلبہ بھی چھ پرچے دے سکتے ہیں۔

(4) بی اے میں بڑی تعداد لڑکیوں کی ہوتی ہے۔ لڑکوں کا تناسب روز بروز کم ہوتا جارہا ہے۔ اِن پندرہ کالجوں میں سے چار تو صرف لڑکیوں کے لیے ہیں۔ بُرہانی کالج میں بھی آرٹس کا شعبہ لڑکیوں کے لیے مخصوص ہے اِس طرح پانچ کالجوں سے صرف لڑکیاں شریک ہوتی ہیں بقیہ دس کالجوں اور IDEL سے شریک ہونے والے طلبہ میں لڑکوں کا تناسب بہ مشکل دس فیصد ہوتا ہے۔

(5) بی اے کے پہلے سال میں انگریزی کے علاوہ مزید ایک 'زبان' کا پرچہ لازمی ہوتا ہے اِس لیے اردو میڈیم سے آنے والے طلبہ اچھی تعداد میں اردو بطور لازمی مضمون اختیار کرلیتے ہیں۔ اِس لازمی پرچے کے لیے ایک ایسی نصابی کتاب تیار کی جاتی ہے جس میں نمائندہ اردو اسالیب نثر و نظم کی تعلیم کے مواقع طلبہ کو میسر آتے ہیں۔ وہ نمائندہ ادیبوں اور شاعروں کو پڑھتے ہیں۔

(6) پہلے سال میں طلبہ کو 'تین پرچے' اختیاری زمرے میں منتخب کرنے ہوتے ہیں اور یہی تین پرچے دوسرے اور تیسرے سال میں تفصیلی مطالعے کے لیے جاری رکھے جاسکتے ہیں۔ ان ہی تین مضامین میں سے کسی ایک یا دو کو تیسرے سال میں منتخب کرکے طلبہ بی اے کی سند حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح بورڈ آف اسٹڈیز اِن اردو کُل نو پرچوں کے لیے باقاعدہ نصاب تیار کرتا ہے۔ پہلے سال میں ایک پرچہ، دوسرے سال میں دو پرچے اور تیسرے سال میں چھ پرچوں کے نصاب کی تیاری میں اسالیب نثر و نظم کا انتخاب، ان کے نمائندہ ادبا و شعرا اور ان کی اہم تصانیف وغیرہ کا انتخاب کرنا ایک مستقل، محنت اور دقت طلب کام ہے۔

بہرحال اِن تمام تکنیکی باتوں کے علاوہ سب سے اہم عنصر وہ 'طالب علم' ہے جسے اِس پورے تعلیمی نظام میں مرکزی حیثیت حاصل ہے اور زبان و ادب کی باقاعدہ تدریس کے ذریعے جس کی علمی استعداد اور جمالیاتی ذوق کی تربیت کرنا مقصود ہے۔ اُس کی تخلیقی صلاحیتوں کو وہ فضا میسر آئے کہ وہ شعر و ادب، تحقیق و تنقید، درس و تدریس اور صحافت کے میدانوں میں اہم ذمے داریاں اُٹھا سکے۔ نہ صرف اس کی شخصیت میں نکھار آئے، بلکہ اِن اہم شعبہ جات میں بھی ترقی ہو۔ ہمارے تہذیبی ورثے میں گراں قدر اضافہ ہو اور ملک و قوم اِن سب کے مثبت نتائج سے بہرہ ور ہوں۔

کچھ ناقابلِ تردید تلخ حقائق اِس رومانی فضا کو مسموم کرتے ہیں مثلاً یہ بہت تلخ حقیقت ہے کہ دسویں

کے بعد شعبۂ آرٹس میں داخلہ لینے والے طلبہ کے پاس کوئی واضح منصوبہ نہیں ہوتا ان میں سے بیش تر اِس لیے گیارہویں آرٹس میں داخلہ لیتے ہیں کہ اُنھیں دسویں میں کم نشانات (٪) ملے ہیں اور جس کی وجہ سے وہ کامرس سائنس یا کسی اور پیشہ ورانہ کورس میں داخلہ نہیں لے پائے ہیں۔ ایک بڑی تعداد اُن لڑکیوں کی ہوتی ہے جنھیں صرف گریجویشن کرنا ہے یا جن کے والدین اچھے رشتوں کی آمد تک اپنی بچیوں کو مصروف رکھنا چاہتے ہیں۔ اوسط آمدنی والے خاندان کی لڑکیاں (اور لڑکے بھی) صرف اس لیے بارہویں کررہے ہیں کہ وہ ٹیچر ٹریننگ کا ڈپلومہ کرکے جلد ہی برسرِ روزگار ہوجائیں گے۔ جن طلبہ نے بی اے میں داخلہ لیا ہے اُن کے پاس بھی صرف یہی ایک واضح منصوبہ ہے۔ اِس پس منظر میں کمزور تعلیمی ریکارڈ رکھنے والے طلبہ سے یہ توقع رکھنا کہ وہ زبان و ادب کی باریکیوں کو سمجھیں گے، ان میں دلچسپی لیں گے اور ان سے لطف اندوز ہوں گے، خوش گمانی بلکہ خودفریبی کے سوا کچھ نہیں۔ ممبئی اور مضافات کے طلبہ کی سب سے بڑی محرومی یہ ہے کہ انھیں صحیح اردو سننے کے مواقع بہت کم ملتے ہیں۔ اِسکول، گھر اور بازار میں وہ عوامی اور بعض اوقات بازاری بولی بولتے اور سنتے ہیں۔ اردو پڑھانے والے اساتذہ، کتابی اور بزعمِ خود فصیح اردو بولتے ہوں گے مگر یہ مصنوعی لہجہ اور بناوٹی انداز دل پر کم ہی اثر انداز ہوتا ہے۔ مراٹھی، ہندی اور انگریزی کے ملے جلے اثرات نے تلفظ کا تیاپانچہ کردیا ہے اور تذکیر و تانیث کے اغلاط میں بے تحاشا اضافہ ہوا ہے۔ دوسری طرف تحریر کا حال اس سے بھی بُرا ہے۔ ہر سال بی اے کے پہلے سال میں داخلہ لینے والوں میں سے دو تین طلبہ ضرور ایسے نکل آتے ہیں جو اپنا پورا نام صحیح نہیں لکھ پاتے۔ نقطوں اور شوشوں کا ذکر نہیں ذ، ز اور ث، س، ص کی غلطیاں ملتی ہیں اور افسوس کی بات یہ ہے کہ پچھلے بارہ برسوں میں کسی ٹیچر نے ان کی اصلاح نہیں کی۔ اُنھوں نے اب تک گائیڈ کی مدد سے مضمون نویسی کی ہے اور بیش تر نے صرف اتنا لکھنا سیکھا ہے کہ کسی طرح امتحان میں کامیاب ہوجائیں۔ جو طلبہ واقعی ذہین اور محنتی تھے اور جنھوں نے اعلیٰ درجے میں کامیابی حاصل کی تھی اُن میں کم ہی بی اے میں آئے ہیں۔ اب اِس سطح پر تدریسی فرائض ادا کرنے والے اساتذہ زبان و ادب کی باریکیاں اور جمالیاتی پہلوؤں کو اُجاگر کرنے اور تنقیدی بصیرت پیدا کرنے کی بجائے بنیادی خامیوں اور خرابیوں کا ازالہ کرنے میں لگ جاتے ہیں یا سب کچھ تقدیر کے حوالے کرکے نصاب پورا کرنے اور نوٹس کے زیراکس تقسیم کرنے میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ دل کے اطمینان کے لیے یہ کافی ہے کہ طلبہ کو اتنا کچھ دیا ہے کہ وہ امتحانی پرچہ حل کرسکیں گے۔

بی اے سالِ اوّل کے طلبہ نے 'اردو لازمی' کا انتخاب اس لیے کیا ہے کہ وہ اردو میڈیم اسکول سے S.S.C یا H.S.C کرچکے ہیں یا S.S.C کے بعد بھی اُنھوں نے 'اردو' بحیثیت ایک مضمون پڑھا ہے۔ طلبہ کا یہ فیصلہ بالکل صحیح ہے لیکن وہ 'اردو' کو آسان سمجھنے کی غلطی کرتے ہیں۔ انھیں اِس بات کا اندازہ نہیں ہوتا کہ اب وہ گریجویشن کے پہلے سال میں داخل ہوچکے ہیں اور اِس سطح پر زبان و ادب کی تدریس کے اعلیٰ مقاصد کے تحت نصابِ تعلیم ترتیب دیا گیا ہے۔ اِن سے توقع کی جارہی ہے کہ وہ ایک طرف تحریر و تقریر میں صحتِ زبان کا خیال رکھیں گے دوسری طرف سرمایۂ ادب کے منتخب فن پاروں

> کچھ ناقابلِ تردید تلخ حقائق اِس رومانی فضا کو مسموم کرتے ھیں مثلاً یہ بھت تلخ حقیقت ھے کہ دسویں کے بعد شعبۂ آرٹس میں داخلہ لینے والے طلبہ کے پاس کوئی واضح منصوبہ نھیں ھوتا ان میں سے بیش تر اِس لیے گیارھویں آرٹس میں داخلہ لیتے ھیں کہ اُنھیں دسویں میں کم نشانات (٪) ملے ھیں اور جس کی وجہ سے وہ کامرس سائنس یا کسی اور پیشہ ورانہ کورس میں داخلہ نھیں لے پائے ھیں۔ ایک بڑی تعداد اُن لڑکیوں کی ھوتی ھے جنھیں صرف گریجویشن کرنا ھے یا جن کے والدین اچھے رشتوں کی آمد تک اپنی بچیوں کو مصروف رکھنا چاھتے ھیں۔

اور فن کاروں کو سمجھ کر پڑھیں گے۔ اُن میں ایسی تنقیدی بصیرت پیدا ہوگی جو فن پاروں کے جمالیاتی پہلوؤں کو ان پر منکشف کرے گی۔ وہ اسباقِ نثر کے تجزیے میں اور اشعار کی تشریح میں موضوع و مضمون کے ساتھ فن کاروں کے اسلوب کے حسن و قبح سے بحث کرسکیں گے۔ ان ادب پاروں کا مطالعہ اُنھیں کم از کم کالج کے کتب خانے کا باقاعدہ رکن regular visitor بنائے گا اور وہ اپنے پسند کے ادیبوں اور شاعروں کا باقاعدہ مطالعہ شروع کریں گے۔ افسوس یہ سب کچھ نہیں ہوتا۔ طلبہ اردو کو آسان سمجھ کر دوسرے مضامین کے مقابلے میں اِس پر کم وقت صرف کرتے ہیں۔ اُن میں مطالعے کا ذوق وشوق بھی پیدا نہیں ہوتا وہ لطف اندوزی کے لیے بھی کتابیں نہیں اُٹھاتے۔ چند ہی طلبہ اضافی مطالعے کے لیے لائبریری کا رُخ کرتے ہیں۔ پہلے سال میں 'اختیاری زمرے' میں اردو مضمون کا انتخاب کرنے والے طلبہ کی تعداد مزید کم ہوجاتی ہے۔ ان میں بھی زیادہ تر اردو اسی لیے لیتے ہیں کہ دوسرے مضامین کے مقابلے میں یہاں کم محنت درکار ہوگی۔ حالانکہ اردو اختیاری میں خصوصی مطالعہ ہوتا ہے۔ فی الحال اِس پرچے میں صنفِ افسانہ کے تحت افسانہ نگاری کا فن اور تاریخ کے ساتھ افسانوں کا ایک انتخاب بھی شاملِ نصاب ہے۔ اسی طرح پرچے کے دوسرے حصّے میں طنز و مزاح نگاری کی فنی و تاریخی تفصیلات کے ساتھ 'شوخیِ بیان' کے عنوان سے مزاحیہ مضامین کا ایک انتخاب بھی پڑھایا جاتا ہے۔ اب ہمارے تن آسان طلبہ کو یہ سب پڑھنا بہت دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اساتذہ بھی صرف امتحانی نقطۂ نظر سے نصاب کی تکمیل میں جُٹ جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ زبان و ادب کی تدریس کے اعلیٰ مقاصد دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ دوسرے اور تیسرے سال بھی یہی رویہ برقرار رہتا ہے۔ یہ ممبئی اور مضافات کے کالجوں میں اردو کی تدریس کی عمومی صورتِ حال ہے۔ تیسرے سال میں ستم بالائے ستم یہ ہوتا ہے کہ دوسرے سال کے نسبتاً ذہین اور محنتی طلبہ معاشیات، عمرانیات، نفسیات، تاریخ، سیاسیات اور انگلش لٹریچر وغیرہ میں چلے جاتے ہیں اور اردو ادب کے حصّے میں کمزور تعلیمی ریکارڈ رکھنے والے طلبہ آتے ہیں۔ طلبہ کے ذہنوں میں ایک سوال یہ بھی گردش کرتا رہتا ہے کہ 'اردو سے بی اے کرکے آپ کیا کریں گے؟' اردو سے بی اے کرنے والے طلبہ شرمائے شرمائے سے رہتے ہیں اور خود اپنی ذات پر اُن کا اعتماد متزلزل ہونے لگتا ہے۔ اِس منفی رویّے کو بدلنے اور ان میں خوداعتمادی پیدا کرنے کے لیے انھیں یہ یقین دلانا چاہیے کہ اردو سے بی اے کرنے والوں کو بھی آگے بڑھنے کے اتنے ہی مواقع میسّر ہیں جتنے کسی اور مضمون سے بی اے کرنے والوں کے لیے ہیں بشرطیکہ وہ اپنے مضمون کا حق ادا کریں اور زبان و ادب کی تعلیم کو اپنے شخصی ارتقا کا ذریعہ بنائیں۔

تعلیمی سال 12-2011 سے ممبئی یونیورسٹی نے Credit Based Grading System کا نفاذ کیا ہے۔ اب بی اے کا کورس تین برسوں کی بجائے چھ شش ماہیوں پر مشتمل ہوگا۔ پہلے سالانہ نتائج کی بنیاد پر طلبہ اگلی جماعت میں داخلہ لیتے تھے۔ اب شش ماہی امتحان کے نتیجے کی بنیاد پر آگے بڑھیں گے۔ اب انھیں فی صد نشانات کی بجائے ہر مضمون میں گریڈ دیا جائے گا۔ ہر

مضمون میں تحریری امتحان کے لیے ساٹھ فی صد نمبرات ہیں۔ بقیہ چالیس فیصد نمبرات دو کلاس ٹیسٹ، ایک اسائنمنٹ، طالب علم کی حاضری اور دورانِ تعلیم اُس کی عملی شرکت کے لیے مختص کیے گئے ہیں۔ قدر پیمائی کے طریقے میں یہ تدریسی تبدیلیاں کچھ خاص مقاصد کے حصول کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کی گئی ہیں۔ من جملہ اُن میں ایک اہم ترین مقصد یہ بھی ہے کہ طالبِ علم پوری دلجمعی کے ساتھ مضمون کا مطالعہ کرے۔ اضافی مطالعہ کے لیے لائبریری جائے، اسائنمنٹ مکمل کرنے کے لیے انٹرنیٹ اور دیگر ذرائع کا استعمال کرے اور علم میں اضافے کے لیے صرف نصابی کتابوں یا اپنے اساتذہ کا محتاج نہ رہے بلکہ اُس میں خود آموزی Self Learning کا رجحان پیدا ہو اور وقت کے ساتھ اس میں ترقی ہوتی رہے۔ تعلیمی سال 12-2011 کی پہلی شش ماہی میں خود اساتذہ اور طلبہ کو نئے تصورات اور طریقۂ کار سمجھنے میں کچھ وقت لگا۔ اشکالات اور وضاحتوں کے درمیان خاطر خواہ تیاری نہ ہو پائی اس لیے ہر جگہ بے اطمینانی کی فضا نظر آئی۔ بہر حال مقاصد اچھے ہیں اور مکمل ذہنی آمادگی کے ساتھ اساتذہ اور طلبہ ان کے حصول کے لیے کوشاں ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ ناکامی ہاتھ آئے۔ اردو زبان کی تدریس کے لیے تو یہ طریقہ بہت ہی کارآمد ثابت ہوگا کیونکہ تدریسِ زبان میں طلبہ کی عملی شرکت کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ وہ دوسرے مضامین کی حوالہ جاتی کتب اور رسائل کو دیکھنے کی بجائے اردو ادب کے وقیع سرمائے کو کھنگالنے میں زیادہ دلچسپی لیں گے۔ کالج کی بزم اردو اگر فعّال ہو اور اچھی منصوبہ بندی کرے تو نمبرات حاصل کرنے کی غرض سے طلبہ تحریری و تقریری مقابلوں میں حصہ لیں گے۔ اُن کے ذوق کی تربیت کرنا اور ان کی صلاحیتوں کو پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کرنا اساتذہ کی اہم ذمے داری ہے اور اب خود ممبئی یونیورسٹی نے اِس ضمن میں اُن کی مدد کی ہے۔ 'بورڈ آف اسٹڈیز اِن اردو' نیا نصاب تیار کرتے وقت اِن اہم نکات کو مدِّنظر رکھے تو مضافات اور دور دراز کے کالج کے طلبہ بھی حوالہ جاتی کتب تک رسائی حاصل کرسکیں گے۔ یہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نصاب اور حوالہ جاتی کتب کی فہرست کے ساتھ اسائنمنٹ اور دیگر سرگرمیوں کے ضمن میں اساتذہ کی رہنمائی کی جائے۔

■

Dr. Majid Kazi, 301, Arfat Building, 6/61, Bunder Road, Kalyan (W) - 421 301

یونیورسٹیوں کی اردو سرگرمیاں

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

اردو ریفریشر کورس کا اہتمام

نئی دہلی: 19 اکتوبر کو یو جی سی اکیڈمک اسٹاف کالج کے تحت چلنے والے اردو ریفریشر کورس کا اختتام ہوا۔ اس موقع پر پروفیسر اختر الواسع، مہمان خصوصی، ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین بحیثیت مہمان اعزازی شریک ہوئے۔ جلسے کی صدارت شعبہ اردو کے استاد پروفیسر شہپر رسول نے کی۔ مہمانوں کا استقبال یو جی سی اکیڈمک اسٹاف کالج کے ڈائرکٹر ڈاکٹر انیس الرحمٰن نے اور کلمات تشکر اسسٹنٹ ڈائرکٹر ڈاکٹر عذرا خورشید نے پیش کیا۔ اختتامی اجلاس میں پروفیسر اختر الواسع نے اساتذہ کو ان کی ذمے داریوں سے آگاہ کیا اور کہا کہ معلّمی کا پیشہ کار پیغمبری ہے۔ اس موقع پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ اساتذہ کی ذمے داری ہے کہ وہ طلبا کو روزگار کی طرف لے جائیں اور انھیں زمانے کے تقاضے کے مطابق لے چلیں۔ مہمان خصوصی پروفیسر اختر الواسع کے ہاتھوں سبھی بائیس شریک اساتذہ کو اسناد تقسیم کی گئیں۔ صدارتی خطبے میں پروفیسر شہپر رسول نے فرمایا کہ عہد حاضر میں اردو ادب بالخصوص شعری اصناف اور کلاسیکی ادب پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ افتتاحی تقریر میں پروفیسر شہزاد انجم کورس کوآرڈینیٹر نے اپنی مفصل رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس ریفریشر کورس میں سات صوبوں کے اساتذہ شریک ہوئے۔ ان صوبوں میں اتر پردیش، بہار، بنگال، جھارکھنڈ، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر اور دہلی شامل ہے۔ یہ اساتذہ مختلف شہروں سے جامعہ کی شہرت اور علمی ماحول کو سن کر یہاں تشریف لائے۔ اس موقع پر شریک اساتذہ میں خان احمد فاروق (کانپور) ڈاکٹر درخشاں زریں (کلکتہ) اور ڈاکٹر اے ایس سبحانی (مدھے پورہ، بہار) نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور یو جی سی اکیڈمک اسٹاف کالج کے سبھی اراکین شعبہ اردو کے صدر پروفیسر خالد محمود اور کورس کوآرڈینیٹر پروفیسر شہزاد انجم کی ستائش کی۔ اس اردو ریفریشر کورس کا آغاز 18 ستمبر کو ممتاز نقاد اور دانشور پروفیسر شمیم حنفی کے خطبے سے ہوا۔ ان کے بعد اس ریفریشر کورس میں پروفیسر عبد الحق، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر محمد ذاکر، پروفیسر رضوان قیصر، جناب گلزار دہلوی، پروفیسر توقیر احمد خاں، جناب عقیل الغروی (دہلی) پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر ظفر احمد صدیقی (علی گڑھ) پروفیسر محمد ظفر الدین، ڈاکٹر حبیب نثار (حیدرآباد) پروفیسر علی احمد فاطمی (الہ آباد) پروفیسر سید عزیز الدین حسین ہمدانی (رام پور) پروفیسر مختار شمیم (بھوپال) ڈاکٹر انور ظہیر (بڑودہ) نے

(دائیں سے بائیں) ڈاکٹر عذرا جمال، پروفیسر شہزاد انجم، پروفیسر شہپر رسول، ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، پروفیسر اختر الواسع، ڈاکٹر انیس الرحمٰن

اردو کی شعری اصناف کے مختلف موضوعات پر لیکچر دیے۔ ان کے علاوہ شعبہ اردو کے اساتذہ میں پروفیسر خالد محمود، پروفیسر شمس الحق عثمانی، پروفیسر وہاج الدین علوی، پروفیسر شہپر رسول، پروفیسر شہزاد انجم اور ڈاکٹر احمد محفوظ نے بھی اس موضوع کے تحت لیکچر دیے۔

پریس ریلیز، پروفیسر شہزاد انجم، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، 19 اکتوبر 2012

اردو پڑھنا ضروری

نئی دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تمام طلبا و طالبات کے لیے کم از کم 2 سال تک اردو پڑھنا لازمی کر دیا گیا ہے اور اس کے نمبر ڈویژن نمبروں میں شامل کیے جانے کا بھی فیصلہ کیا گیا ہے۔ جامعہ کے وائس چانسلر نجیب جنگ اور جامعہ کی تعلیمی مجلس (اکیڈمک کونسل) کے اس تاریخ ساز فیصلے سے ان کی اردو دوستی اور اردو کے فروغ و ترقی کے لیے ان کی سنجیدگی کا ثبوت ملتا ہے۔ ذرائع کے مطابق جامعہ کے وائس چانسلر نجیب جنگ کا کہنا ہے کہ جامعہ ملیہ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے اردو پڑھنا ضروری ہے۔ اطلاعات کے مطابق جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تعلیمی مجلس (اکیڈمک کونسل) کی میٹنگ میں وائس چانسلر و کونسل کے چیئرمین نجیب جنگ نے از خود کم از کم 2 سال تک اردو پڑھنے اور اس کے نمبر ڈویژن میں شامل کیے جانے کا معاملہ اٹھایا اور اسے تعلیمی مجلس کے تمام ممبران نے اتفاق رائے سے پاس کر دیا۔ قابل ذکر ہے کہ اس سے قبل طلبا کو اپنے کورس کی کل مدت ایک 3-2 یا 4 سال کے دوران کم سے کم ایک سال تک ایلیمنٹری اردو اور اردو لینگویج کورس پڑھنا لازمی تھا اور اس کے نمبر بھی ڈویژن میں شامل نہیں کیے جاتے تھے، جب کہ کئی کورسز کرنے کے لیے لازمی جنرل انگریزی کا کورس 2 سال کا تھا اور اس

کے نمبر بھی ڈویژن میں شامل کیے جاتے تھے۔ وائس چانسلر نجیب جنگ نے اس پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے اسی کو بنیاد بنا کر اردو کے لیے بھی یہی رول پاس کر دیا۔ وائس چانسلر کے اس فیصلے سے اردو حلقے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور انھوں نے نجیب جنگ کے اردو کے تعلق سے اٹھائے گئے اس قدم پر حیرانی کا اظہار کیا۔ اس سلسلے میں جامعہ کے شعبہ اردو کے صدر پروفیسر خالد محمود نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جامعہ کے وائس چانسلر نجیب جنگ اردو کے عاشق ہیں اور اردو کے فروغ اور مقبولیت میں اضافے کے لیے ان کے اقدامات اور جذبات قابل ستائش ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ فی الحال فوری طور سے اس بات کا فیصلہ نہیں کیا گیا ہے کہ ڈویژن میں شامل ہونے والے نمبروں کا تناسب کیا ہوگا۔ اس سلسلے میں اردو اکادمی، دہلی کے وائس چیئر مین پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ جامعہ کے وائس چانسلر نجیب جنگ نے جہاں ایک طرف جامعہ میں جدید تعلیم کے تصورات و میدان کی فکر کی ہے وہیں دوسری طرف جامعہ کے پرانے اقدار کی بحالی کے لیے بھی کافی سنجیدہ کوششیں کی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وائس چانسلر کا کہنا ہے کہ اردو جامعہ میں نہیں پڑھائی جائے گی تو کہاں پڑھائے جائے گی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 21 ستمبر 2012

دہلی یونیورسٹی، دہلی

اردو سرٹیفکٹ کورس کرنے والوں کو الوداعیہ

نئی دہلی: دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں سرٹیفکیٹ کورس مکمل کرنے والوں کو الوداعیہ دیا گیا جس کا اہتمام شعبہ کے ڈپلومہ کے طلبہ کے ذریعے کیا گیا تھا۔ اس موقعے پر شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر توقیر احمد خاں نے کہا کہ اس طرح کی تقریب کا انعقاد ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ ہمارے یہاں سٹیفکیٹ اور ڈپلومہ کورسیز میں تمام مذاہب کے ماننے والے طلبہ کی کثیر تعداد ہوتی ہے۔ انھوں نے اردو زبان کے بارے میں تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا کہ اردو کسی ایک مذہب کی زبان نہیں ہے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ ہمارے یہاں سٹیفکیٹ کورس اور ڈپلومہ میں داخلہ لینے والے مختلف مذاہب کے طلبہ ہوتے ہیں اور ان میں اردو سیکھنے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ تقریب کی نظامت کے فرائض ثنا خان نے انجام دیے جب کہ اس صدارت روی نے کی۔ اس موقعے پر طلبہ میں خاص جوش وخروش دیکھا گیا۔ طلبہ کی حوصلہ افزائی کرنے والوں میں ڈاکٹر علی جاوید، ڈاکٹر متھن، ڈاکٹر ارشاد نیازی، ڈاکٹر مشتاق، ڈاکٹر شبیر کے علاوہ شعبہ کے تمام اساتذہ موجود تھے۔ تقریب کو کامیاب کرنے والوں میں محمد تعظیم، محمد نسیم، محمد رضوان وغیرہ نے اہم رول ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 13 ستمبر 2012

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مولانا رومی پر سیمینار

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ثقافتی کونسل نئی دہلی کے تعاون سے منعقدہ سیمینار میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے سدرن انڈیا ایجوکیشنل ٹرسٹ، چنئی کے صدر اور سینئر آئی اے ایس افسر مسٹر موسیٰ رضا نے کہا کہ رومی ایک دردمند دل کے مالک تھے اور ان کے مریدین میں ہر مذہب اور فرقے کے لوگ شامل تھے جو ان کی تعلیمات سننے کے لیے آتے تھے۔ مسٹر رضا نے کہا کہ آج ہم رومی کی جانب امید کے ساتھ دیکھتے ہیں کیونکہ انھوں نے ہمیں پیغام دیا تھا کہ مذہب، ذات پات اور علاقائی پہچان سے بالاتر ہوکر اتحاد قائم کرو کیونکہ یہی انسانیت کی بنیاد ہے۔ سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے ہندوستان میں ایران کے سفیر سید مہدی نبی زادہ نے کہا کہ مولانا جلال الدین رومی کا فلسفہ صرف محبت اور انسانیت پر منحصر ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اس دنیا کا حسن محض انسان کی روح میں بستا ہے اور وہ حسن اس کے سلوک سے بھی ظاہر ہونا چاہیے۔ سیمینار کے افتتاحی اجلاس کے مہمانِ خصوصی اور ہندوستان میں تاجکستان کے سفیر سعید بیگ سعیدوف نے کہا کہ مولانا رومی کا فلسفہ خالق کائنات سے محبت پر منحصر ہے اور اس کا مرکزی نکتہ انسانیت، ہم آہنگی اور حسنِ اخلاق ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) ضمیر الدین شاہ نے کہا کہ رومی ایک عظیم شاعر، مفکر اور صوفی تھے ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ساری دنیا کو یگانگت کا پیغام دیا جس کی اس یونیورسٹی کو بھی ضرورت ہے۔ وائس چانسلر نے کہا کہ کیمپس میں مشرق مغرب اور علاقائیت کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے اور سب کی ایک برادری ہے جو علیگ برادری کے نام سے مشہور ہے۔ اس سے قبل حاضرین کا خیر مقدم کرتے ہوئے فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی ڈائریکٹر پروفیسر آزرمی دخت صفوی نے کہا کہ سیمینار کے انعقاد کا مقصد عظیم شاعر رومی کو جدید تناظر میں سمجھنے کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کو محض شاعری تک محدود نہ رکھ کر اسے کثیر الموضوعاتی بنانا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اس دوروزہ سیمینار میں ان ہی نکات پر خصوصی طور پر گفتگو ہوگی۔ پروگرام سے ایران کلچر ہاؤس کے ڈائریکٹر ڈاکٹر علی

دیغانی اور مصطفیٰ یونیورسٹی ایران کے وائس چانسلر ڈاکٹر غلام رضا مہذب نے بھی خطاب کیا۔ شعبۂ فارسی کے سربراہ پروفیسر ایم عارف نعیم صدیقی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ایس ایم اسد علی خورشید نے انجام دیے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 20 ستمبر 2012

علی گڑھ یونیورسٹی میں سرسید یادگاری خطبہ

علی گڑھ: مسلم یونیورسٹی کی سرسید اکادمی کے زیر اہتمام 'سرسید اور ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل' موضوع پر سرسید یادگاری خطبہ پیش کرتے ہوئے ممتاز سائنسداں اور ہمالیہ ڈرگس کے چیئر مین ڈاکٹر ایس فاروق نے کہا کہ کسی بھی معاشرہ، طبقہ اور قوم کا مستقبل تعلیم سے ہی بنتا ہے۔ سرسید نے جس قربانی کے جذبے سے تعلیم کی ترویج و اشاعت کی ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل اس سے ہی روشن ہوسکتا اور معاشرے میں انھیں باعزت مقام حاصل ہوسکتا ہے۔ تعلیم اظہار کا فن سکھاتی ہے اور ساتھ ہی پیسہ کمانے کے علاوہ زندگی بسر کرنے کا فن بھی سکھاتی ہے۔ سرسید ایک عظیم مفکر اور دوراندیش انسان تھے اور انھوں نے جو بھی سوچا اسے کر دکھایا۔ یہ ادارہ سرسید کے خوابوں کو تعبیر سے ہمکنار کر رہا ہے۔ ہندوستان نے زندگی کے ہر میدان میں ترقی کی ہے، لیکن آج بھی ہندوستان کی آبادی کا بڑا حصہ تعلیم سے محرومی کا شکار ہے۔ ہمیں سرسید کے مشن کو آگے بڑھانا چاہیے۔ ہندوستان میں بنارس ہندو یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کے وقت سے ہی ان دونوں تعلیمی اداروں نے اپنے دروازے سبھی مذاہب، ذاتوں اور طبقات کے لیے کھلے رکھے اور بنارس نے شعبۂ عربی قائم کیا تو علی گڑھ نے سنسکرت شعبہ قائم کیا۔ وائس چانسلر ضمیر الدین شاہ نے کہا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل پوری طرح محفوظ ہے۔ 1857 کی پہلی جنگِ آزادی میں برطانوی حکومت نے مسلمانوں کو ہی اپنا نشانہ بنایا اور ان پر مظالم ڈھائے گئے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی ترقی تعلیم سے ہی ہوسکتی ہے۔ اس سے قبل سرسید اکادمی کے ڈائریکٹر پروفیسر ایم سعود عالم قاسمی نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا سرسید نے مسلمانوں کی خودمختاری کے لیے تعلیم کو بنیاد بنایا۔ وہ ایک عظیم مفکر اور دوراندیش انسان تھے۔ انھوں نے ملک کو

ایک نئی راہ پر گامزن کا اس موقعے پر وائس چانسلر جنرل شاہ نے ڈاکٹر فاروق کو سرسید کی تصویر پیش کی اور مسٹر ساجد نعیم کی کتاب 'شناسانِ سرسید' کا اجرا کیا۔ پرو وائس چانسلر بریگیڈیئر سید احمد علی نے حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر فاروق نے اپنی مصروفیات سے اپنی بیش قیمت وقت اس ادارہ کو دیا اور سرسید احمد خاں پر بہترین خطبہ پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 اکتوبر 2012

جواہر لعل نہرو میڈیکل کالج قیام کے پچاس سال

علی گڑھ: سرسید احمد خاں ایک تاریخ ساز شخصیت کے حامل تھے۔ ہندوستان میں تعلیم کی تاریخ کا کوئی بھی ورق سرسید کے ذکر کے بغیر ادھورا ہے۔ سرسید کے قائم کردہ ادارے کو اب ڈیڑھ سو سال ہو چکے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار مرکزی وزیر صحت و خاندانی بہبود مسٹر غلام نبی آزاد نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جواہر لعل نہرو میڈیکل کالج قیام کے پچاس سال مکمل ہونے پر کنیڈی ہال میں ایک تقریب کو خطاب کرتے ہوئے کیا۔ اس موقعے پر مرکزی وزیر برائے فروغِ انسانی وسائل، کمیونیکیشن اور انفارمیشن ٹیکنالوجی مسٹر کپل سبل مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے موجود تھے۔ اس سے پہلے مسٹر آزاد جواہر لعل میڈیکل کالج میں راجیو گاندھی ڈائبٹیز سینٹر اور وزیرِ اعظم کے صحت سے متعلق منصوبے کے تحت عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا۔ مسٹر غلام نبی آزاد نے کہا کہ یہ واحد ادارہ ہے جو پرائمری سطح سے لے کر اعلیٰ تعلیم کے مواقع فراہم کرتا ہے اور یہ ادارہ علم کا سمندر ہے جہاں بھی کورسوں کی تعلیم مہیا کرائی جاتی ہے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جواہر لعل نہرو میڈیکل کالج کو بھی دہلی کے دوسرے سرکاری ہسپتالوں کی طرح مالی اور دوسری سہولیتیں فراہم کرائی جائیں گی۔ ساتھ ہی ملک کے جن 19 میڈیکل کالجوں کو آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ کے مساوی درجہ دیا جا رہا ہے ان میں علی گڑھ کا میڈیکل کالج بھی شامل ہے۔ مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل، انفارمیشن ٹیکنالوجی مسٹر کپل سبل نے کہا کہ مجھے علم ہے کہ جے این میڈیکل کالج کی گرانٹ میں طویل عرصے سے تبدیلی نہیں ہوئی ہے لیکن اب ایک ماہ کے اندر مثالی طور پر ضروری گرانٹ میڈیکل کالج کے لیے منظور کی جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ وزارت برائے فروغ انسانی وسائل اس بات کو یقینی بنائے گی کہ جے این میڈیکل کالج کا شمار ملک کے صف اول کے میڈیکل کالجوں میں کیا جائے۔ مسٹر سبل نے کہا کہ یہ بدنصیبی ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی صحت کی شرح اوسط سے کافی نیچے ہے۔ مسٹر سبل نے اے ایم یو طلبہ سے اپیل کی ہے کہ وہ اس ادارے کے بانی سرسید احمد خاں کے خوابوں کو تعبیر سے ہمکنار کرنے کے لیے سماج میں مثبت رول انجام دیں اور غریبی و امراض کو دور کرنے کے پروگراموں میں اپنا تعاون پیش کریں۔ مسٹر سبل نے کہا کہ اگر یونیورسٹی بی ایس سی سطح پر صحت خدمات پر کورس کا بنیادی ڈھانچہ تیار کر لیتی ہے تو وزارت برائے فروغ انسانی وسائل مذکورہ پیشہ ورانہ کورس کو مکمل تعاون پیش کرے گی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) ضمیر الدین شاہ نے کہا کہ یونیورسٹی کے جے این میڈیکل کالج، ڈاکٹر ضی الدین احمد ڈینٹل کالج اور اجمل خاں طبیہ کالج میں قدیم طبی سہولیات اور آلات ہیں اور ان کے لیے موجودہ مالی تعاون ناکافی ہے۔ وائس چانسلر نے دونوں مرکزی وزرا سے تینوں اداروں میں پی جی سیٹیں بڑھانے کی بھی اپیل کی انھوں نے یونیورسٹی میں پیرامیڈیکل کورسیز کا ایک کالج قائم کرنے کی بھی اپیل کی جہاں پیرامیڈیکل کورسیز میں طب کو پیشہ ورانہ تربیت دی جا سکے۔ دونوں وزیر کو یادگاری نشانات بھی پیش کیے گئے۔ پرو وائس چانسلر بریگیڈیئر سید احمد علی اور رجسٹرار گروپ کیپٹن (ریٹائرڈ) شاہ رخ شمشاد نے گیسٹ ہاؤس میں وزرا کا خیر مقدم کیا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ایف ایس شیرانی نے انجام دیے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس'، 1 اکتوبر 2012

حکیم عبدالحمید کی خدمات پر قومی کانفرنس

علی گڑھ: جامعہ ہمدرد کے بانی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق چانسلر حکیم عبدالحمید کی خدمات کے اعتراف میں 'حکیم عبدالحمید کے حیات و خدمات' موضوع پر اجمل خاں طبیہ کالج کے شعبۂ کلیات کے زیرِ اہتمام قومی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے انڈین میڈیکل بورڈ اتر پردیش کے صدر ڈاکٹر انور سعید نے کہا کہ ہندوستان میں یونانی طریقۂ طب حکیم عبدالحمید کی خدمات سے ہی زندہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر حکیم صاحب نے ہمدرد دوا خانہ قائم نہ کیا ہوتا تو یہ ملک متعدد اہم یونانی ادویات سے محروم رہ جاتا ہے۔ پدم شری پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن نے کہا کہ حکیم عبدالحمید نے یونانی طب کی عالمی سطح پر شناخت قائم کی اور یونانی معالجین کو ایک اسٹیج مہیا کرایا جس سے یونانی طب کی ترویج و اشاعت ممکن ہو سکی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جنرل ضمیر الدین شاہ نے کہا کہ تعلیم اور طبِ یونانی کے میدان میں حکیم عبدالحمید کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ طبیہ کالج کے مسائل کو بھی حل کیا جائے گا تاکہ یہاں بھی مریضوں کو بہتر طبی سہولتیں مہیا ہو سکیں۔ کانفرنس کے ڈائریکٹر پروفیسر انیس اے انصاری نے کہا کہ حکیم عبدالحمید نے یونانی ادویات کے معیار میں اضافے کے لیے جو کارہائے نمایاں انجام دیے۔ ان کے سبب آج گھر گھر میں نہ صرف ان ادویات سے واقف ہیں بلکہ ان کو استعمال بھی کرتے ہیں۔ پروگرام سے جامعہ ہمدرد کے رجسٹرار ڈاکٹر فردوس وانی اور یونانی میڈیسن فیکلٹی کی ڈین پروفیسر شگفتہ علیم نے بھی خطاب کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 29 ستمبر 2012

افکارِ سرسید پر سیمینار

علی گڑھ: ادارۂ تہذیب الاخلاق کی جانب سے 'افکار سرسید' پر ایک روزہ قومی سیمینار کے افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیر الدین شاہ نے یونیورسٹی برادری سے اپیل کی ہے کہ وہ سرسید احمد خاں کے افکار و نظریات کو رہنما اصول بنا کر اس پر عمل کریں۔ جنرل شاہ نے کہا کہ سرسید احمد خاں نے تمام مذاہب کے لوگوں کا احترام کرنا سکھایا، انھوں نے جدید تعلیم کے فروغ کے لیے عملی اقدامات کیے اور اس ادارے کے طلبا کو ڈسپلن کا پابند بنایا۔ سرسید احمد خاں نے حقوق انسانی کا تحفظ کیا۔ ہم لوگوں کو بھی سرسید کی حیات اور خدمات سے روشنی حاصل کرنی چاہیے۔ وہ اپنی عملی زندگی میں ڈسپلن کے پابند ہیں اور حقوقِ انسانی پر سب سے زیادہ زور دیتے ہیں۔ تقریب کے مہمانِ خصوصی مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر جناب محمود الرحمٰن نے کہا کہ سرسید احمد خاں اردو صحافت کے موجد ہیں اور ان کا فلسفۂ حیات ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر جناب نسیم احمد نے کہا کہ سرسید احمد خاں کی ہمہ گیر شخصیت کی ورق گردانی کے لیے ایک عمر چاہیے اور یہ مسلم یونیورسٹی سرسید کی کوششوں کا ثمرہ ہے اور ہم سب فخر کرتے ہیں کہ یہ ملتِ اسلامیہ کی اہم ترین وراثت ہے جس کے ہم پاسبان ہیں۔ اس موقعے پر وائس چانسلر جنرل ضمیر الدین شاہ نے تہذیب الاخلاق کے 'سرسید نمبر' کا بھی اجرا فرمایا جب کہ ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی کی کتاب نذر سلیم کا اجرا جناب محمود الرحمٰن نے کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 2 اکتوبر 2012

مولانا آزاد اردو یونیورسٹی لکھنو کیمپس

لسانیات کے موضوع پر گفتگو

لکھنؤ: طلبہ میں لسانی شعور پیدا کرنا وقت کی اہم ضرورت

ہے۔ اس سے ہی زبان وبیان اور معیار واعتبار کے دروازے وا ہوتے ہیں اس کے بغیر بہت کچھ سیکھنے کے باوجود طالب علم خود کو زبان وبیان کے معاملے میں کمزور سمجھتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز اردو ادیب اور ماہر لسانیات پروفیسر نصیر احمد خاں نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی کے لکھنؤ کیمپس میں طلبا و طالبات سے خطاب کے دوران کیا۔ وہ کیمپس میں طلبہ سے لسانیات کے موضوع پر گفتگو کررہے تھے۔ پروفیسر نصیر احمد خاں نے کہا کہ زبان میں تبدیلی ایک فطری عمل ہے۔ اردو زبان کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ دوسری زبانوں کے اثرات کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور یہ زبان تغیر پذیر رہی ہے۔ پروفیسر نصیر احمد خاں نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ ہمارے عام ادبی معاشرے کی تربیت میں شاعری کا اہم کردار ہونے کے باوجود لسانی شعور کافی کم ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان کافی ثروت منداور زرخیز زبان ہے۔ ابتدا میں ڈاکٹر عمیر منظر نے پروفیسر نصیر احمد خاں کا طلبہ کے سامنے تعارف پیش کیا۔ مانو لکھنؤ کیمپس کے انچارج ڈاکٹر عبدالقدوس نے پروفیسر نصیر احمد خاں کا استقبال کیا۔ انھوں نے طلبا سے کہا کہ اس طرح کے خصوصی لیکچر سے آپ کو زیادہ فائدہ ملے گا۔ انھوں نے پروفیسر نصیر احمد کی گراں قدر ادبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ان کا کیمپس میں استقبال کیا۔ ڈاکٹر مجاہد الاسلام نے شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، عمیر منظر، لکھنؤ، 27 ستمبر 2012

مولانا آزاد اردو یونیورسٹی، حیدر آباد

دکن کی تہذیب، پروفیسر ولیم ڈیل رمپل کا لکچر

حیدرآباد: ہندوستان کی تاریخ میں دکن کا علاقہ بہت زیادہ نظر انداز کردیا گیا۔ یہاں تک کہ تاریخ میں مغل حکمرانوں پر اگر سو کتابیں ملیں گی تو دکن پر صرف ایک کتاب ہی ملے گی اور لکھنؤ کی تاریخ پر ایک الماری بھر کتابیں لکھی گئیں تو شہر حیدر آباد کی تاریخ پر صرف ایک ہی کتاب لکھی گئی، اس پس منظر میں میں سمجھتا ہوں کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا مرکز برائے مطالعات دکن ایک امید کی کرن ہے اور اس مرکز کے تحت دکن اور دکنی تاریخ پر سنجیدہ کام ہوگا۔ ان خیالات کا اظہار مشہور برطانوی مورخ اور براڈ کاسٹر ولیم ڈیل ریمپل نے کیا۔ وہ آج مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں مرکز برائے مطالعات دکن میں 'دکن کی مشترکہ تہذیب' کے موضوع پر افتتاحی لکچر دے رہے تھے۔ اردو یونیورسٹی میں پروفیسر ہارون خان شیروانی کے نام معنون دکن سنٹر کی افتتاحی تقریب میں ولیم ڈیل ریمپل نے اپنے لکچر میں مزید کہا کہ مغلوں کے مقابلے ہندوستان میں اگر کہیں مشترکہ تہذیب کی کافی گہری جڑیں موجود تھیں تو وہ صرف دکن کا ہی علاقہ ہے۔ دکن کی مشترکہ تہذیب کی مثال دیتے ہوئے برطانوی مورخ ولیم ڈیل ریمپل نے مزید کہا کہ دہلی میں تو اسلامی تہذیب حاوی تھی جب کہ حیدر آباد میں مشترکہ تہذیب کی جڑیں اس قدر گہری تھیں کہ حیدر آباد میں لباس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی شناخت مشکل تھی۔ مورخ غلام حسین خاں کے حوالے سے ولیم نے کہا کہ محرم کے تعزیہ جلوس میں بھی مسلمان جانوروں کی کھالیں پہن کر شرکت کرتے تھے جو کہ بالکلیہ طور پر ہندوؤں کے رسم ورواج کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ دوسری جانب ہندو بھی ننگے پیر تعزیہ جلوس میں حسین حسین کا نعرہ بلند کررہے تھے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے مرکز برائے مطالعات دکن کے متعلق اپنی نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے جناب ولیم ڈیل ریمپل نے کہا کہ انھیں امید ہے کہ اردو یونیورسٹی کے اس مرکز میں دکن کی تاریخ اور دکنی موضوعات پر سنجیدگی سے کام ہوگا۔ قبل ازیں ہارون خان شیروانی مرکز برائے مطالعات دکن کی اعزازی ڈائرکٹر ڈاکٹر سلمٰی فاروقی نے افتتاحی کلمات کہے۔ انھوں نے کہا کہ اس سنٹر کے تحت تین جنوبی ریاستوں آندھرا پردیش، کرناٹک اور مہاراشٹر کے خطے کی تاریخ کا احاطہ کیا جائے گا۔ وائس چانسلر اردو یونیورسٹی پروفیسر محمد میاں نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ مرکز مطالعات دکن میں سنجیدہ کام ہوگا۔ وائس چانسلر نے دکن کے عوام کو یقین دلایا کہ وہ اپنے بقیہ ایام کار میں مرکز کو فروغ دینے کی ہر ممکنہ کوشش کریں گے۔ پروفیسر سلیمان صدیقی، پروفیسر مولانا آزاد چیئر وسابق وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ نے مہمان کا تعارف پیش کیا۔ قبل ازیں پروگرام کا آغاز ڈاکٹر فہیم اختر ندوی، اسسٹنٹ پروفیسر کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ پروگرام کی کارروائی افسر تعلقات عامہ عابد عبدالواسع نے چلائی۔ تقریب میں یونیورسٹی اسٹاف اور طلبہ کے ساتھ ساتھ شہر کی ممتاز شخصیتوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی جن میں سابق الیکشن کمشنر جے ایم لنگڈوہ، آئی اے ایس افسران تراب الحسن، جناب نریندر لوتھرا اور جنت حسین، وی کے باوا، پدم شری جیلانی بانو، اندرادھن راجگیر، پروفیسر فاطمہ علی خان، پروفیسر اشرف رفیع ودیگر نے شرکت کی۔

روزنامہ 'منصف' حیدرآباد، 12 ستمبر 2012

چودھری چرن سنگھ میرٹھ

یوم اساتذہ پر جلسہ

میرٹھ: شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے پریم چند سیمینار ہال میں سابق صدر جمہوریہ اور ماہر تعلیم ڈاکٹر سرو پلی رادھا کرشنن کے یوم پیدائش پر ہر سال کی طرح امسال بھی جوش وخروش کے ساتھ منایا گیا جس میں طلبا و طالبات نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ پروگرام کی صدارت صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اسلم جمشید پوری اور مہمان خصوصی کے طور پر محترم گریش شکلا (سابق آفیسر اسٹیٹ بینک آف انڈیا، میرٹھ) نے شرکت کی جب کہ نظامت کے فرائض شعبہ کی استاد ڈاکٹر شاداب علیم نے انجام دیے۔ پروگرام کا آغاز سمیع اللہ الائی نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ ہدیہ نعت فرح ناز اور سعید احمد

سہارنپوری نے اپنی مترنم آواز میں غزل پیش کر کے سماں باندھا۔ بعد ازاں گلستاں، روبی خان، اسماں پروین، عشرت یعقوب، روشنا خاتون، روما خاتون اور سمت کمار نے اساتذہ کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی اور اساتذۂ کرام کو تحائف پیش کیے۔ اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر آصف علی نے کہا کہ آج کا دن سبھی اساتذہ کے لیے یوم احتساب بھی ہے۔ آج ہمیں یہ غور کرنا چاہیے کہ ہم استاد کا فرض بخوبی انجام دے رہے ہیں یا نہیں۔ جناب گریش شکلا نے اپنے خطاب میں اک لویہ کی 'گرودکشنا' کے تاریخی واقعے کا ذکر کرتے ہوئے اساتذہ کو طلبا کے مستقبل کا معمار بتایا۔ آخر میں ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے تفصیلی صدارتی خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے صدر جمہوریہ ڈاکٹر سرو پلی رادھا کرشنن اور اپنے استاد ڈاکٹر منظر کاظمی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ بچوں کے لیے اساتذہ کا کردار ماں باپ سے بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ وہ تو اس کو دنیا میں لانے کا سبب اور اس کی دنیاوی ضروریات کے کفیل ہوتے ہیں جب کہ اس پتھر کو تراش خراش کر خاک یا موتی بنانا استاد کا کام ہے۔ اس موقعے پر شعبہ کے اساتذہ، ملازمین اور طلبا وطالبات موجود رہے۔

پریس ریلیز، اسلم جمشید پوری، میرٹھ، 5 ستمبر 2012

جامعہ طبیہ دیوبند

اردو کی ترویج وتوسیع پر زور

دیوبند: طب یونانی کے ماہر حکیم وڈاکٹر محمد اکبر کوثر نے جامعہ طبیہ دیوبند میں منعقدہ پریس کانفرنس کے دوران اخباری نمائندوں سے گفتگو کے دوران کہا کہ اردو ہماری

تہذیب کی شناخت ہے اور خوش کن امر یہ ہے علمی سرزمین دیوبند کے مانند علم و ہنر و تہذیب و ثقافت کی شعاعیں ریاست تمل ناڈو پر بھی بکھری ہوئی ہیں اور پورا خطہ دینی و دنیاوی تعلیم سے آراستہ ہوکر ہادی عالم کا پیغام عام کررہا ہے۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ تمل ناڈو کے ضلع ویلور کے قصبہ ویلیم باڑی میں حکومتی سطح پر بھی تمام شعبہ جات میں اردو کا چلن عام ہے نیز تمام دفتری امور بھی اردو میں انجام پارہے ہیں۔ اس دوران انھوں نے تمل ناڈو میں قائم صد سالہ قدیم اسلامیہ انٹر کالج کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ رواں دور علم و آگہی کا دور ہے جس میں اعلیٰ تعلیم کے علاوہ کوئی چارہ گر نہیں۔ اس موقعے پر انھوں نے ریاستی حکومت کے ذریعے ڈاکٹر انور سعید کو بھارتیہ چکتسا پریشد کا چیئرمین نامزد کرنے پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس اقدام کو قابل قدر لائق ستائش قرار دیا۔ حکیم موصوف نے جامعہ طبیہ کے سکریٹری ڈاکٹر انور سعید، وائڈنسٹریٹر ڈاکٹر اختر سعید، کی سعی پیہم اور جدوجہد کو لائق ستائش قرار دیتے ہوئے یہ امید جتائی کہ مستقبل میں وہ طب یونانی کے فروغ کے بابت مثبت اقدامات کرتے رہیں گے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی 24 ستمبر 2012

میرا گرلز کالج اودے پور

اردو افسانہ پر توسیعی خطبہ

اودے پور: 25 ستمبر "ترقی پسندی تبدیلی اور ارتقا کا نام ہے۔ تبدیلی اور ارتقا کے اسی عمل نے انسان کو آج اس مقام تک پہنچایا ہے جہاں اس نے تسخیر کائنات کو ایک معمولی کارنامہ ثابت کردیا ہے۔ جو بات ترقی پسندی کے حوالے سے عمومی طور پر کہی جاسکتی ہے اس کا اطلاق ادب پر بھی ہوتا ہے ترقی پسند ادب اس وقت سے تخلیق ہونا شروع ہوگیا تھا جب انسان نے تبدیل ہوتے ہوئے حالات اور تبدیلی کی خواہش نے تخلیقی سطح پر اظہار کے پیرائے تلاش کرنا شروع کردیے تھے آج ہم جس عظیم تہذیبی ورثے کے وارث ہیں اس کا ایک بڑا حصہ ایسی ہی تخلیقات پر مشتمل ہے جو اپنے عہد کے تناظر میں حیات آفریں اقدار کی ترجمانی کرتے ہوئے تخلیق ہوا ہے۔" ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر مرزا شفیق حسین شفق صدر شعبہ اردو حسین آباد گورنمنٹ کالج لکھنؤ نے گورنمنٹ میرا گرلز پی جی کالج اودے پور کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام منعقدہ اس توسیعی خطبے میں کیا جس کا عنوان 'ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ' تھا۔ ڈاکٹر مرزا شفیق نے اپنے توسیعی خطبے میں ترقی پسند افسانے کے ارتقائی سفر پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز 1936 سے ہوا لیکن 1932 میں سجاد ظہیر نے 'انگارے' کی اشاعت سے اس کی داغ بیل ڈال دی تھی۔ توسیعی خطبے کے اختتام پر طالبات نے ترقی پسند شاعری، تنقید، صحافت، ناول اور ڈرامے کے تعلق سے بہت سے سوالات کیے۔ ڈاکٹر مرزا شفیق نے طالبات کے سوالات کا اطمینان بخش جواب دیا۔ خطبے سے قبل اس پروقار تقریب کی مہمان خصوصی اور کالج کی پرنسپل ڈاکٹر سویتا جوشی نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ ڈاکٹر مرزا شفیق حسین شفق اردو کے مشہور و معتبر نقاد ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ان کا آج کا فکرانگیز خطبہ ہمارے کالج کی طالبات کے علم میں اضافے کے ساتھ ساتھ ان کی مستقبل سازی میں اہم کردار ادا کرے گا۔ شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر قمرالدین نے اس موقع پر اپنی خوشی ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے ڈاکٹر مرزا شفیق حسین شفق کی اسلامی موضوعات پر بہت سی تقاریر سنی ہیں لیکن آج ہم ان کی مختلف الجہات شخصیت کی ایک نئی جہت سے متعارف ہورہے ہیں ادب اور مذہب دونوں پر ان کی مضبوط گرفت ہے۔ شعبہ اردو کی فعال استاد اور معروف افسانہ نگار ڈاکٹر ثروت خان نے ڈاکٹر مرزا شفیق کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ ابھی نوجوان ہیں اور انھوں نے اس نوجوانی میں جتنا ادبی کام کیا ہے بہت سے لوگ زندگی کے آخری مرحلے پر پہنچ کر بھی نہیں کرپاتے ہیں۔ اس موقعے پر کالج کے وائس پرنسپل انصارالحق، وجے لکشمی سرونا، شعبہ انگریزی کی صدر ڈاکٹر ندھی ابراہم، شعبہ ہندی کی صدر ڈاکٹر چندرکانتا بھنسل، شعبہ سوشالوجی کے صدر ڈاکٹر اقبال شیخ، ہندی ایسوسی ایشن کی کنوینر ڈاکٹر منجو ترپاٹھی، شعبہ موسیقی کی صدر سیما راٹھور، اسسٹنٹ ریجنل ڈائرکٹر کالج آف ایجوکیشن ڈاکٹر ترانہ پروین، شعبہ پلیٹکل سائنس کی صدر ڈاکٹر ریتو متھارو، شعبہ اردو کی استاد طاہرہ بانو وغیرہ موجود رہیں۔ شعبہ اردو کی استاد محترمہ تسنیم خانم نے نظامت کے فرائض بحسن وخوبی انجام دیے اور کالج کی فعال طالبہ فخر النساء نے شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، مرزا شفیق حسین شفق، اودے پور، 25 ستمبر 2012

شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی، بہار

شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی کی خدمات

پٹنہ: شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی کی موجودہ سرگرمیوں کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شعبے کا زریں دور اب پھر شروع ہورہا ہے۔ اردو جرنل کی اشاعت نے شعبے کو ہندوستان کے چند اہم شعبوں کی صف میں لاکھڑا کیا ہے۔ اس کا ہر شمارہ اہم ہوتا ہے، مگر تازہ شمارہ دیکھ کر بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ اسے عالمی پیمانے کے کسی بھی رسائل کے ساتھ بڑی آسانی کے ساتھ رکھا جاسکتا ہے۔" ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے آج شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی سے شہاب ظفر اعظمی کی ادارت میں شائع ہونے والے 'اردو جرنل 3' کا اجرا کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی میری مادر علمی ہے، اس لیے مجھے یہاں آکر نہ صرف اپنے اساتذہ سے ملنے کا موقع ملتا ہے، بلکہ بے انتہا خوشی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ انھوں نے قومی اردو کونسل کی جانب سے شعبے کو حاصل کلیم الدین احمد خطبے کی طرح پٹنہ کالج کو بھی ایک خطبے کی پیش کش کی اور کہا کہ شعبۂ اردو کی جانب سے تجویز پیش کی جائے تو علامہ جمیل مظہری پر ایک سیمینار کے لیے بھی کونسل ایک لاکھ روپے کی خطیر رقم دے گی۔ نظامت جرنل کے مدیر شہاب ظفر اعظمی اور صدارت کے فرائض پروفیسر علیم اللہ حالی نے انجام دی جب کہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر امتیاز احمد، ڈاکٹر قاسم خورشید، اور پروفیسر اسلم آزاد نے شرکت کی۔ شہاب ظفر اعظمی نے مہمانوں کا استقبال کرنے کے بعد جرنل کے تازہ شمارے پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا یہ شمارہ دو مخصوص گوشوں پر مشتمل ہے۔ منٹو صدی کے موقعے پر ایک گوشہ منٹو کی شخصیت اور فن کا احاطہ کرتا ہے، جب کہ دوسرا گوشہ غیر افسانوی اصناف ادب کا مطالعہ پیش کرتا ہے۔ تین سو صفحات کا حامل یہ شمارہ صوری اور معنوی طور پر گوناگوں خوبیوں کا حامل ہے۔ شہاب ظفر اعظمی نے مزید کہا کہ آج سے تین سال قبل جرنل کی اشاعت کا سلسلہ نامساعد حالات میں شروع ہوا تھا مگر ایک خواب تھا جس کی تعبیر کی تلاش کے جنون نے مجھے اس سفر میں آگے اور آگے بڑھنے پر مجبور کیا اور آج جب میں سفر کی تیسری منزل پر کھڑا ہوں میں اپنے خوابوں پہ فخر اور خوشی محسوس کررہا ہوں۔ شکریے کی رسم شعبے کی صدر محترمہ ڈاکٹر اشرف جہاں نے جب کہ مہمانوں کا استقبال شعبے کی چند طالبات نے گلہائے عقیدت پیش کرکے کیا۔

پٹنہ: شعبۂ اردو میں اردو جرنل کے تازہ شمارے کی رسم اجرا کرتے ہوئے ڈاکٹر خواجہ اکرام، پروفیسر علیم اللہ حالی ودیگر

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 اکتوبر 2012

مہاتما
''دنیا میں سب ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور میل جوا
تو دنیا کا روپ بدل جائے۔''
Gandhi
सत्यमेव जयते
وزارت اطلاعات ونشریات
حکومت ہند
davp 22201/13/0022/1213

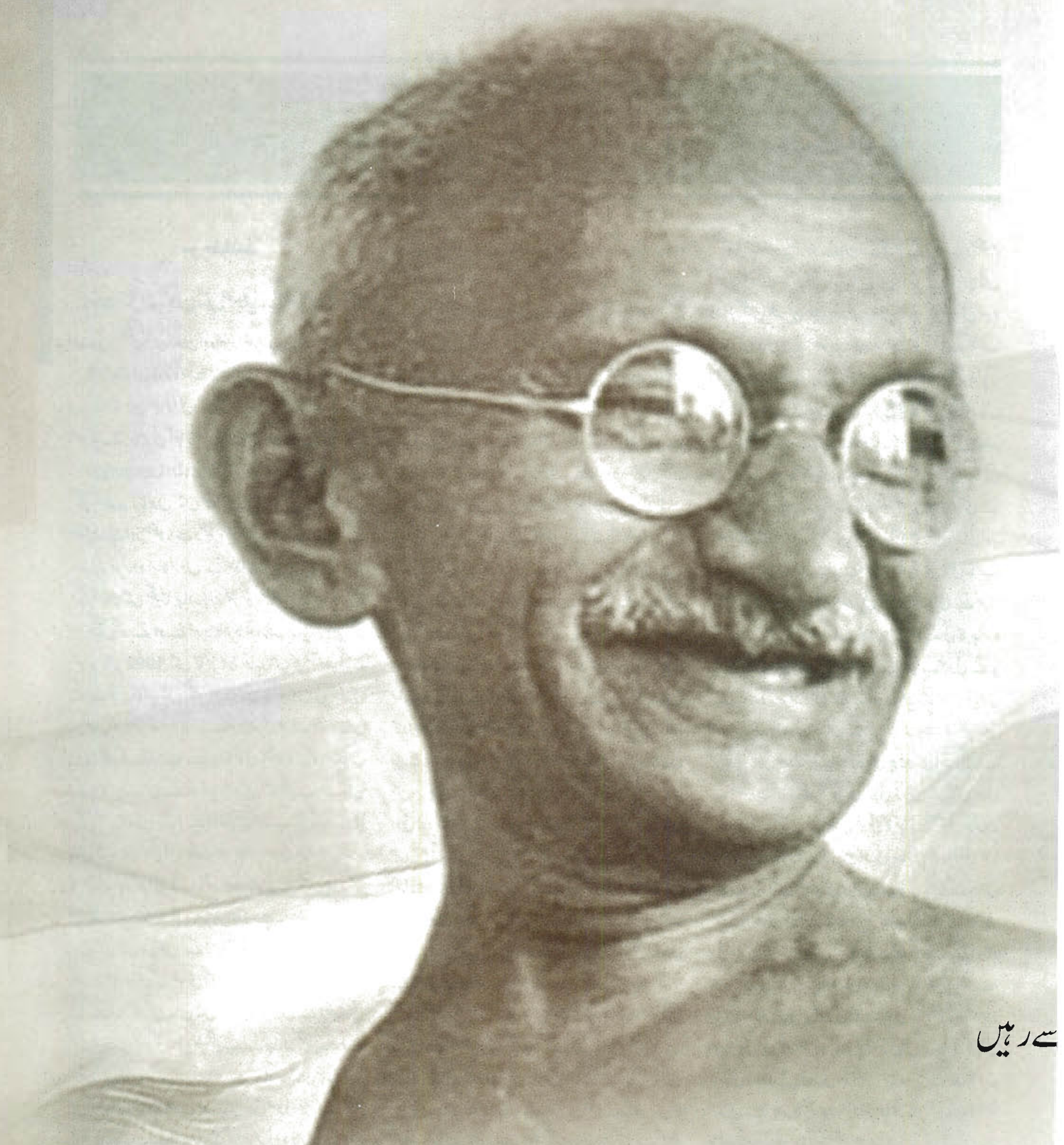

2 اکتوبر

بین الاقوامی یوم عدم تشدد

عالمی اردو نامہ

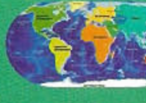

برطانیہ

'ہندوستانی زبانوں میں صوفیائے کرام کی آواز'

لندن: علمی مجلس لندن اور نہرو سینٹر لندن نے مشترکہ طور پر 24,25 اور 26 اگست 2012 کو شہر لندن میں ایک سہ روزہ بین الاقوامی سیمینار 'ہندوستانی زبانوں میں صوفیائے کرام کی آواز 'Sufu Voice in Indian Languages' اہتمام کیا۔ اس سیمینار میں ہندوستان کی مختلف زبانوں میں صوفیائے کرام کے ملفوظات، تصنیفات اور منظومات وغیرہ پر مختلف ممالک سے آئے ہوئے سرکردہ اسکالروں نے مقالے پیش کیے۔ سیمینار کے آغاز میں سنگیتا بہادر ڈائرکٹر نہرو سینٹر نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے نہرو سینٹر کا تعارف کرایا ور بتایا کہ نہرو سینٹر 1992 میں قائم ہوا تھا۔ اس کا مقصد ایک طرف تو برطانیہ میں مقیم ہندوستانی باشندوں کی تہذیبی امنگوں کو برسرِ عام لانا رہا ہے تو دوسری طرف ہندوستان کی رنگارنگ تہذیب سے برطانوی باشندوں کو روشناس کروانا ہے۔ اس کے بعد ضیاء الدین احمد شکیب صدر نشین علمی مجلس لندن نے اپنے استقبالیہ خطاب میں کہا کہ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا ملک ہو جہاں صوفی ازم اس قدر وسعت اور گہرائی کے ساتھ پھلا پھولا ہے جس قدر کہ برصغیر ہندوستان میں سرسبز ہوا ہے۔ ہندوستان کی سرزمین میں ویدوں کے زیر اثر صدیوں سے ایک ایسی فضا قائم ہو چکی تھی جو کسی بھی روحانی تعلیم و تبلیغ کے لیے نہایت سازگار تھی۔ ان میں رومانی تجربوں کے اظہار کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔ ڈاکٹر شکیب نے کہا کہ کشمیر سے لے کر راس کماری تک اور آسام سے لے کر ملتان تک شاید ہی کوئی ایسا چھوٹا گاؤں ہو جہاں کوئی صوفی بزرگ آرام فرما نہ ہو بہت سے صوفیائے کرام عربی و فارسی زبانوں کے علاوہ علاقائی زبانوں کے ذریعے اپنا پیام پہنچایا جو نہ صرف مختلف دوہوں اور گیتوں کی شکل میں ہے بلکہ ان میں اعلیٰ درجے کے نثری اور شعری کارنامے بھی شامل ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک سیمینار میں ان ساری زبانوں کی نمائندگی ہو سکے۔ تاہم اس سیمینار میں کشمیری، پنجابی، سندھی، برج بھاشا، دکنی، گجری، اودھی، آسامی، تلگو اور تمل زبانوں کی نمائندگی ہوئی۔ افتتاحی کلمات کے بعد لارڈ خالد حمید نے سیمینار کے افتتاح کے طور پر شمع روشن کی اس کے بعد پروفیسر شاہد مہدی نائب صدر نشین انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز نے اپنے نہایت عالمانہ کلیدی خطبے میں صوفی ازم کے مختلف تصورات کی وضاحت کرتے ہوئے ہندوستان بھر میں صوفی ازم کے پھیلنے کی تاریخ بیان کی۔ موصوف نے اردو و فارسی کے علاوہ دکنی اودھی اور برج بھاشا میں صوفیوں کے ملفوظات اور ان کے تراجم پیش کیے۔ انھوں نے بتایا کہ صوفیوں کی تعلیم کا اصل سرچشمہ قرآن ہے اور اصل پیام توحید ہے۔ بعض صوفی نے قرآن مجید کے ایسے سلیس ترجمے کیے ہیں جن کا جواب نہیں مثلاً فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی کا ترجمہ سورہ فاتحہ یوں ہے: سب سے سراہت من موہن کو ہے جو سنسار کا پالنہار ہے' بڑا مہر والا ہے جس کے بس میں چکوتی کا دن ہے' اور ہم تجھ ہی کو پوجتے ہیں اور تیرا ہی آسرا چاہتے ہیں، چلا ہم کو سیدھی راہ، ڈگمگ نہیں ان لوگوں کی جن پر تیری دیا ہوئی ہے نہ ان کی جن پر تیری جھنجھلاہٹ ہوئی اور نہ کھوئے ہوؤں کی اور نہ بھٹکے ہوؤں کی۔ اسی طرح لا اکراہ فی الدین کا ترجمہ: پریم میں کوئی دباؤ نہیں، کیا ہے۔ پروفیسر شاہد مہدی نے اپنی تقریر میں برصغیر کے بیشتر علاقوں کے سرکردہ صوفیا کے پیامات کے اقتباسات پیش کیے۔ دوسرے دن ہفتہ 25 اگست کو ڈاکٹر تقی عابدی نے حضرت سید محمد گیسو درازؒ سے منسوب معرکۃ الآرا کتاب معراج العاشقین پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے معراج العاشقین پر اب تک جو کام ہو چکا ہے اس کا تنقیدی جائزہ لیا اور معراج العاشقین کے مکمل متن کی پہلی دفعہ تحقیق کے ساتھ تدوین کی ہے اور اس کا انگریزی ترجمہ پیش کیا۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل جو کیوٹو یونیورسٹی جاپان میں اردو کے پروفیسر ہیں، نے حضرت امین الدین اعلیٰ اور حضرت محمود خوش وہاں کی صوفیانہ تعلیمات کا موازنہ پیش کیا۔ ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز جو اسکول آف اورینٹل اینڈ آفریکن اسٹڈیز میں اردو کے استاد ہیں اور دکنی کے ماہر ہیں، نے صوفیائے دکن کی شاعری کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے ان کے کلام کے انتخاب کو منظوم انگریزی کے ساتھ پیش کیا۔ اس دن دوسرے اجلاس میں ڈاکٹر معین الدین جینابڑے پروفیسر اردو جواہر لعل نہرو یونیورسٹی دہلی نے حضرت شاہ شریفؒ کی کتاب کشف الاذکار کا تاریخی، لسانی اور موضوعاتی جائزہ پیش کیا۔ یونیورسٹی آف کیلی فورنیا کی ریسرچ اسکالر مس صبح دیال نے ملا وجہی کی سب رس کے صوفیانہ پہلو پر اپنا تحقیقی مقالہ پیش کر کے داد حاصل کی۔ پروفیسر عبدالستار دلوی، سابق پروفیسر و صدرِ شعبہ اردو و حال ڈائرکٹر انجمن اسلام ممبئی نے حضرات شاہ ترابؒ کی 'من سمجھاون' کا تاریخی، لسانی اور موضوعاتی جائزہ لیا۔ تیسرے اجلاس میں سکریٹری غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے مرزا غالب کے صوفیانہ تصوارات کا اور ان کی زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے اس بات پر بحث کی کہ آیا غالب صوفی تھے یا نہیں۔ پروفیسر قدوائی نے کہا کہ وہ جو کچھ ہوں بنیادی طور پر ایک آزاد رہ انسان تھے۔ اس کے بعد ڈاکٹر زبیر قریشی سابق صدر شعبۂ اردو فارسی یونیورسٹی آف گجرات نے حضرت خوب محمد چشتیؒ کی گجری زبان میں لکھی ہوئی کتاب خوب ترین یا امواج خوبی کا نہایت تفصیلی عالمانہ جائزہ لیا۔ یاد رہے کہ سیمینار کی ساری کارروائی اور سارے مضامین انگریزی زبان میں پیش کیے گئے۔ اس آخری اجلاس کی صدارت ڈاکٹر لیونارڈ لیوسن جو ایگزیٹر یونی ورسٹی انگلستان میں اسلامیات اور تصوف کے استاد ہیں، نے کی۔ اس سیمینار میں پروفیسر شاہ منوہر پانڈے، سابق استاد ہندی یونیورسٹی آف ناپولی، اٹلی، ڈاکٹر مسعود انور علوی پروفیسر عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ڈاکٹر علی آسانی، ہارورڈ یونیورسٹی، ڈاکٹر انیتا دودیجا، صدر شعبہ سندھی جے ہند کالج پونا، ڈاکٹر سجاد حسین آسام، ڈاکٹر فاطمہ بیگم پروین، ڈاکٹر مظفر شہ میری حیدر آباد نے اپنے مقالات پیش کیے۔ ڈاکٹر نسیم اختر ہانز استاد اردو ہندی ہارورڈ یونیورسٹی اور پروفیسر رتن لال ہنگلو حیدر آباد یونیورسٹی کے مقالات بھی اس سیمینار میں پڑھے گئے۔

روزنامہ 'منصف' حیدر آباد، 27 ستمبر 2012

بینکاک

عالمی زبانوں کے رسم الخط پر سیمینار

بینکاک : بینکانک میں عالمی زبانوں کے حروف اور رسم الخط پر منعقدہ بین الاقوامی سیمینار میں ہندوستان سے

پروفیسر ڈاکٹر سید سجاد حسین صدر، شعبہ اردو، مدراس یونی ورسٹی نے بحیثیت جج نمائندگی کی۔ یہ بین الاقوامی سیمینار International Alphabet Association, Korea کے زیر اہتمام یکم اکتوبر تا 4 اکتوبر کو بینگ کاک کے پانچ ستارہ ایمباسڈر ہوٹل میں منعقد ہوا۔ اس سیمینار میں دنیا بھر سے 33 ممالک کے ماہرین لسانیات اور علمائے زبان نے اپنی اپنی زبانوں کے حروف اور رسم الخط کی تشکیل اور آغاز و ارتقا پر فکر انگیز مقالے پیش کیے۔ مقالوں کا جائزہ لینے اور بہترین تین مقالوں کو انعام کا مستحق قرار دینے کے لیے دنیا بھر سے سات ججوں کو دعوت دی گئی جن میں ہندوستان سے پروفیسر ڈاکٹر سید سجاد حسین صدر، شعبہ اردو، مدراس یونی ورسٹی کو بحیثیت جج شریک ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ دنیا کے مختلف ممالک سے تشریف لائے ہوئے سات ججوں میں سے چیف جج کا انتخاب عمل میں آیا اور اس عہدہ کے لیے پروفیسر ڈاکٹر سید سجاد حسین صدر، شعبہ اردو، مدراس یونی ورسٹی کا نام نامی تجویز ہوا۔ اس طرح آپ نے اس بین الاقوامی سیمینار میں بحیثیت چیف جج اپنی خدمات انجام دے کر اردو زبان اور اہل اردو کی آن بان شان بڑھائی ہے۔

پریس نوٹ، ڈاکٹر امان اللہ ایم بی، ڈپارٹمنٹ آف عربک، پرشین اینڈ اردو، یونیورسٹی آف مدراس، میرینا کیمپس، چینئی

ابوظہبی

ادبی نشست اور مشاعرہ

ابوظہبی: صوبہ بہار کے معروف شاعر اور افسانہ نگار شفیع مشہدی اور مشہور ادیبہ ذکیہ مشہدی کے اعزاز میں متحدہ عرب امارات کے مرکزی شہر ابوظہبی میں 'بہار انجمن' کی جانب سے ایک ادبی نشست و مشاعرے کا اہتمام بروز جمعہ بتاریخ 31 اگست بمقام انڈین اسلامک سینٹر ابوظہبی میں کیا گیا جس کی صدارت جناب شاہد احمد یحییٰ نے فرمائی اور مہمانان خصوصی کی مسند پر محترم شفیع مشہدی اور محترم ذکیہ مشہدی جلوہ افروز تھے۔ نظامت کے فرائض امارات میں گزشتہ 30 سالوں سے مقیم معروف شاعر اور

دلمسوں کی خوشبو کے خالق انور آفاقی نے انجام دیے۔ بہار انجمن ابوظہبی کے کنوینر عمر کیفی اور منتظم اعلیٰ سید شکیل اشرفی نے بہار انجمن کی غرض و غایت سے سامعین کو روشناس کرایا نیز مہمانان کا استقبال کیا۔ ادبی نشست کا آغاز کلام پاک سے ہوا۔ پھر انوار آفاقی نے مہمان خصوصی جناب شفیع مشہدی اور محترمہ ذکیہ مشہدی کا تعارف کرایا۔ سید شکیل اشرفی نے مہمانان خصوصی پر ایک مضمون پڑھا جو ان کے ادبی کارناموں پر مبنی تھا۔ بہار انجمن کی جانب سے شفیع مشہدی اور ذکیہ مشہدی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں شال پیش کی گئی۔ محترمہ ذکیہ مشہدی نے اپنا افسانہ 'بدّو کا ہاتھی' پڑھ کر سنایا۔ اس کے بعد شفیع مشہدی نے اپنا افسانہ پیش کیا جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر مبنی تھا۔ شکیل احمد نے انجمن کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور زیادہ سے زیادہ انجمن سے جڑنے کی درخواست بھی کی۔ صدر شاہد احمد نے شکریہ ادا کیا۔ دوسرا دور مشاعرے کا جس کی صدارت کے لیے انور آفاقی نے محترمہ ذکیہ مشہدی صاحبہ سے درخواست کی، جسے محترمہ نے قبول کیا اور مہمان خصوصی شفیع مشہدی تھے۔ یہ شعری نشست کوئی ڈھائی گھنٹے چلی۔ جن شعرا کے اسمائے گرامی یوں ہیں فرہاد جبریل، انور آفاقی، خالد نسیم، ڈاکٹر عاصم، واسطی اور اخیر میں مہمان خصوصی شفیع مشہدی نے اپنی غزلیں اور نظمیں پیش کیں۔ محترمہ ذکیہ مشہدی نے صدارتی خطاب میں اراکین 'بہار انجمن'، شعرا اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

پریس نوٹ، قاسم خورشید، پٹنہ، 1 اکتوبر 2012

دبئی

دبئی میں عالمی مشاعرہ

دبئی: گزشتہ شب دبئی کے شیخ راشد آڈیٹوریم میں عالمی مشاعرے و کوی سمیلن کا انعقاد عمل میں آیا۔ ہماری سوسائٹی کی جانب سے منور رانا کی صدارت اور ڈاکٹر کمار وشواس کی نظامت میں منعقد ہوئے اس عالمی مشاعرے میں دنیا کے معروف و مقبول شعرائے کرام نے اپنا کلام پیش کیا۔ منور رانا کی 2 نئی کتابوں شہدابہ اور سخن سرائے کی اجرا کی رسم دبئی میں ہندوستان کے قونصلٹ جنرل سنجے ورما کے بدست ادا کی گئی۔ سامعین سے کھچا کھچ بھرے آڈیٹوریم میں ہندوستان کے علاوہ پاکستان، دبئی، ابوظہبی اور قطر کے شاعروں نے اپنا کلام پیش کیا۔ مشاعرہ رات 9 بجے سے شروع ہو کر صبح 3 بجے اختتام پذیر ہوا۔ ساری رات لوگ ادبی فضا میں اپنے پسندیدہ شاعروں کے کلام سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 2 اکتوبر 2012

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبر نامہ

قومی اردو کونسل میں صابر گوڈر کا استقبالیہ

ہم سرحدوں میں قید نہیں ہیں، قومی اردو کونسل کا دائرہ کار بین الاقوامی بھی ہوسکتا ہے: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نئی دھلی: ہم سرحدوں میں قید نہیں ہیں اور ہم نے اپنے اردو لرننگ کورس کے ذریعے پوری دنیا کے لیے دروازے کھول دیے ہیں تاکہ لوگ اردو زبان سیکھ سکیں اور اس زبان سے استفادہ کرسکیں۔قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے ان الفاظ کے ساتھ جناب صابر گوڈر کا استقبال کیا۔انہوں نے مزید کہا کہ قومی اردو کونسل کا دائرہ کار بنیادی طور پر قومی سطح پر ہے لیکن جہاں جہاں اردو کی بستیاں موجود ہیں وہاں بھی زبان، ادب اور تہذیب و ثقافت کے حوالے سے کام کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے اور ہم اس سلسلے میں مزید پیش رفت کر رہے ہیں۔ جناب صابر گوڈر ماریشس میں مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ کے شعبہ اردو میں پروفیسر اور صدر کے عہدے پر فائز ہیں۔ دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر جناب ابن کنول نے صابر گوڈر کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ صابر گوڈر کا تعلق ہندوستان سے ہی رہا ہے اور ان کے آباواجداد برسوں پہلے ماریشس جا کر بس گئے تھے۔ وہاں کی مادری زبان اردو نہیں ہے لیکن وہاں اردو کا بول بالا ہے اور اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے۔صابر گوڈر کے لہجے سے ایسا بالکل نہیں لگتا کہ اردو ان کی مادری زبان نہیں ہے۔اردو کی نئی بستیوں میں ماریشس آج ایسا ملک ہے جہاں اردو کا سب سے زیادہ فروغ ہورہا ہے۔ جناب صابر گوڈر نے ماریشس کی ادبی و علمی صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہاں اردو کا مستقبل روشن ہے اور طالب علموں کی بڑی تعداد اردو زبان و ادب پڑھنا چاہتی ہے۔ وہاں ریڈیو اور ٹی وی پر روزانہ اردو زبان میں پروگرام نشر ہوتے ہیں، ابتدائی، ثانوی اور یونیورسٹی کی سطح پر اردو تعلیم کا نظام ہے۔ہم وہاں اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں کیوں کہ ہمیں اردو سے محبت ہے اور ہم اپنے آبا واجداد کی تہذیب و ثقافت کو ہمیشہ باقی رکھنا چاہتے ہیں۔

جناب صابر گوڈر نے ماریشس کی اردو یونین کے صدر کا خط بھی پڑھ کر سنایا۔ پروفیسر عبدالحق نے صابر گوڈر کی باتوں سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ ماریشس میں آپسی اتحاد و میل جول کا بے مثال منظر دیکھنے کو ملتا ہے وہاں مساجد میں اردو زبان میں جمعہ کے خطبے ہوتے ہیں اور مساجد میں اردو بولنے، سمجھنے والے کثیر تعداد میں رہتے ہیں۔ پروفیسر اختر الواسع نے ماریشس کے اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے کہا کہ ماریشس اردو کی نئی بستیوں میں اردو کے فروغ میں سرفہرست ہے۔وہاں ایک چھوٹے ہندوستان کا تصور ہوتا ہے جہاں مختلف نسلوں، مذاہب کے لوگ اتحاد و اتفاق سے رہتے ہیں۔قومی اردو کونسل وہاں اردو کی ترقی میں اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔ آخر میں ڈائرکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ وہ کونسل کی آئندہ میٹنگ میں ماریشس کے اردو اداروں اور قومی اردو کونسل کے درمیان اشتراک پر تبادلہ خیال کریں گے۔اس موقع پر کونسل کے ممبران شیخ علیم الدین اسعدی اور حافظ مطلوب کریم نے جناب صابر گوڈر کو کونسل کی اہم مطبوعات اور کونسل کے رسائل پیش کیے۔ اس موقع پر پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر محمد نعمان خاں، ڈاکٹر انوار عالم پاشا اور کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر جناب نسیم احمد، اسسٹنٹ ڈائرکٹر اکیڈمک شمع کوثر یزدانی، اسسٹنٹ ڈائرکٹر ایڈمن کمل سنگھ، ریسرچ آفیسر ڈاکٹر کلیم اللہ، محمد اسیم، مسرت جہاں، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر اجمل سعید، اکاؤنٹس آفیسر محمد احمد اور ریسرچ اسسٹنٹ معید رشیدی وغیرہ موجود تھے۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 3 اکتوبر 2012

اقلیتوں سے متعلق اسکیموں کو سہل بنانے کی ضرورت

نئی دہلی: اقلیتوں سے متعلق اسکیموں کو مزید سہل بنانے اور اقلیتوں تک اسکیموں کی رسائی کو ممکن بنانے کے مقصد سے ایک اہم میٹنگ کی گئی۔ کمیٹی برائے میپنگ آف ایجوکیشن کی یہ میٹنگ 8 اکتوبر 2012 کو پی اے انعامدار کی صدارت میں اعظم کیمپس پونے (مہاراشٹر) میں منعقد کی گئی۔ اس میٹنگ میں وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے جوائنٹ سکریٹری امت کھرے، اقلیتوں کی تعلیمی ترقی سے متعلق بنائی گئی

کمیٹی کے ممبران شفیع دہلوی، پشپند رسنگھ اور قومی اردو کونسل کے ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، محترمہ شکیلہ شمسو، ڈاکٹر اے این ریڈی، ڈاکٹر جی سری نواس نے حصہ لیا۔ اقلیتوں کی تعلیمی صورتحال اور مستقبل کے لائحہ عمل پر اس میٹنگ میں گفت وشنید کی گئی۔ ملک میں اقلیتوں کے تعلیمی ادارے کہاں کہاں موجود ہیں اور حکومت کی سہولیات سے کس قدر فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ سرکاری اعداد وشمار کے مطابق کچھ اسکیمیں اقلیتوں تک ضرور پہنچی ہیں لیکن یہ تشفی بخش نہیں ہے اور اس میں کچھ دشواریاں پیش آرہی ہیں۔ انھیں دشواریوں کا حل نکالنے کے لیے مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل جناب کپل سبل نے پانچ اسٹینڈنگ کمیٹیاں تشکیل دی ہیں جن میں ایک میپنگ آف ایجوکیشن بھی شامل ہے۔ اس کمیٹی کے ذمے یہ کام ہے کہ ملک کے ایسے علاقوں میں جہاں اقلیتوں کی آبادی 20 فیصد یا اس سے زیادہ ہے وہاں اقلیتوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دے۔ حکومت کے پاس جو ڈاٹا موجود ہے وہ ضلعی اور بلاک سطح پر ہے ان کے تجزیے سے یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ اسے مزید سہل اور آسان بنانا چاہیے۔ اس حوالے سے نیوپا NEUPA کو یہ ذمے داری سونپی گئی کہ مختلف نقشے، خاکے اور اعداد وشمار تیار کریں جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ ضلع اور بلاک کی سطح پر حکومت کی کن اسکیموں اور پروگراموں کی زیادہ ضرورت ہے۔ ان باتوں کے پیش نظر یہ کمیٹی اپنی سفارشات پیش کرے گی۔ امید ہے کہ اگلی میٹنگ 15 دن بعد ہوگی اس کی سفارشات وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کو سونپی جائیں گی تاکہ اس پر جلدی عمل درآمد کیا جاسکے۔ اس کے علاوہ اقلیتوں کی تعلیم سے متعلق عوامی سطح پر بیداری مہم بھی چلائی جائے گی۔ کمیٹی کی سفارشات میں یہ بھی شامل ہے کہ قومی اردو کونسل کے مراکز بھی کھولے جائیں گے اور ایسے مدارس جو رجسٹرڈ نہیں ہیں ان کی اسناد کو منظوری دلانے کی کوشش کی جائے گی۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 9 اکتوبر 2012

قومی اردو کونسل کی 'موبائل وین' کولکاتا میں جگہ جگہ پر جوش استقبال

کلکتہ: آج کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے زمانے میں جب کتابوں کے مطالعے اور خصوصاً اردو کتابوں کی خریداری کا شوق دن بہ دن معدوم ہوتا جارہا ہے، ایسے میں اردو کے کاز کو آگے بڑھانا اہلِ اردو کی اہم ذمے داری بنتی ہے۔ اسی تحریک کے پیش نظر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کا قافلہ مختلف فنون اور موضوعات پر مشتمل اردو کتابوں کا ذخیرہ لیے ہندوستان کے مختلف صوبوں سے ہوتا ہوا گزشتہ ہفتہ مغربی بنگال پہنچا۔ ہگلی اور ہوڑہ ضلع کے علاقوں کے شائقین کتب کی تشنگی بجھاتے ہوئے کتابوں کی یہ گاڑی شہر نشاط پہنچی۔ کلکتہ میں 14 ستمبر سے 19 ستمبر تک اس چلتے پھرتے کتاب میلے کا مختلف اردو آبادی والے علاقے بشمول مٹیا برج، خضر پور، زکریا اسٹریٹ، نارکل ڈانگہ، ارجہ بازار، بیل گچھیا، پارک سرکس اور توپسیا میں پڑاؤ رہا۔ کتابی میلے کا پہلا پڑاؤ کثیر اردو آبادی والا علاقہ مٹیا برج میں ہوا۔ کثرت آبادی اور اہل اردو کے ذوق کے باعث مٹیا برج میں دو جگہوں پر یہ گاڑی ٹھہرائی گئی۔ صبح 9 بجے سے سہ پہر 3 بجے تک یہ گاڑی گارڈن ریچ مولانا آزاد میموریل اسکول کے پاس جب کہ شام 4 بجے سے برجونالہ بس اسٹینڈ میں مدرسہ جماعت القریش شیشو شکشا کیندر کے سامنے کتابوں کا یہ موبائل وین ٹھہرا۔ جہاں لوگ پہلے ہی سے اس کے منتظر تھے۔ بارش کے باوجود گاڑی کے کھلتے ہی محبان اردو اور شائقین کتب کی بھیڑ امڈ پڑی۔ لوگوں نے جوش وخروش کے ساتھ کاروان اردو کا استقبال کیا۔ برجونالہ کے اردو داں حضرات نے نہ صرف اس گاڑی کا معائنہ کیا بلکہ مختصر مطالعے کے بعد اپنی پسند کی کتابیں بھی خریدیں۔ اس کتاب وین کے انچارج صدیقی صاحب نے کہا کہ میں پہلی بار اس علاقے میں آیا ہوں لیکن یہاں کے لوگوں کے شوق اور جذبے کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ شائقین ادب کے ذوق کو دیکھ کر انھوں نے گاڑی کا وقت نصف گھنٹہ بڑھا دیا اور لوگوں کو سیراب ہونے کا مزید موقع حاصل ہوا۔ برجونالہ کے رہنے والے کسٹم آفیسر اور اردو کتابوں کے شوقین شمس جاوید کا کہنا ہے

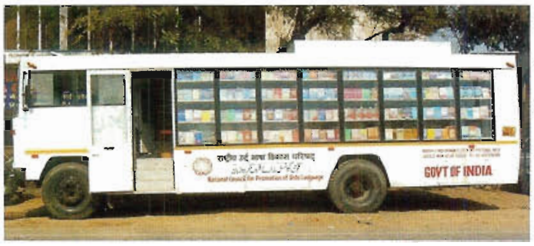

کہ اردو کے تئیں مغربی بنگال اردو اکادمی کے تعاون سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی یہ کوشش سراہنے کے لائق ہے۔ کتاب کی فہرست اور ترتیب نہ ہونے کی وجہ سے کتابوں کے انتخاب میں دشواریاں ہوئیں۔ مولانا رئیس القادری نے کہا کہ معاشرے میں اگر اسی قسم کا علمی اور ادبی ماحول رہا تو سماج کے بچوں کے ہاتھ میں کیرم، لوڈو اور پٹھو کے بجائے کتابیں ہوں گی۔ محمد اشرف قریشی نے کہا کہ مغربی بنگال اردو اکادمی نے کونسل کی اس گشتی گاڑی کو برجونالہ بھیج کر ہم برجونالہ کے اردو والوں پر صحیح معنوں میں احسان کیا ہے۔

روزنامہ 'اخبارِ مشرق'، کولکاتہ، حیدرآباد، 15 ستمبر 2012

(2)

رشترا: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی گشتی لائبریری ایک ماہ سے مختلف علاقوں کا دورہ کرتی ہوئی رشترا پہنچی۔ یہاں کے تمام اسکولوں کے طلبا وطالبات کی ایک جماعت کتابوں سے استفادہ کرنے کے لیے امڈ پڑی۔ وہیں عام لوگ گاہے گاہے پہنچتے رہے۔ 11 بجے دن سے لے کر 5 بجے شام تک مطالعہ کرنے اور خریداری کے لیے تانتا بندھا رہا۔ اسکولی بچوں نے جم کر خریداری کی وہیں رشترا کے تمام اردو میڈیم اسکولوں کے اساتذہ کرام بھی کتابوں کی خریداری میں پیچھے نہیں رہے۔ علم دوست حضرات اور سماجی شخصیتیں بھی کثیر تعداد میں شریک ہو کر کتابوں سے استفادہ کرتے رہے۔ گشتی لائبریری کے ساتھ مقامی لوگوں نے بھی بھرپور تعاون کیا۔ پروگرام کے انتظام کاروں اور گشتی لائبریری کے ذمے داروں کی پرلطف طعام سے تواضع اجماع اسپورٹنگ کلب کے رکن اور کلام میٹ شاپ کے مالک حبیب الرحمٰن قریشی نے اپنے دولت کدے پر کی۔

روزنامہ 'آزاد ہند' کولکاتہ، 12 ستمبر 2012

کونسل کے مالی تعاون سے

کیلی گرافی وگرافک ڈیزائن کی نمائش

رائے پور: 15 ستمبر 2012 کو غریب نواز اسکول رائے پور کے ہال میں کیلی گرافی وگرافک ڈیزائن کی نمائش لگائی گئی۔ اس پروگرام میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے شرکت کی جس میں شہر کی علمی، ادبی، سیاسی اور سماجی شخصیات نے شرکت کی۔ پروگرام کی صدارت محترم جناب ظفر روئی صدر اُردو ایجوکیشن سوسائٹی نے کی، مولانا محمد قمرالزماں مصباحی لکچرار محسن ملت یونانی میڈیکل کالج رائے پور نے عصر حاضر میں اردو زبان کی ارتقا

اور اس کے فروغ پر خطاب فرمایا اخیر میں ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے قومی کونسل کے قیام، مقاصد اور پورے ملک میں اردو کو زندہ رکھنے کی تحریک پر اپنے خیالات کا شرح وبسط کے ساتھ اظہار فرمایا۔ اس نمائش میں چھتیس گڑھ اور مدھیہ پردیش میں چلنے والے خطاطی سینٹر کے مختلف نمونے لگائے گئے تھے۔ اس نمائش میں قومی کونسل کے ذریعے کیے گئے کاموں کو لوگوں نے کافی پسند کیا۔ اراکین کمیٹی نے قومی کونسل کے ڈائرکٹر سے گذارش کی ہے کہ ہر ضلع میں خطاطی سینٹر اور اُردو، عربی اسٹڈی سینٹر کھولا جائے۔ یہ نمائش اس علاقے میں پہلی بار لگائی گئی تھی جس کی کافی پذیرائی ہوئی اور اہم شخصیات اس نمائش کو دیکھنے آئیں۔

پریس ریلیز، غریب نواز ایجوکیشن سوسائٹی رائے پور، 15 ستمبر 2012

حیدرآباد میں کمپیوٹر سینٹر کا جلسۂ اسناد

حیدرآباد: صمدانی ایجوکیشنل سوسائٹی عثمان باغ، بہادر پورہ حیدرآباد کے تحت چلنے والے صمدانی کمپیوٹرائزڈ کیلی گرافی ٹریننگ سینٹر بہ تعاون قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان محکمۂ اعلیٰ تعلیم وزارت ترقی انسانی وسائل حکومت ہند اور صمدانی ڈگری کالج ملحقہ کالی کٹ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد کا طیبہ فنکشن ہال بہادر پورہ میں انعقاد عمل میں آیا، اس موقعے پر شہر حیدرآباد کے میئر ماجد حسین نے کہا کہ نوجوان پوری توجہ اور دلچسپی کے ساتھ اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کے ساتھ فنی کورسز میں بھی مہارت پیدا کریں، جو بھی سند حاصل کی جائے اس کے مطابق اپنے اندر صلاحیت ضروری ہے، عملی میدان میں اسی کی قیمت ہے، ابتدا میں ڈاکٹر لئیق احمد ڈائرکٹر صمدانی کالج وکمپیوٹر سینٹر اور اس کے تحت جاری لینگویجز ڈپلوماز کی تفصیلات بتلاتے ہوئے کہا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اپنے قیام کے پہلے دن سے ہی اردو زبان کے ارتقاو ترویج اور اردو کو جدید تعلیم وانفارمیشن ٹکنالوجی سے آراستہ کرنے میں پیش پیش ہے۔ اس سے اردو داں طبقے کو بہت فائدہ پہنچ رہا ہے، ہمارے سنٹر کے فارغین ملک و بیرون ملک کمپنیوں اور حکومتی اداروں میں ملازمت کے ذریعے بہترین روزگار حاصل کررہے ہیں، این سی پی یو ایل نے اپنے ممکنہ تعاون کے ذریعے ان مراحل کو آسان بنادیا۔

پریس ریلیز، صمدانی ایجوکیشنل سوسائٹی، حیدرآباد، 15 اگست 2012

تین مورتی بھون میں منٹو پر سیمینار

نئی دہلی: عالمی شہرت یافتہ فکشن نگار سعادت حسن منٹو کی 100ویں یومِ پیدائش کے سلسلے میں منائی جانے والی صد سالہ تقریبات کے موقعے پر معروف ادبی تنظیم 'صحبت' اور 'نہرو میموریل میوزیم اینڈ لائبریری' کے زیراہتمام تین مورتی بھون میں منعقد 2 روزہ بین الاقوامی سیمینار کا اختتام ہوا۔ 'سعادت حسن منٹو کے 100 سال' کے موضوع پر منعقد سیمینار کا انعقاد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے کیا گیا تھا۔ اس بین الاقوامی سیمینار میں شرکت کرنے والے ہندوستان اور پاکستان کے تمام بڑے ادیبوں اور دانشوروں نے اعتراف کیا کہ منٹو جیسی بے باکی بہت کم تخلیق کاروں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ سیمینار کے آخری روز ملک کی تقسیم سے پہلے منٹو کی تحریروں اور پاکستان جانے کے بعد کی منٹو کی تحریروں پر سنجیدگی سے بحث کی گئی۔ منٹو کی تخلیقات میں عورتوں سے وابستہ معاملات، ملک کی تقسیم کے اثرات اور مذہبی بنیاد پرستی سے متعلق بات کی گئی۔ اس

موقعے پر پاکستان سے آئے ہوئے برصغیر کے معروف فکشن نگار انتظار حسین نے منٹو کے افسانے اور نظیر اکبرآبادی کے کلام میں مماثلت کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے منٹو کے افسانے 'کالی شلوار' اور نظیر اکبرآبادی کی نظم 'آدمی نامہ' کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی۔ پروفیسر مظفر حنفی نے کہا کہ ادب کا اخلاق سے کیا رشتہ ہونا چاہیے یہ مسئلہ منٹو کے یہاں بہت ملتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ نظیر اور منٹو اپنی تخلیقات میں خود موجود پائے جاتے ہیں۔ پروفیسر علی جاوید نے کہا کہ منٹو کی تخلیقات کا کینوس صرف طوائفوں تک محدود نہیں بلکہ اس نے عام لوگوں کے بارے میں بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ اس سے قبل پاکستان میں جناح انسٹی ٹیوٹ اسلام آباد کے ڈائریکٹر اور فرائی ڈے ٹائمز کے ایڈیٹر رضا رومی نے "Reclaimed Humanity Woman as Metaphors in Manto's Short Stories" کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔ اس کے علاوہ ہندی کے معروف کوی اور مصنف اشوک واجپئی، اعجاز احمد اور تاریخ داں پروفیسر سدھیر چندر نے اجلاس کی صدارت کی اور منٹو کی حیات، شخصیت، فن اور ادبی کارناموں پر روشنی ڈالی جب کہ پروفیسر ہریش ترپویدی، کیکی دارو والا، ڈاکٹر رخشندہ جلیل، نیلیھ، اسد زیدی، ڈاکٹر نریندر موہن، ڈاکٹر ترون سینٹ اور شردت نے بھی مقالے پیش کیے۔ آخر میں کلچرل پروگرام میں دانش حسین اور دارین شاہدی نے 'داستان گوئی: منٹویات' پیش کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 30 ستمبر 2012

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی :

اردو شعرا کی انسائیکلوپیڈیا

لکھنؤ: اردو شعرا کی انسائیکلوپیڈیا کی تیاری کے سلسلے میں منعقد ہونے والی پانچ روزہ ورکشاپ کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے یوپی اسمبلی کے اسپیکر ماتا پرساد پانڈے نے کہا کہ تقسیم ہند کے بعد اردو زبان کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کی گئیں اور اردو کے ساتھ زیادتی کی گئی۔ انھوں نے کہا کہ اردو ہندوستان کی زبان ہے اور اس کے فروغ کے لیے کوشش کی جانی چاہیے۔ اسپیکر موصوف نے کہا کہ اردو کی ترقی کے لیے سب سے بڑا قدم یہی ہوگا کہ اس کا چلن عام کیا جائے، اردو والے خود اس زبان کو اپنائیں اور دفتروں میں درخواستیں وغیرہ اردو میں بھیجیں۔ ماتا پرساد پانڈے نے اردو کو گنگا جمنی تہذیب کی علامت قرار دیتے ہوئے کہا کہ کرشن چندر، پریم چند، فراق گورکھپوری اور سیکڑوں غیر مسلم شعرا اور ادبا نے ناول، افسانے، کہانیاں اور شعر اردو میں لکھے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو کو کسی خاص مذہب سے نہیں جوڑا جانا چاہیے۔ خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی میں منعقد اس تقریب سے خطاب کرتے ہوئے صدر جلسہ پروفیسر نصیر احمد خاں نے کہا کہ اردو میں لسانی پہلو سے وہ کام نہیں ہوا جو اس زبان کے لیے بہت ضروری تھے۔ اردو گرامر، صوتیات اور دیگر لسانی امور کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر نصیر خاں نے کہا کہ یونیورسٹی میں اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور عربی و فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے قیام کے ذریعے ان تمام پہلوؤں پر کام کیا جاسکے گا۔ انھوں نے کہا کہ اردو عربی فارسی یونیورسٹی ایشیا کا ایک بڑا تحقیقی اور علمی مرکز بننے جاری ہے۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر انیس انصاری نے کہا کہ اردو کے فروغ و اشاعت کے لیے سہ لسانی فارمولے کو اترپردیش میں ایمانداری سے نافذ کیا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جسٹس مارکنڈے کاٹجو کے الہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلہ کے مطابق سنسکرت اور اردو دونوں کو لازمی طور سے درجہ تین سے آٹھ تک پڑھایا جائے۔ اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سنٹر، سولن کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے ورکشاپ کے مقاصد پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اردو ادب کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا باضابطہ کام جو اردو شعرا کی انسائیکلوپیڈیا کی شکل میں کیا جارہا ہے اس میں 600 سے زائد شعرا کی زندگی، ان کے اسلوب اور طرزِ فکر کا احاطہ کیا جائے گا۔ امیر خسرو سے لے کر دور جدید تک کے شعرا کا اس میں احاطہ ہوگا۔ انھوں نے بتایا کہ سولن اور دہلی کے بعد یہ تیسری ورکشاپ ہے جس میں خاص طور سے دبستان لکھنؤ کے شعرا پر 15 محققین کے ذریعہ اگلے پانچ دنوں تک ترجیحی نوٹ قلم بند کیے جائیں گے۔ حیدرآباد میں منعقد ہوگی جس کے بعد انسائیکلوپیڈیا کی تدوین واشاعت کا کام کیا جائے گا۔ اسے 2013 تک مکمل کرنے کا ارادہ ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 ستمبر 2012

ساہتیہ اکادمی کے ترجمہ ایوارڈ میں اردو کا بول بالا

نئی دهلی: ساہتیہ اکادمی نے پہلی بار اڑیسہ کی راجدھانی بھبنیشور میں بڑے پیمانے پر کل ہند ادیبوں کی سہ روزہ تقریبات کا اہتمام کیا۔ جمعہ 24 اگست 2012 کو بھبنیشور کے جے دیو بھون میں 'ترجمہ انعامات

برائے 2011' کی شاندار تقریب کا افتتاح کرتے ہوئے ساہتیہ اکادمی کے صدر نامور بنگلہ شاعر و ادیب جناب سنیل گنگوپادھیائے نے کہا کہ اس بار یہاں ایوارڈ کی تقریب کا اہتمام ثقافت، ادب اور آرٹ میں اڑیسہ کی تاریخی قدامت کے اعتراف میں کیا جارہا ہے۔ سنیل گنگوپادھیائے نے اپنے افتتاحی خطبے میں ترجمہ کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ رامائن اور مہابھارت کی مذہبی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن ان کی مقبولیت میں اضافہ تب شروع ہوا جب سنسکرت سے ان کا ترجمہ مختلف زبانوں میں کیا گیا۔ سنیل گنگوپادھیائے نے ترجمہ کی افادیت کے نکتۂ نگاہ سے بنگالی سائنس داں ستیندر ناتھ بوس کی مشہور زمانہ سائنسی تھیوری کا ذکر کیا کہ اگر ان کے نظریے کا ترجمہ ہوکر آئنسٹائن تک نہ پہنچتا تو آج اس سال جس سائنسی حقیقت کو 'عنصرِ ربانی' (God particle) کے نام سے تسلیم کیا گیا ہے وہ ناپید ہوتی۔ جے دیو بھون میں 2011 کے ایوارڈ یافتگان کا سمان اڑیسہ کے عالمی شہرت یافتہ شاعر جے کے مہاپاترا کی موجودگی میں کیا گیا۔ اس موقعے پر ساہتیہ اکادمی کے نائب صدر معروف اسکالر جناب وشوناتھ پرشاد تیواری نے انعام کے مستحق ہر مترجم کا استقبال گل پوشی کے ساتھ کیا۔ ایوارڈ کا چیک برائے مبلغ پچاس ہزار روپے اور پلاک بدست سنیل گنگوپادھیائے پیش کیا گیا۔ اردو میں ترجمہ کے لیے یہ انعام شاعر، افسانہ نگار، نقاد، مدیر ماہنامہ انشا ف س اعجاز کو ساہتیہ اکادمی کی شائع کردہ 450 صفحات پر مشتمل کتاب 'منتخب دلت کہانیاں' پر دیا گیا۔ ف س اعجاز نے اس کتاب کا ہندی سے ترجمہ کیا ہے۔ اس میں ملک کی چھ زبانوں سے 48 منتخب کہانیاں شامل ہیں اس بار مترجمہ کتابوں میں اردو کتابوں کی تعداد زیادہ رہی۔ کویتا مہاجن نے عصمت چغتائی کی کہانیوں کا ایک انتخاب 'رجئی' (رضائی) کے نام سے مراٹھی میں کیا۔ جب کہ مشہور اڑیہ مترجم اور ایڈیٹر سنگرام جینا نے مرزا ہادی رسوا کے ناول 'امراؤ جان ادا' کا اڑیہ میں، جتیندر اُدھم پوری نے عبدالصمد کے اردو ناول 'دوگز زمین' کا ڈوگری میں اور کمل رنگا نے راجندر سنگھ بیدی کے ناول 'ایک چادر میلی سی' کا راجستھانی میں ترجمہ کیا۔ اردو میں یوا پرسکار لدھیانہ کے نوجوان شاعر جناب وشال کھلکر کو دیا گیا۔ ان کا شعری مجموعہ 'دھند میں اماں' انشا پبلی کیشنز کلکتہ سے شائع ہوا ہے۔ یوا پرسکار 35 سال کی عمر تک کے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کو دیا جاتا ہے۔ مختلف زبانوں کے شعرا کا شعری پروگرام بعنوان 'ابھی یکتی' بھی منعقد ہوا جس میں اردو کی نمائندگی پروین کمار اشک (پٹھان کوٹ، پنجاب) اور شبنم عشائی (سری نگر، کشمیر) نے کی۔ ساہتیہ اکادمی کے صدر دفتر نئی دہلی کا متحرک و فعال عملہ شروع سے آخر تک تمام انتظامی کارروائیوں میں موجود رہا۔ خصوصاً ڈپٹی سکریٹریز جناب کے ایس راؤ اور محترمہ رینو موہن بھان نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

پریس نوٹ، محمد امیر الدین، رابطہ کار 'ماہنامہ 'انشا' کلکتہ، 7 ستمبر 2012

دہلی میں 'اردو وراثت کارواں' کا افتتاح

نئی دھلی: قومی راجدھانی دہلی سے 'اردو وراثت کارواں' کا آغاز ہو چکا ہے۔ یہاں کے انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل کپل سبل، مرکزی وزیر مملکت برائے پارلیمانی امور راجیو شکلا، ہندوستان میں جرمنی کے سفیر مائیکل اسٹینر، ممتاز صحافی آلوک مہتا اور سعید نقوی، فلم اداکارہ نغمہ، معروف اسکالر پروفیسر اختر الواسع، خواجہ اکرام الدین وغیرہ کی موجودگی میں پی سی آئی کے چیئرمین جسٹس مارکنڈے کاٹجو کی سربراہی میں کارواں کا افتتاحی اجلاس منعقد ہوا۔ آئیڈیا کمیونیکیشنز کے بینر تلے یہ کارواں ملک کے مختلف گوشوں میں جائے گا۔ جسٹس کاٹجو کے مطابق کارواں کا مقصد اردو کے حوالے سے لوگوں کے ذہنوں میں جو غلط فہمیاں ہیں ان کو نہ صرف دور کرنے کی کوشش ہے بلکہ اردو اس ملک کی اور تمام ہندوستانیوں کی زبان ہے اس پیغام کو عام کیا جائے گا۔ کارواں کے کنوینر اور آئیڈیا کے ڈائرکٹر آصف اعظمی نے پروگرام کی نظامت کی۔ اپنے افتتاحی خطاب میں جسٹس کاٹجو نے مزید کہا کہ ہندوستان کی ثقافت اردو زبان ہے۔ 1947 تک اردو ہر ایک کی زبان تھی۔ مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل کپل سبل نے اردو سے اپنی بے پناہ دلچسپی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ حالانکہ میں اردو زبان لکھ پڑھ نہیں سکتا لیکن میرا اٹھنا بیٹھنا اردو کے درمیان ہوا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو میں جو مٹھاس ہے وہ شاید ہی دنیا کی کسی اور زبان میں ہو۔ مرکزی وزیر نے اس بات پر زور دیا کہ اردو عوامی زبان ہے اور ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب میں اس زبان کا اہم کردار ہے۔

روزنامہ 'ہندستان ایکسپریس' دہلی، 20 ستمبر 2012

اسلامی کتاب میلہ

نئی دھلی: ایجوکیشنل ہیلتھ اینڈ سوشل اویرنیس سوسائٹی (EHSAS) اور انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر (IICC) کے زیر اہتمام الحسنات بکس پرائیویٹ لمیٹڈ کے اشتراک سے انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر (آئی آئی سی سی) میں منعقد کیے جانے والے 10 روزہ بین الاقوامی اسلامی کتاب میلے میں بڑی تعداد میں وی آئی پی شخصیات سمیت سیکڑوں لوگوں نے شرکت کی۔ میلے میں پاکستان، ایران، سعودی عرب، مصر، لبنان، ملیشیا، سنگاپور، سری لنکا، امریکہ اور انگلینڈ سمیت 15 ممالک کی اسلامیات سے متعلق انگریزی اور اردو میں شائع کی گئی کتابیں رکھی گئیں۔ اس کتاب میلے میں 15 سے زیادہ ممالک کی تقریباً 15 ہزار سے زیادہ ٹائٹلس کی کتابیں رکھی گئی تھیں۔ ان میں اسلامی کتب شائع کرنے والے ہندوستان کے تقریباً 40 سے زیادہ پبلشرز کی کتابیں بھی شامل ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، 24 ستمبر 2012

دھلی:

اردو مترجم و آپریٹرز کی تقرری کا حکم

نئی دھلی: دہلی کے محکمہ برائے فن ثقافت والسنہ نے سبھی سرکاری محکموں اور مقامی یونٹوں سے کہا ہے کہ وہ دہلی کی دوسری سرکاری زبان اردو کے تحفظ اور حوصلہ افزائی کے لیے اپنے محکموں و دفاتر میں اردو مترجم اور اردو کمپیوٹر آپریٹروں کی تقرری کرے۔ قابل ذکر ہے کہ سلیم پور کے باشندہ آرٹی آئی کارکن نیر عالم نے وزیر اعلیٰ کو بھیجے گئے خط میں کہا تھا کہ دہلی میں عام سرکاری محکموں میں اردو مترجم اور معاون اردو مترجم کا صرف ایک عہدہ منظور ہے، اس پر ملازم تقرر ہے، جب کہ جولائی 2003 میں جاری نوٹیفکیشن کے بعد اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا تھا، اس کے بعد ضابطے کے مطابق سبھی محکموں اور دفاتر میں اردو مترجم اور اردو کمپیوٹر آپریٹروں کی تقرری کے لیے عہدہ منظور کیا جانا چاہیے تھا۔ وزیر اعلیٰ نے اس تعلق سے ضروری قدم اٹھانے کے لیے کہا ہے، جس کے سبب محکمہ برائے فن ثقافت والسنہ کے خصوصی سکریٹری سنتوش ویدھ نے سبھی محکموں کو خط لکھا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 ستمبر 2012

انجمن تعمیر اردو کا ادبی جلسہ

نئی دھلی: معروف اردو شاعر پدم شری بیکل اتساہی نے کہا ہے کہ انھوں نے اپنے شعری سفر کے دوران ہمیشہ اردو اور ہندی کو قریب لانے اور اردو کو گاؤں تک پہنچانے کی سعی کی ہے۔ انھوں نے کہا میں مشکل اردو اور مشکل ہندی دونوں کے خلاف ہوں۔ عالمی ہندی کانفرنس میں میں نے سنسکرت سے ترجمہ شدہ ہندی کی وکالت کرنے پر ہزاری پرساد دیویدی جیسے ہندی ادیب کی مخالفت کی تھی۔ بیکل اتساہی نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ عہد حاضر میں مشاعرے، نوٹنکی بنتے جا رہے ہیں اور شعرا اسٹیج پر سخن سرائی کے بجائے ڈرامہ بازی اور ایکٹنگ کرنے لگے ہیں۔ انھوں نے کہا میں نے شعر و ادب سے وابستگی کسی ستائش یا صلہ کی تمنا کے بغیر کی ہے۔ مجھے جگر جیسے شعرا کی رفاقت حاصل رہی ہے۔ بیکل اُتساہی اس وقت برصغیر کے سینئر ترین شعرا میں ہیں ان کی عمر 89 برس ہے۔ بیکل اتساہی نے مندرجہ بالا خیالات کا اظہار پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی کی رہائش گاہ پر انجمن تعمیر اردو دلی کی جانب اپنے اعزاز میں منعقدہ نشست سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ گلزار دہلوی نے اس موقعے پر بیکل اُتساہی سے اپنی پچاس پچپن برس کی رفاقت کا ذکر کیا۔ نشست سے خطاب کرتے ہوئے روزنامہ راشٹریہ سہارا اردو کے سربراہ سید فیصل علی نے کہا کہ گلزار دہلوی جیسی شخصیات اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ اردو کسی مخصوص مذہب کی زبان نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو اخبارات کسی سے کم نہیں ہیں اور ان کی کوشش ہے کہ اردو صحافت کا معیار بلند ہوتا کہ ہم لوگ کسی احساس کمتری کا شکار نہ ہوں۔ اس نشست میں حسن ضیا، الوک شریواستو شاذ، اعجاز مقبول ایڈوکیٹ اور پروفیسر راج یادو نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، انجمن تعمیر اردو دلی، 17 ستمبر 2012

ابن صفی کے ناول

نئی دھلی: ابن صفی کے ناولوں نے نہ صرف نئی نسل میں اردو سے دلچسپی پیدا کی بلکہ بے شمار غیر اردو داں افراد نے ان ناولوں کو پڑھنے کے لیے باقاعدہ اردو سیکھی۔ یہ ابن صفی کے ناولوں کا کمال ہے لہٰذا ان کے ناولوں کی اشاعت بڑے پیمانے پر ہونی چاہیے تاکہ اردو کے فروغ میں تیزی آ سکے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار حلیم مسلم پی جی کالج کانپور کے پرنسپل ڈاکٹر شکیل احمد نے جے این یو میں منعقد 'پین انٹرنیشنل' کی خصوصی نشست میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ عصر حاضر کا تقاضہ ہے کہ ابن صفی کی تخلیقات کو ادبی مقام دلانے کے لیے یونیورسٹی سطح پر کوشش ہونی چاہیے۔ جمشید عادل علیگ نے کہا کہ ابن صفی کو اردو ادب میں نظر انداز کرنا عقل مندی نہیں، بلکہ اس فکر کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ ابن صفی نے عام قاری کو اردو سے جوڑنے میں تاریخی رول ادا کیا۔ حقانی القاسمی نے کہا کہ ابن صفی وہ ناول نگار ہے جسے اگاتھا کرسٹی جیسی ممتاز جاسوسی ناول نگار نے بھی تسلیم کیا اور یہ اعتراف کیا کہ ابن صفی اردو کا واحد ناول نگار ہے جس نے جاسوسی ادب کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ انھوں نے جو کردار خلق کیے وہ مثالی ہیں، مگر اردو تنقید کا المیہ یہ رہا کہ ابن صفی کو وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ مستحق تھے۔ تحسین منور نے کہا کہ ابن صفی کو نظر انداز کر کے ہم اردو ادب کا بہت بڑا نقصان کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر شفیع ایوب نے کہا کہ بھلے ہی کل تک ابن صفی کے ناولوں کو سرسری ادب کے زمرے میں ڈال کر اس پر

توجہ نہیں دی گئی مگر اب مزاج بدل رہا ہے۔ نشست کی صدارت حکیم محمد توفیق علیگ نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' 1 اکتوبر 2012

اردو اساتذہ کی بحالی اور مدارس کے طلبا

نئی دھلی: دہلی سرکار اردو ٹی جی ٹی اساتذہ کی 100 خالی اسامیوں پر تقرری کے لیے 10 ویں اور 12 ویں میں پانچ مضامین کی شرط لگائے جانے کی خبر کے سلسلے میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین کا کہنا ہے کہ مدرسہ کے نصاب کو اسکولوں کے نصاب پر نہ پرکھا جائے بلکہ اس کے لیے الگ سے غور وخوض کیا جائے ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ دینیات کو شامل کر کے اس میں پڑھائے جانے والے مضامین کو الگ الگ مضمون مان لیا جائے۔ انھوں نے مدارس کے طلبہ سے کہا کہ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اس سلسلے میں پوری کوشش کی جائے گی۔ انھوں نے مزید کہا کہ آر آر (ریکوائرمنٹ رول) میں تبدیلی لائی جاسکتی ہے ورنہ مدارس کے ہونہار طلبہ اس نوکری کے لیے اہل نہیں ہوں گے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبہ اردو کے استاذ پروفیسر شہزاد انجم نے کہا کہ مدرسے کے فارغین طلبہ وطالبات دوسرے طلبہ کے مقابلے اردو کے زبان و بیان میں کہیں زیادہ اچھے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی محنت اور شوق سے اچھے نمبرات سے امتحانات پاس کرتے ہیں، اس کے باوجود جب ان کی نوکری کی بات آتی ہے تو بے جا شرائط عائد کر کے انھیں نوکری کے دوڑ سے پیچھے کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 ستمبر 2012

جشن مجاہدین اردو

نئی دھلی: دہلی کے انڈیا اسلامک کلچر سینٹر میں حسن آرا ٹرسٹ وائی سی آر کی جانب سے جشن مجاہدین اردو کا اہتمام کیا گیا، جس میں مہمان خصوصی کے طور پر جسٹس سہیل اعجاز صدیقی چیئرمین کل ہند اقلیتی تعلیمی کمیشن نے شرکت کی، جب کہ اس موقعے پر مجاہدین اردو کی سنہ 1219 سے لے کر دور حاضر تک کے شعرا کی تصویروں کی نمائش کا افتتاح سید سبط رضی گورنر جھارکھنڈ، جاوید عابدی و پنڈت آنند موہن گلزار دہلوی نے کیا۔ ان تصاویر میں امیر خسرو، کلی قطب شاہ، ولی دکنی سے لے کر، میر، درد، مینائی، اقبال، فیض، مہندر سنگھ بیدی، کیفی اعظمی، علی سردار جعفری، غالب، بہادر شاہ ظفر کے علاوہ کئی سو شعرائے کرام کی تصاویر شامل تھی۔ جشن مجاہدین اردو کے عنوان سے منعقد مشاعرہ کا افتتاح جسٹس ناظم زیدی، پروفیسر اشونی کمار، سید سبط رضی، جسٹس سہیل اعجاز صدیقی، ڈاکٹر شکیل احمد، بکل اتساہی، راج ببر، سراج قریشی، صفدر ایچ خاں وغیرہ نے کیا۔ اس کے بعد منتظمین کی جانب سے مہمانان کو خیر مقدم میں گلدستہ اور جاوید عابدی جنرل سکریٹری سماج وادی پارٹی کو خصوصی استقبالیہ پیش کیا گیا۔ اس موقعے پر راج ببر کو سماجی خدمات کے لیے، خالد پرویز چیئرمین لینڈ مارک انسٹی ٹیوٹ کو تعلیمی خدمات کے حوالے سے، عذرا نقوی، کو قلمکاری کے حوالے سے سال 2012 کے فخر ہند ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ افتتاحی تقریر میں دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ہندوستان کے تعلیمی نظام کو بنانے میں اہم کردار ادا کیا، ان کی انھی خدمات پر ان کو بھارت رتن سے بھی سرفراز کیا گیا تھا، گورنر جھارکھنڈ سید سبط رضی و سابق وزیر داخلہ ڈاکٹر شکیل احمد نے بھی مولانا آزاد کی خدمات کا اعتراف کیا اور مولانا کی سرپرستی میں شائع ہونے والے اخبار الہلال کی جنگ آزادی سے متعلق خدمات کا بھی ذکر کیا، مہمانان نے الہلال کے تاریخی و نایاب ایڈیشن کی رونمائی بھی کی۔

روزنامہ 'خبر جدید' دہلی، 17 ستمبر 2012

دہلی کالج کے شعبہ فارسی کی خدمات

نئی دھلی: ذاکر حسین دہلی کالج کے سلمان غنی آڈیٹوریم میں شعبۂ فارسی کی انجمن کے زیر اہتمام 'شعبۂ فارسی کی علمی و ادبی خدمات' کے موضوع پر ایک ادبی جلسے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر محمد مرسلین نے کی جبکہ مہمانان خصوصی کے طور پر تاجکستان کے سفیر سعید بیگ

سعیدوف، افغانستان، سفارت خانہ کے فرسٹ سکریٹری (ایجوکیشن اینڈ کلچر)، پروفیسر عبدالخالق رشید، ایران کے کلچرل کاؤنسلر علی فولادی، افغانستان کے کلچرل کاؤنسلر بشیر احمد شبیر، ایران کلچرل ہاؤس کے مرکز تحقیقات کے صدر ڈاکٹر علی رضا قزوہ، پروفیسر شریف حسین قاسمی اور ڈاکٹر یونس جعفری نے شرکت کی۔ اس موقعے پر ذاکر حسین دہلی کالج کے پروفیسر محمد اسلم پرویز نے تمام مہمانان کا استقبال کیا۔ کالج کے شعبۂ فارسی کے صدر ڈاکٹر جمیل الرحمٰن نے امام بخش صہبائی سے عصر حاضر تک تقریباً ڈیڑھ سو سالہ شعبہ کی علمی و ادبی خدمات کا فارسی اور اردو زبان میں تذکرہ کیا۔ اس موقعے پر تاجکستان کے سفیر سعید بیگ سعیدوف نے ذاکر حسین دہلی کالج اور تاجکستان یونیورسٹی کے درمیان تعلیمی امور سے متعلق سرگرمیوں سے فروغ کے لیے ایک مفاہمت نامے (MOU) پر دستخط کیے جانے کی خوشخبری سنائی۔ پروفیسر عبدالخالق رشید نے کہا کہ ہندوستان کے سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے آبا و اجداد کا تعلق بھی افغانستان سے تھا۔ ایران کے کلچرل کاؤنسلر علی فولادی نے ہندوستان میں قرون وسطیٰ میں فارسی زبان وادب کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ اس کے علاوہ افغانستان کے کلچرل کاؤنسلر بشیر احمد شبیر، ڈاکٹر علی رضا قزوہ، پروفیسر محمد مرسلین، ڈاکٹر یونس جعفری اور پروفیسر شریف حسین قاسمی نے بھی اظہار خیال کیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر جمشید خاں نے کی جب کہ ڈاکٹر ملک سلیم جاوید نے تمام معزز مہمان کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر کالج کی انجمن فارسی کا احیا بھی عمل میں آیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 28 ستمبر 2012

اردو اکادمی کی شام غزل

نئی دھلی: مرکزی وزیر کپل سبل کی رہائش گاہ پر اردو وراثت کارواں کے سلسلے میں اردو اکادمی دہلی کے تعاون سے ایک ادبی محفل 'شام غزل' کا انعقاد کیا گیا۔ صدارت کارواں کے سرپرست کپل سبل نے کی، مہمان خصوصی سابق جسٹس ماکنڈے کاٹجو تھے، ہندوستان میں جرمنی کے سفیر مائکل اسٹینر، مسز مائکل اسٹینر اور جرمنی کے دیگر سفارت کاروں نے شرکت کی۔ گلوکارہ رادھیکا چوپڑا اور فنکار عمران خان نے غزلیں پیش کیں۔ پروگرام کی ابتدائی نظامت آصف اعظمی نے کی۔ اردو اکادمی دہلی کے سکریٹری انیس اعظمی نے جسٹس مارکنڈے کاٹجو اور مرکزی وزیر کپل سبل کی اردو زبان کے فروغ، ترقی و ترویج اور مقبولیت میں اضافے کے لیے کی گئی کاوشوں کی ستائش کرتے ہوئے دونوں فنکاروں کا مکمل تعارف پیش کیا۔ اس موقعے پر جسٹس کاٹجو نے کہا کہ 1947 کے بعد اردو کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوئی ہے۔ 47 سے پہلے یہ ہر پڑھے لکھے شخص کی زبان تھی۔ اسے مسلمانوں کی اور غیر ملکی زبانوں قرار دے کر اس کے ساتھ ناانصافی کی گئی۔ این سی پی یو ایل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے خیر مقدمی کلمات ادا کرتے ہوئے ثقافتی وراثت کو محفوظ رکھنے کے لیے اردو زبان کے فروغ کو لازمی قرار دیا۔ اس ادبی محفل میں کپل سبل اور ان کی اہلیہ مسز پامیلا کپل سبل

نے فنکاروں کو تحائف دے کر ان کا استقبال کیا۔

روز نامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی، 7 اکتوبر 2012

مفت یونانی میڈیکل کیمپ

نئی دھلی: آل انڈیا یونانی طبی کانگریس (دہلی) کے زیر اہتمام 2 اکتوبر، گاندھی جینتی کے موقع پر مفت یونانی میڈیکل کیمپ شہید اشفاق اللہ خاں پارک، نیوسیلم پور، دہلی میں لگا جس میں بڑے پیمانے پر لوگوں نے فیض حاصل کیا۔ افتتاحی تقریب میں خطاب کرتے ہوئے جامعہ ہمدرد، فیکلٹی آف یونانی میڈیسن کے سابق ڈین پروفیسر مشکور احمد عوامی ایکتا ویلفیئر ایسوی ایشن کے صدر چودھری ناظم علی نے اپنے خطاب میں کہا کہ آل انڈیا یونانی طبی کانگریس بڑے پیمانے پر مفت یونانی میڈیکل کیمپ کا اہتمام کرتی رہتی ہے، جس کا فائدہ ہر خاص و عام کو ہوتا ہے اور یونانی پیتھی کی طرف راغب ہوتے ہیں۔

پریس ریلیز، محمد عمران، پریس سکریٹری، آل انڈیا یونینی طبی کانگریس، نئی دہلی، 2 اکتوبر 2012

امن اور اولیائے کرام

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے انجینئرنگ ڈپارٹمنٹ کے آڈیٹوریم میں جامعہ اولڈ بوائز ایسوی ایشن اور امام رضا کلچر سینٹر کے تعاون سے 'امن، محبت اور بھائی چارے کے فروغ میں اولیائے کرام کے پیغامات کے

اثرات' کے عنوان سے ایک سمپوزیم کا انعقاد کیا گیا۔ نظامت عظیم امروہوی نے کی۔ اس موقعے پر جامعہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے کہا کہ عزاداری کا آغاز صوفیوں سے ہوا ہے انھوں نے کہا کہ ہندو پاک میں اسلام کے فروغ میں صوفیوں نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ معروف عالم دین مولانا کلب صادق نے کہا کہ مسلمانوں کو آپس میں اتفاق و اتحاد قائم کرنا چاہیے۔ مولانا مہدوی پوری نے صدارتی خطبہ فارسی زبان میں پیش کیا۔ ترجمہ نگاری کا کام مولانا تقی حیدر نے انجام دیا۔

روز نامہ 'راشٹریہ سہارا' 24 ستمبر 2012

آندھرا پردیش

ہندوستانی میڈیا پر سیمینار

حیدر آباد: جناب سید فیصل علی ہیڈ ایڈیٹوریل افیرس اینڈ عالمی سہارا نے کہا کہ بعض معاملات میں صحافت اپنی ذمے داریوں کو بخوبی نبھانے میں ناکام ثابت ہو رہی ہے اور ان دنوں عوامی مسائل پر میڈیا کی توجہ نہیں ہے۔ جناب فیصل علی رائل انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی اینڈ سائنس چیوڑلہ میں 'ہندوستانی میڈیا اور اس کے بدلتے ہوئے رنگ' کے عنوان پر منعقدہ سیمینار کو خطاب کر رہے تھے۔ جناب عارف رضوان ڈائریکٹر رائل انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی اینڈ سائنس نے اس سیمینار کی صدارت کی۔ انھوں نے مسلم مسائل پر بعض میڈیا گروپس کی جانب سے غفلت ولاپرواہی کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا اور کہا کہ اس صورت حال میں اردو صحافت کے چہرہ وشکل کو بدلنا بھی وقت کا اہم تقاضہ ہے۔ انھوں نے اردو صحافیوں کو مشورہ دیا کہ وہ احساس کمتری کے خول سے باہر نکلیں اور عوامی مسائل کو پیش کریں۔

روز نامہ 'رہنمائے دکن' حیدر آباد، 15 ستمبر 2012

بیسٹ اردو ٹیچر ایوارڈ

حیدر آباد: وزیر اقلیتی بہبود 'حج' اوقات و اردو اکادمی حاجی سید محمد احمد اللہ نے بیسٹ اردو ٹیچرس ایوارڈ میں توسیع اور ان کی رقم و تعداد میں اضافہ کرتے ہوئے ایک سو کرنے کا اعلان کیا اور یقین دلایا کہ آئندہ سال کے اردو بجٹ میں خاطر خواہ اضافے کے لیے وہ حکومت بالخصوص چیف منسٹر مسٹر این کرن کمار ریڈی سے سفارش کریں گے۔ تقریب سے سید شاہ نور اللہ قادری سابق چیئرمین، ایس کے افضل الدین سابق نائب صدر اور رضا حسین آزاد نے خطاب کیا۔ ایوارڈ یافتگان میں فاطمہ بیگم، ڈاکٹر حبیب نثار، ڈاکٹر ایس کے ستار (یونیورسٹی) ڈاکٹر ایف ایم عظمت اللہ، ڈاکٹر عاطف الدین مفتی (میڈیکل)، آر ایس رحمت اللہ، ڈاکٹر محی الدین پاشاہ، شمشاد بیگم، کلیم علی، محمد مسعود علی، محمد خواجہ، محمد عبدالنعیم، محمد قمر الزماں، ڈاکٹر فاطمہ آصف، ڈاکٹر مرزا مصطفیٰ علی بیگ، سید اختر پاشاہ، شیخ محمد ایوب، محمد ریاض الدین، مرزا مصطفیٰ علی بیگ، محمد مسعود علی اکبر، ڈاکٹر نصیر بیگم شیخ، ایس این نسیم النساء، یونس پاشاہ قریشی، محمد خواجہ، محمد غوث، محمد قمر علی، طیب بدر قادری، محمد ظہیر محی الدین، ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی، مرزا لطیف اللہ بیگم، اختر النساء بیگم، محمد عقیل احمد، محمد جمیل احمد، محمد خواجہ نصیر الدین، محمد قسیم الدین ایس ایم آدم صفی کے عبدالستار، اقبال الدین، قمر النساء بیگم، محمد غوث لعل، چاند بی بی محمد الیاس اور خواجہ عزیز قابل ذکر ہیں۔ تمام اساتذہ کو ایک سرٹیفکیٹ مومنٹو، شال اور 5 ہزار روپے کے چیکس دیے گئے۔ مسٹر شیخ جعفر سپر نٹنڈنٹ اکادمی نے کارروائی چلائی اور ارشد جبین میری نے شکریہ ادا کیا۔

روز نامہ 'رہنمائے دکن' حیدر آباد، 25 ستمبر 2012

اردو کا فروغ محبان اردو کی اولین ذمے داری

عادل آباد: دورِ حاضر میں اردو زبان کو فروغ دینا ہم سب کی اولین ذمے داری ہے۔ تاکہ والدین میں اپنے بچوں کو اردو تعلیم سے آراستہ کرنے کی امنگ پیدا ہو سکے۔ ان خیالات کا اظہار مائناریٹی ویلفیئر آفیسر عادل آباد مسٹر سید اظہر الدین نے آل کیئر ملٹی پریس سوسائٹی کے زیر اہتمام اردو بھون ہال میں منعقدہ گلشن اردو پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے مزید بتایا کہ اگر ہم اردو ذریعہ تعلیم طلبا کی تاریخ کا مشاہدہ کریں تب ہم کو پتہ چلتا ہے کہ سابق میں کئی ایک طلبہ نے اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرتے ہوئے نہ صرف اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں بلکہ سیاسی میدان میں بھی صفحہ اوّل میں رہ کر ملک کی خدمات کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ افتتاحی تقریب میں کرسپانڈینٹ شمع اردو ہائی اسکول محمد اخلاق محمد اردو ہائی اسکول فاروق صدیقی، اسلامیہ ماڈل اسکول، نونہال ہائی اسکول محمد عتیق و گورنمنٹ بالک مندر ہائی اسکول معلم عثمانی جانی نے بتایا کہ شہر عادل آباد میں پہلا موقعہ ہے کہ سرکاری و خانگی اردو مدارس کے ذمے داران آج ایک پلیٹ فارم پر ہیں جس سے اردو میڈیم کا اتحاد مزید پختہ ہوگا۔ انھوں نے مذکورہ سوسائٹی کی جانب سے منعقدہ تقریری و کوئیز مقابلے بالترتیب آندھرا پردیش میں اردو کا موقف، و اردو ادب کو بھی قابل ستائش قرار دیا۔

روز نامہ 'رہنمائے دکن' حیدر آباد، 18 ستمبر 2012

اتر پردیش

اردو کے مسائل اور ان کا حل

لکھنو: پریس کاؤنسل آف انڈیا کے صدر جسٹس مارکنڈے کاٹجو نے کہا کہ اردو کو کسی ایک طبقے کی زبان نہ بنایا جائے۔ اردو کو مسلمانوں کی زبان بتا کر اس کے ساتھ پہلے سے ہی بہت ناانصافی ہوئی ہے اس لیے اب اردو کے ساتھ اس ہونے والی ناانصافی کو روکنے کی ضرورت ہے۔ جسٹس کاٹجو مسیحا اردو سوسائٹی کی جانب سے قیصر باغ میں رائے اوماناتھ بلی آڈیٹوریم کے جے شنکر پرساد حال میں منعقدہ اردو کے مسائل اور ان کا حل موضوع پر ایک اہم جلسے سے خطاب کر رہے تھے۔ اردو زبان کی ترقی اور ترویج پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کو درجہ آٹھ تک لازمی قرار دیا جائے۔ اردو اور مسلمانوں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ

ہم سب لوگوں کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے۔ جلسے کی صدارت کرتے ہوئے خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر انیس انصاری نے کہا کہ یوں تو اردو کے ساتھ بہت سارے مسائل ہیں لیکن فوری طور پر چند نکات بہت اہم ہیں مثلاً سہ لسانی فارمولہ پر بھرپور عمل درآمد ہونا چاہیے۔ اطہر نبی ایڈوکیٹ نے اپنی رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا کہ دیگر ریاستوں کی طرح اتر پردیش میں بھی اردو کا نظم ونسق ہونا چاہیے، جس طرح مہاراشٹر، بہار میں اردو کی تعلیم کا بندوبست ہے۔ سوسائٹی کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر مسیح الدین خاں نے تمام حضرات کا استقبال کرتے ہوئے اردو کے مسائل سے متعلق نکات پڑھ کر سنائے اور جلسے میں ان پر غور و خوض کیا گیا۔ جلسے میں لکھنؤ شہر کی تمام علمی اور ادبی شخصیات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 18 ستمبر 2012

رام پور میں رضا لائبریری کا کتاب میلہ

رامپور: رضا لائبریری میں سہ روزہ کتاب میلہ کا افتتاح آئی ٹی رامپور کے پرنسپل انجینئر وی کمار علیگ نے کیا۔ تقریب کا آغاز ڈاکٹر مولانا ارشاد نوگانوی نے تلاوت کلام الٰہی سے کیا اس موقع پر لائبریری کے ڈائریکٹر پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین نے بتایا کہ کتاب میلے میں نیشنل بک ٹرسٹ، دہلی

اردو اکادمی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے علاوہ رضا لائبریری کے ذریعہ مطبوعہ کتب بھی دستیاب ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کتب میلے کا مقصد یہاں کے طلبہ کو کتابیں دستیاب کرانا ہیں۔ مہمانِ خصوصی وی کمار نے کہا کہ اس طرح کے میلوں کے ذریعے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور کتابیں ہی معلومات حاصل کرنے کا اہم ذریعہ ہیں۔ تقریب کی نظامت ارن کمار سکسینہ نے کی اور سید طارق اظہر نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 اکتوبر 201

روہیل کھنڈ یونیورسٹی میں کتاب میلہ

بریلی: روہیل کھنڈ یونیورسٹی میں نمائش کا سلسلہ چل رہا ہے، جہاں رامپور کی مشہور رضا لائبریری کی کتابوں کی دو روزہ نمائش اختتام پذیر ہوئی۔ دونوں دن کتابوں کے شائقین کی بھیڑ جمع رہی۔ رامپور سے رضا لائبریری کی کتابوں کی نمائش کے لیے یونیورسٹی آئے ہمانشو اور شہامت نے بتایا کہ ہر سال لائبریری کی جانب سے اس طرح کی نمائش کی جاتی ہے جہاں اس دوروزہ نمائش میں تقریباً 25 ہزار تک کی کتابیں فروخت ہوچکی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتابوں میں روہیل کھنڈ کی تاریخ اور بالمیکی کی رامائن جس کا اردو فارسی ترجمہ سب سے زیادہ پسند کیا گیا اور خریدی گئیں۔ وہیں لائبریری کی نمائش میں کچھ ایسی کتابیں بھی موجود تھیں جو بریلی میں بہ آسانی حاصل نہیں ہورہی تھیں۔ سبھی کتابوں میں 30 فیصدی رعایت دی گئی۔ اس کے علاوہ واقع الزماں، تاری فرشتہ کو بھی لوگوں نے خریدا۔ انھوں نے بتایا کہ دورِ مغلیہ اور دہلی کی سلطنت کا سب سے زیادہ بہتر کلیکشن صرف رضا لائبریری میں حاصل ہوسکتا ہے۔ کتابوں کے شائقین نے کتاب 'مدھ کالین بھارت کے مسلمان شاسک کی دھارمک ادارتا' کو بھی بڑی تعداد میں خریدا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 اکتوبر 2012

اسکولوں میں اردو کو لازمی مضمون کی حیثیت

لکھنؤ: جلد ہی یوپی کے تمام سرکاری اسکولوں میں اردو کو ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھائے جانے کا مطالبہ تسلیم کرلیا گیا ہے۔ انگریزی روزنامہ ٹائمز آف انڈیا کی ایک خبر کے مطابق سماج وادی پارٹی کے سپریمو ملائم سنگھ یادو نے مشہور عالم دین مولانا کلب جواد کا یہ مطالبہ تسلیم کرلیا ہے کہ اردو کو اتر پردیش کے اسکولوں میں ایک لازمی مضمون کی حیثیت دی جائے۔ خیال رہے کہ مولانا جواد نے مطالبہ کیا تھا کہ جس طرح یوپی کے سرکاری اسکولوں میں سنسکرت ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے، اسی طرح اردو کو بھی ایک لازمی زبان قرار دیا جائے۔ اخبار نے اپنے ذرائع سے اطلاع دی ہے کہ ملائم سنگھ نے یوپی کی حکومت کے پاس مولانا کلب جواد کے مطالبہ کو اس سفارش کے ساتھ بھیج دیا ہے کہ اکھلیش سرکار اس پر سنجیدگی سے غور کرے۔ سماج وادی پارٹی کے ترجمان راجندر چودھری نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ مولانا کلب جواد کا مطالبہ اصولی طور پر مان لیا گیا ہے اور اس کو متعلقہ محکمہ کے پاس غور وخوض کے لیے بھیج دیا گیا ہے۔ چودھری نے کہا کہ مولانا کلب جواد نے سنسکرت کے طرز پر اردو کو بھی سرکاری اسکولوں میں لازمی قرار دینے کا مطالبہ کیا تھا، لیکن یوپی کی حکومت کے ذریعے کوئی فیصلہ لیے جانے کے بعد ہی اس بارے میں حتمی اعلان کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ طلبہ کو دیے جانے والے لیپ ٹاپ اور چھوٹے کمپیوٹروں میں بھی ایسا سافٹ ویئر لگائے جانے کے بارے میں غور ہو رہا ہے جس کو اردو جاننے والے طلبہ آپریٹ کرسکیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 اکتوبر 2012

یوروپ کی ناول نگاری پر عربی اثرات

لکھنؤ: یورپ کی تاریکی جس روشنی سے دور ہوئی اس کا اولین سرچشمہ یونان و روم نہیں، بلکہ قرطبہ، غرناطہ، طلیطلہ اور اندلس کے دوسرے علمی و ثقافتی مراکز تھے۔ اسپین میں مسلمانوں کی عملداری کے اختتام سے پہلے ہی بیداریِ یورپ کا عمل شروع ہوچکا تھا جس میں عربی اسلامی میراث کے لاطینی، یونانی، عبرانی، فرانسیسی، اطالوی، ہسپانوی اور انگریزی زبانوں میں ادارہ جاتی اور انفرادی ترجموں نے بنیادی کردار ادا کیا۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر ثناء اللہ ندوی نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی کے لکھنؤ کیمپس کے زیر اہتمام منعقدہ توسیعی خطبے کے دوران جے شنکر ہال میں کیا۔ توسیعی خطبے کا موضوع 'یورپ کی ابتدائی ناول نگاری

پر عرب تہذیب وثقافت کے اثرات' تھا، صدارت کے فرائض انٹگرل یونی ورسٹی کے چانسلر اور ندوۃ العلما کے مہتمم مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی نے فرمائی۔ جبکہ ڈاکٹر انیس انصاری بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے اور ڈاکٹر رخسانہ لاری بطور مہمان اعزازی شریک ہوئیں۔ اس پروگرام کا آغاز اقرا خاتون نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ ڈاکٹر عشرت ناہید نے کلمات تشکر ادا کیے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر عمیر منظر نے انجام دیے۔ ڈاکٹر عبدالقدوس نے مہمانوں اور حاضرین کا استقبال کیا۔ ڈاکٹر ثناء اللہ ندوی نے مزید کہا کہ ابتدا میں یورپی ناول نگاروں کے یہاں کوئی نیا موضوع نہیں تھا بلکہ بیشتر ناول نگاروں کے یہاں عربی کے ترجمے یا ان کے چربے ملتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ صرف ناول ہی نہیں بلکہ نثر کی دیگر اصناف میں بھی عربی کے واضح اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ صدارتی خطاب میں مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی نے کہا کہ علمائے عرب نے اندلس کو جنگل سے نکال کر

تمدن کا راستہ دکھایا، یورپ نے عرب عالموں سے بہت کچھ سیکھا ہے مگر کبھی اس کا اعتراف نہیں کیا۔ مولانا سعیدالرحمٰن نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی کے ارباب حل وعقد کو اس کامیاب لیکچر کے لیے مبارکباد دی۔ ڈاکٹر انیس انصاری نے کہا کہ اسلامی تہذیب وتمدن نے دنیا کی بیشتر تہذیبوں اور ثقافتوں کو متاثر کیا ہے اور بہت کچھ دیا۔ اس موقع پر انھوں نے مزید کہا کہ فاتح او رمفتوح دونوں قومیں ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھتی اور حاصل کرتی ہیں مگر عربی علما نے پوری دنیا پر جو اثرات قائم کیے ہیں ان کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ ڈاکٹر رخسانہ لاری صاحبہ نے کہا کہ اس طرح کے خصوصی خطاب سے نہ صرف طلبہ، اساتذہ بلکہ عام علمی اور ادبی حلقوں کو خاطر خواہ فائدہ ملے گا اور لکھنؤ کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کو ایک نئی زندگی ملے گی۔ ابتدا میں ڈاکٹر عبدالقدوس (انچارج مانو لکھنؤ کیمپس) نے مہمانوں اور حاضرین کا استقبال کیا۔ انھوں نے اس موقع پر لکھنؤ کیمپس کی تعلیمی سرگرمیوں سے حاضرین کو واقف کرایا۔ اس موقع پر انھوں نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر محمد میاں کا خاص طور پر شکریہ ادا کیا جن کی سربراہی میں لکھنؤ کیمپس کی علمی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا ہے۔ ڈاکٹر عبدالقدوس نے لکھنؤ کیمپس کے کوارڈی نیٹر پروفیسر محمد ظفرالدین صاحب کا خصوصی شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: عمیر منظر مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس، 4 اکتوبر 2012

بہار:

شاہ حسین کی شاعری خدا پرستی اور انسان دوستی کا پیغام ہے

پٹنہ: خدابخش لائبریری میں ایشیاٹک سوسائٹی بہار اور خدابخش لائبریری کے زیراہتمام ملک کے نامور مورخ پروفیسر جے ایس گریوال، پروفیسر ایمیریٹس پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ نے قیام الدین احمد یادگاری خطبہ پیش کیا اور لائبریری کے ڈیجیٹلائز کیے ہوئے ایک اہم مخطوطہ کو لائبریری ویب سائٹ پر لانچ کیا۔ پروفیسر محی الدین صدر ایشیاٹک سوسائٹی بہار نے جلسے کی صدارت کی اور پروفیسر سدھیشور پرشاد، سابق گورنر تریپورہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ پروگرام کے آغاز میں ڈاکٹر امتیاز احمد، ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری نے پروفیسر گریوال کی علمی شخصیت سے لوگوں کو متعارف کرایا اور پروفیسر گریوال کو اتہاس رتن کے اعزاز سے نوازنے پر مسرت کا اظہار کیا۔ پروفیسر جے ایس گریوال نے پروفیسر قیام الدین احمد کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ایک پنجابی شاعر 'شاہ حسین کے کلام میں نسوانی آواز کی سماجی اہمیت' کے موضوع پر قیام الدین احمد یادگاری خطبہ پیش کیا اور کہا کہ پنجاب کے ایک بڑے صوفی اور مغل بادشاہ اکبر کے معاصر شاہ حسین پنجابی زبان میں شعری تخلیقات کی وجہ سے مشہور ہیں۔ انھوں نے پنجابی زبان میں 'کافی' کی صنف کو اپنایا جس میں عشق خداوندی میں ڈوبا ہوا کلام صوفیانہ افکار کا مظہر ہوتا ہے۔ شاہ حسین کی شاعری تین وجوہ سے اہم ہے۔ اول یہ کہ ان کی شاعری نسوانی بیانیہ میں ہے۔ دوئم ان کے کلام میں صوفیانہ افکار اور طرزعمل کا اظہار ملتا ہے۔ سوئم ان کی شاعری میں عورتوں کے خلاف نفرت وعصبیت کی کوئی جھلک نہیں ملتی۔ وہ ایک عورت کی حیثیت سے کلام کرتے ہیں تاکہ عورتوں کو بھی زبان گویائی عطا کی جاسکے۔ شاہ حسین اپنے کلام میں ایسی زبان، لفظیات اور محاورے استعمال کرتے ہیں جن سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ وہ ذات، فرقے اور نسل کے تعصبات سے اوپر اٹھ کر سارے مرد وعورت سے یکساں مخاطب ہیں۔ خاص کر شاہ حسین کے کلام میں خدا کا تصور اور خدا کے لیے استعمال کیے گئے اوصاف خدا کے سلسلے میں سارے فرقوں کے تصورات سے جداگانہ ہیں۔ وہ عشق الٰہی کے سوا کسی اور معاملے میں انسانوں کے مابین کوئی تفریق نہیں کرتے۔

روزنامہ 'آزاد ہند' کولکاتہ، 12 ستمبر 2012

اردو لرننگ اینڈ اسپوکن کورس کا آغاز

پٹنہ: ادارہ تحقیقات عربی وفارسی پٹنہ میں ایک اہم نشست ڈاکٹر حسن رضا خاں (ڈائرکٹر) کی صدارت میں ہوئی جس میں ادارے میں بہار سرکار کے ذریعے اردو لرننگ اینڈ اسپوکن کورس کے آغاز کیے جانے پر مسرت کا اظہار کیا گیا۔ یہ ادارہ عربی اور فارسی ڈپلومہ کورس برسوں سے چلاتا آرہا ہے۔ اب مزید اردو لرننگ کورس کے شروع ہوجانے سے ادارہ میں نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ ادارہ کے رجسٹرار ڈاکٹر محمد اعجاز احمد نے اس کورس کو شروع کرنے پر بہار سرکار کا شکریہ ادا کیا ہے اور امید ظاہر کی ہے کہ اس دور میں جب کہ اردو نامناسب حالات سے دوچار ہے، ادارہ تحقیقات کی یہ کوشش اردو دنیا میں لائق ستائش ہوگی اور اردو زبان وادب کے اسکالرس اس میں اپنا بھرپور تعاون دیں گے۔

پریس نوٹ، ڈاکٹر محمد اعجاز احمد، ادارہ تحقیقات عربی وفارسی پٹنہ، حکومت بہار

جموں و کشمیر:

جموں وکشمیر کلچرل اکادمی کی مالی امداد

سری نگر: جموں وکشمیر کلچرل اکادمی نے مورخوں، فنکاروں، قلمکاروں کو بہ وقت ضرورت امداد فراہم کرنے کے لیے ایک فنڈ قائم کیا ہے۔ اس فنڈ کے لیے ریاستی حکومت نے ساٹھ لاکھ روپیہ فراہم کیا ہے اور اس کے علاوہ عطیہ اور چندہ بھی اس فنڈ کا حصہ ہوں گے۔ جموں و کشمیر اکادمی آف آرٹ، کلچرل اور لینگویج انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری خالد بشیر نے یہ بات بتائی۔ فنڈ قائم کرنے کا فیصلہ حال ہی میں سینٹرل اکادمی کے مرکزی کمیٹی کی ایک میٹنگ میں کیا گیا جس کی صدارت عمر عبداللہ بے حیثیت اکادمی صدر کی۔ سکریٹری خالد بشیر نے کہا کہ اکادمی کروڑوں روپے کی لاگت سے ایک تہذیب محل تعمیر کررہی ہے جس کا مقصد ریاست کی ثقافت اور زبانوں کو بڑھاوا دینا ہے۔ اس پر تقریباً 88 کروڑ روپے خرچ ہوں گے۔ اکادمی کے ٹیگور ہال اور ابھینو تھیٹر کی مرمت پر بھی بارہ کروڑ پینتالیس لاکھ اور پانچ کروڑ ستائیس لاکھ بالترتیب خرچ ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ اکادمی کو مزید متحرک اور فعال بنانے کے لیے کئی نئے پروگرام شروع کیے جارہے ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 16 ستمبر 2012

کرناٹک:

بنگلور میں محفل غزل

بنگلور: کرناٹک اردو اکادمی نے محفل غزل کا انعقاد کیا جس میں اہل ذوق حضرات نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ اس محفل میں مہمانان گرامی اور حاضرین کا استقبال کرتے ہوئے مرزا اعظمت اللہ صاحب رجسٹرار کرناٹک اردو اکادمی نے کہا کہ ہم اکادمی کو فعال رکھنے کی ہرممکن کوشش میں لگے ہیں اور ایسے تمام پروگراموں کو اہمیت دے رہے ہیں جن سے اردو کا فروغ ممکن ہے۔ حافظ کرناٹکی نے اپنے خصوصی خطاب میں کہا کہ غزل جتنی پڑھنے کی چیز ہے اتنی ہی سننے کی بھی چیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کی رسائی کا دائرہ بہت ہی وسیع ہے۔ غزل میں انسانی احساسات وجذبات کا جس طرح ذکر ہوتا ہے اور قلبی واردات کو جس سلیقے سے پیش کیا جاتا ہے وہ اسی کا خاصہ ہے۔ محض دومصرعوں میں بڑے سے بڑے واقعے، حادثے، اور واردات کو پیش کرنا اپنے آپ میں ایک حیرت انگیز اور مسرت آمیز تجربہ ہوتا ہے۔ یہی خوبی غزل کی مقبولیت کی اساس ہے۔ جاوید پٹیل نے اکادمی کی کارکردگی کو سراہتے ہوئے کہا کہ اکادمی کے پروگرام لوگوں کے دلوں کو چھو لینے والے ہوتے ہیں۔ آپ لوگ اس طرح کے پروگرام کے لیے دلی مبارک باد کے مستحق ہیں۔ عبیداللہ شریف نے کہا کہ محفل غزل عام طور پر رات میں منعقد کی جاتی ہے۔ آپ نے دن میں غزل کی

محفل آراستہ کر کے ایک جدت پیدا کی ہے۔ اتوار کے دن تمام لوگ چھٹی پر ہوتے ہیں اس مناسبت سے غزل کی اس محفل کی اہمیت بڑھ جاتی ہے اور لوگوں کو اس طرح کے پروگرام میں شامل ہونے کے اچھے مواقع مل جاتے ہیں۔ اس محفل غزل میں انڈر سکریٹری محکمہ اقلیتی فلاح و بہبود جناب عباس شریف صاحب بھی تشریف فرما تھے، انھوں نے بھی اس غزل محفل کی ستائش کی اور کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے جس طرح کے بھی کام ہوں آپ لوگ خلوص سے کریں، ہم انشاءاللہ آپ کے ساتھ ہوں گے۔ مبین منور نے کہا کہ یہ حافظ کرناٹکی کی محنت کا ثمر ہے کہ آج ہمیں معلوم ہو رہا ہے کہ رسالوں اور پروگراموں کے ذریعے کس طرح اردو کے فروغ کی راہیں ہموار کی جاتی ہیں۔ سید رفیع اللہ نے کہا کہ میرے لیے یہ خوشی کی بات ہے کہ آپ نے مجھے اتنی خوبصورت محفل میں شرکت کا موقع دیا۔ اس پروگرام کی نظامت کے فرائض منیر احمد جامی نے ادا کیے اور انھیں کے شکریہ کے ساتھ پروگرام اختتام کو پہنچا۔

روزنامہ 'اردو ایکشن' بھوپال، 18 ستمبر 2012

مہاراشٹر:

اردو اکادمی کا نصف بجٹ اردو طلبا پر خرچ ہو

ممبئی: اردو ریسرچ ایسوسی ایشن کے پروگرام میں مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے صدر خورشید صدیقی اور دیگر اراکین کا استقبال کرتے ہوئے شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر صاحب علی نے مطالبہ کیا کہ اکادمی کے بجٹ کا نصف حصہ اردو طلبا پر خرچ کیا جانا چاہیے۔ اس دور میں اردو کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ ادبا اور شعرا کے ساتھ ابتدائی درجات سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک اردو کی تعلیم و تدریس کے لیے ساز گار ماحول ہو اور اس کے لیے اکادمی کو ایسا لائحہ عمل تیار کرنا چاہیے کہ ہر سطح پر طلبا کی حوصلہ افزائی ہو، تاکہ وہ اردو تعلیم میں بہتر کارکردگی انجام دے سکیں۔ انھوں نے شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی کی گزشتہ پانچ برسوں کی کارگزاریوں پر مختصراً روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی تعلیم کے علاوہ شعبہ کی جانب سے صحافت اور کمپیوٹر سے متعلق دو پروفیشنل کورسز بھی کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ پروگرام میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کرنے والے خورشید صدیقی نے حکومت کی جانب سے اقلیتی طبقہ کے لیے جاری کیے گئے منصوبوں پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ان منصوبوں سے استفادہ اسی وقت کیا جاسکتا ہے جبکہ ہمیں ان کے بارے میں خاطر خواہ معلومات ہو۔ پروگرام میں اکیڈمی کے ایکزیکیوٹو آفیسر وقار قادری، شاہد ندیم اور اسلم پرویز نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، پروفیسر صاحب علی، ممبئی، 27 ستمبر 2012

مدھیہ پردیش:

ریاستی اردو اکادمی کی ادبی تقریب

بھوپال: مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی ادبی نشست اتوار کو اکادمی کے چیئرمین سلیم قریشی کی زیر صدارت منعقد ہوئی، جس میں پروفیسر آفاق احمد نے کہا کہ بھوپال کو 'دارالاقبال' علامہ اقبال سے اِس شہر کی نسبت کی وجہ سے نہیں کہا جاتا، بلکہ 18 ویں صدی سے یہاں کی علمی فتوحات کے باعث اس نام سے یاد کیا جارہا ہے، موصوف نے اس کی مثالیں بھی پیش کیں۔ ایک سروے کے مطابق بھوپال میں 20 ہزار بچے اردو پڑھ رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کہانیاں لکھنا اور شعر کہنا یقیناً قابل قدر کام ہے لیکن ایک بچے کو اردو زبان سے آراستہ کر دینا اس سے زیادہ اہم کام ہے، آفاق صاحب نے نشست میں پیش کیے گئے ڈاکٹر قدسیہ اختر کے تحقیقی مقالے بعنوان 'شمالی ہند کے اساتذہ سخن کے بھوپال سے تعلق رکھنے والے شاگرد' اور بزرگ و نئی نسل کے شعرائے کرام شکیل گوالیاری، رشید اندوری، نور محمد یاس، ونود سکینہ، گلزار اور شائستہ جمال کے کلام کی خوبیوں پر بھی روشنی ڈالی جب کہ علی عباس امید صاحب نے اردو اکادمی کی نشستوں میں مختلف اصناف سخن کی نمائندگی کو سراہتے ہوئے فرمایا کہ پہلی ضرورت یہ ہے کہ اکادمی کے بجٹ میں خاطر خواہ اضافہ ہوا، سلیم قریشی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ یہ صحیح ہے کہ اکادمی کا بجٹ کم ہے لیکن ہمارا حوصلہ کم نہیں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ میں اردو زبان و ادب کی خدمت کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا لیکن اس کے لیے مجھے اہل اردو کا تعاون درکار ہوگا۔ اکادمی کے پروگرام مدھیہ پردیش کے دوسرے شہروں میں منعقد ہوں یہ بھی ہماری کوشش ہوگی اور اگلی نشست اندور میں منعقد کی جائے گی۔ سکریٹری اردو اکادمی نصرت مہدی نے مہمانانِ کرام اور حاضرین کا استقبال کرتے ہوئے یقین دلایا کہ اردو اکادمی کو پوری ریاست کی نمائندہ اکادمی بنانے اور ہر اردو والے کو یہاں خوش آمدید کہنے کے لیے ہماری کوششیں جاری ہیں۔ پروگرام کی نظامت پروگرام انچارج انیس انصاری نے سلیقے کے ساتھ انجام دی۔

روزنامہ 'ندیم' بھوپال، 11 ستمبر 2012

اقبال کے ترانوں کی سی ڈی

بھوپال: ابھی حال ہی میں ڈرامہ کلاکار وقار حسین نے ایک آڈیو سی ڈی 'پیغامِ اقبال' تیار کی ہے جس کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ کئی سال پہلے ان کے ماموں مسعود صدیقی نے انھیں ممنون حسن پاپا میاں کے پاس اس مقصد سے بھیجا تھا کہ علامہ اقبال کے بچوں کے ترانوں کو کمپوز کر کے انھیں ریکارڈ کیا جائے لیکن بجٹ کی وجہ سے یہ کام نہیں ہوسکا لیکن وقار کے دل میں یہ بات ہمیشہ رہی کہ کسی طرح یہ مشن پورا ہوجائے۔ اب انھوں نے کوشش کر کے انٹرنیٹ کی مدد سے اس سی ڈی کو تیار کیا ہے حالانکہ یہ کوئی کمرشیل کام نہیں ہے۔ صرف اردو کی خدمت کے جذبے سے اسے تیار کیا ہے وہ بھی اپنے مصارف سے، اسے لاگت پر ہی علامہ اقبال اور اردو کے چاہنے والوں کو پیش کیا جائے گا۔ وقار حسین نے یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ مرحوم حکیم قمر الحسن صاحب کی زندگی پر ایک شارٹ فلم تیار کی جائے جس کی ویڈیو سی ڈی نے اور اسے یوٹیوب پر بھی اپ لوڈ کیا جائے۔ اس بارے میں وہ جلد ہی عارف میاں اور پرویز میاں سے گزارش کریں گے۔

روزنامہ 'ندیم' بھوپال، 11 ستمبر 2012

شیکسپیئر کی ڈکشنری مکمل

بھوپال: پروفیسر ضمیر الدین اور ان کی دختر ڈاکٹر فرح ضمیر ریحان نے ایک طویل عرصے کی محنت کے بعد انگریزی ڈرامہ نگار ولیم شیکسپیئر کی ایک لغت مرتب کر لی ہے۔ عام طور پر یہ مانا جاتا رہا ہے کہ شیکسپیئر ایک اعلیٰ درجہ کا ڈرامہ نگار تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ڈرامہ نگار ہونے سے پیشتر وہ ایک عظیم شاعر تھا اور اقتصادی تقاضوں کی خاطر ہی اس نے ڈرامے لکھے۔ شیکسپیئر کے ڈرامے اِس لیے بھی بہت مقبول ہوئے کیونکہ ان ڈراموں کے مکالمے اُس شعری زبان میں قلمبند کیے گئے ہیں جو شعری ادب اور شعری زبان کے شاہکار ہیں۔ پروفیسر ضمیر الدین نے شیکسپیئر کے مطالعے کے دوران محسوس کیا کہ اُس کی شعری زبان میں غالب، میر، ذوق، اقبال اور دیگر اردو شعرا کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر ضمیر الدین ایک مقالہ تیار کر رہے ہیں جس میں یہ تاثرات تفصیل کے ساتھ قلمبند کیے جائیں گے۔ شیکسپیئر کی اس ڈکشنری کا عنوان ہے 'ایوریبڈیز شیکسپیئر۔ اے فیسٹ آف لینگویج' یعنی ہر ایک کا شیکسپیئر۔ ایک شعری تحفہ' یہ ڈکشنری "10x8 کی 423 صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ہے۔

روزنامہ 'ندیم' بھوپال، 18 ستمبر 2012

ایم پی اردو اکادمی کی مجلس عاملہ اور منتظمہ کی تشکیل

بھوپال: مدھیہ پردیش حکومت نے آج ایم پی اردو

اکادمی کی جنرل باڈی اور ورکنگ کمیٹی کی تشکیل کا نوٹیفکیشن جاری کردیا۔ تقریباً چھ سال بعد اکادمی کی مجلس عاملہ کی تشکیل خوش آئند ہے۔ 2006 سے اسٹیٹ اردو اکادمی مجلس عاملہ اور مجلس منتظمہ کے بغیر کام کررہی تھی۔ اردو حلقوں کی جانب سے مجلس عاملہ اور مجلس منتظمہ کی تشکیل کے مطالبے کیے جاتے رہے اور 'ندیم' کے ذریعے بھی کئی دفعہ اس جانب حکومت کی توجہ مبذول کی گئی۔ اردو حلقوں کے لیے یہ خوش آئند خبر ہے۔ تقریباً چھ ماہ پہلے اردو اکادمی میں بحیثیت صدر ذمے داریاں سنبھالنے والے سلیم قریشی کی قیادت میں تشکیل کردہ مجلس عاملہ اور مجلس منتظمہ میں جن شخصیات کو نمائندگی دی گئی ہے ان میں شیخ نظامی (جبلپور)، پروفیسر حسن مسعود (بھوپال)، پروفیسر مختار شمیم (سرونج)، عبیدالرحمٰن وفا صدیقی (بھوپال)، ڈاکٹر مہتاب عالم (بھوپال)، ڈاکٹر نریندر ناتھ بیرمنی (اندور)، ڈاکٹر ایس ایم شکیل (برہانپور)، ڈاکٹر صفدر رضا (کھنڈوا)، ڈاکٹر ظفر محمد (اجین)، سحر منصوری (ریوا)، قمرالدین برتر (گوالیار)، ڈاکٹر پروین کیف (بھوپال)، کامل بہزادی (بھوپالی)، رشید اندوری (اندور)، شبیر خان راہی (رتلام)، زماں خان (جبلپور)، پروفیسر فدا حسین (ساگر)، ڈاکٹر آفاق عارف (جبلپور)، ڈاکٹر سیفی سرونجی (سرونج) کے علاوہ محکمہ تعلیمات، محکمہ ثقافت، مدھیہ پردیش ساہتیہ پریشد کے سکریٹریوں کو بھی نمائندگی دی گئی ہے۔ چیئرمین سلیم قریشی نے 'ندیم' سے کہا کہ ریاست حکومت نے اردو حلقوں کا دیرینہ مطالبہ آج پورا کرکے اردو کے فروغ کے تئیں اپنے پرخلوص عزم کو ظاہر کیا ہے اور یہ سب کچھ وزیراعلیٰ شیوراج سنگھ چوہان کی خصوصی توجہ کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ اکادمی کی ورکنگ کمیٹی اور جنرل باڈی میں اردو کی نمائندہ شخصیات کو جگہ دینے کے ساتھ ہی اکادمی کے امور کار میں پوری ریاست کو نمائندگی دی گئی ہے۔ ان کی کوشش ہوگی کہ تمام ادبی شخصیات کے تعاون اور تجاویز کے ساتھ وہ اردو کے فروغ کے لیے مثبت اور تعمیری قدم اٹھاسکیں گے۔

روزنامہ 'ندیم' بھوپال، 19 ستمبر 2012

مغربی بنگال:

دارجلنگ میں اردو کی خدمت

کلکتہ/دارجلنگ: ریاست میں حکومت تبدیل ہونے کے بعد مختلف تبدیلیوں کے دوران اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا اور اردو کی ترقی کے لیے مخصوص مغربی بنگال اردو اکادمی کے اختیارات میں اضافہ کرکے پوری ریاست میں اردو کو اس کا حق دلانے کے لیے خود وزیراعلیٰ ممتا بنرجی نے کئی اقدامات کیے ہیں۔ ریاست کے کچھ حالت زیادہ اچھی نہیں ہے اسی میں ایک ضلع شمالی بنگال کا دارجلنگ بھی آتا ہے جہاں کئی ہزار اردو آبادی ہونے کے باوجود یہاں اردو کی ترقی کے لیے حکومت کی طرف سے اب تک کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا جس وجہ سے آج بھی اردو پہلے جیسی حالت میں ہے۔ یہاں بنیادی سہولتوں کی غیر موجودگی میں بھی کچھ لوگ اردو کی خدمت کرنے میں لگے ہیں اور انھی کی خدمات کی وجہ سے یہاں اردو آج بھی قائم ہے۔ پہلی مرتبہ دارجلنگ ضلع میں اردو کی خدمت کرنے والوں کو حکومت کی طرف سے یاد کیا گیا ہے۔ دارجلنگ ضلع کے سلی گوڑی شہر میں واقع واحد اردو ادارہ مغربی بنگال مدرسہ بورڈ سے منظور شدہ شمسیہ ہائی مدرسہ میں گزشتہ 33 سالوں سے اردو پڑھانے والے ماسٹر بشیرالدین کو ٹیچرس ڈے کے موقعے پر ریاستی حکومت کی طرف سے اعزاز دیا گیا۔ ماسٹر بشیرالدین کا تعلق بہار کے سیوان ضلع سے ہے۔ ماسٹر بشیرالدین نے بتایا کہ اس مدرسہ میں ہائر سکنڈری زمرہ میں صرف آرٹس کی تعلیم کا بندوبست ہے جب کہ سائنس اور کامرس کا انتظام نہ ہونے سے یہاں کے طلبا کو دشواری لاحق ہے انھوں نے بتایا کہ اس خطے میں اردو کو بڑھاوا دینے کے لیے سلی گوڑی کے اشرف نگر، دربھنگہ ٹولہ، چمپا ساڑھی، سلی گوڑی جنکشن علاقہ، ماٹی گاڑہ، باگڈوگرا اور نکسل باڑی وغیرہ جیسے علاقوں میں اردو کی بنیادی تعلیم کا بندوبست کرنا ایک بہتر قدم ہوگا اور اس کے لیے ریاستی حکومت اور مغربی بنگال اردو اکادمی کو اقدامات کرنے کی ضرورت ہے تاکہ یہاں اردو کو فروغ مل سکے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' کولکاتہ، 6 ستمبر 2012

اعزاز و اکرام:

گلزار کو اندرا گاندھی قومی یکجہتی ایوارڈ

نئی دھلی: ممتاز نغمہ نگار اور فلمساز سمپورن سنگھ عرف گلزار کو قومی یکجہتی کے جذبے کے فروغ کے لیے خدمات کے اعتراف میں 27ویں اندرا گاندھی قومی یکجہتی ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ یہاں ایک بیان میں ایوارڈ کی مشاورتی کمیٹی کے ممبر سکریٹری موتی لال وورا نے کہا کہ سال 2011 کے لیے 27واں اندرا گاندھی قومی یکجہتی ایوارڈ مشہور شاعر نغمہ نگار قلم کار اور فلم ساز گلزار کو ملک میں قومی یکجہتی کے جذبے کو فروغ دینے اور محفوظ رکھنے کی ان کی خدمات کے اعتراف میں دیا جائے گا۔ یہ ایوارڈ ایک سپاس نامہ و 5 لاکھ روپے نقد پر مشتمل ہے۔ یہ ایوارڈ

اندرا گاندھی قومی یکجہتی ایوارڈ کمیٹی کی سربراہ اور صدر کانگریس سونیا گاندھی 31 اکتوبر کو پیش کریں گی جس دن سابق وزیراعظم اندرا گاندھی کی برسی ہے۔ اب تک جن لوگوں کو اس ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا ہے اس میں سابق صدر جمہوریہ اے پی جے عبدالکلام اور شنکر دیال شرما اور سابق وزیراعظم راجیو گاندھی، پنجاب کے سابق وزیراعلیٰ بے انت سنگھ، ارونا آصف علی، شیام بینیگل، جاوید اختر، اے رحمٰن، مہاشویتا دیوی اور موہن دھاریہ شامل ہیں۔ جن اداروں کو اس ایوارڈ سے نوازا گیا ہے اس میں بھارت اسکاؤٹ اینڈ گائڈس، پرم دھام آشرم پونار، وردھا، کستوربا گاندھی، راشٹریہ اسمارک ٹرسٹ اندور اور رام کرشن مشن آشرم نرائن پور چھتیس گڑھ اہم ہیں۔ قومی یکجہتی اور اہم آہنگی کے نظریہ کو دائم وقائم رکھنے کے لیے کانگریس نے اپنے 100 سالہ قیام میں اندرا گاندھی راشٹریہ ایکتا ایوارڈ کا قیام کیا تھا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 30 ستمبر 2012

عابدہ پروین اور منور رانا

نئی دھلی: برصغیر کے ممتاز شاعر منور رانا کو 2012 کے کلادھرمی باغ ایوارڈ برائے شعری خدمات سے سرفراز کا گیا ہے۔ بیگم اختر اکادمی آف غزل کی جانب سے دیا جانے والا یہ باوقار ایوارڈ انڈیا ہیبی ٹیٹ سینٹر میں منعقد ایک پروقار تقریب میں فلم ساز وہدایت کار سدھیر مشرا کے ہاتھوں دیا گیا۔ اس موقعے پر پاکستان کی معروف گلوکارہ عابدہ پروین کو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ برائے موسیقی و گلوکاری سے نوازہ گیا۔ حکومت ہند کی وزارت برائے ثقافت اور ہندوستان کونسل برائے ثقافتی روابط (آئی سی آر) کے اشتراک سے منعقد اس تقریب میں مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل کپل سبل، ڈائریکٹر جنرل دوردرشن مسترتر پالی سمیت مختلف اداروں سے وابستہ سرکردہ شخصیات شامل تھیں۔ واضح رہے کہ کلادھرمی باغ تنظیم جمال اختر کے عنوان سے بیگم اختر کی صدی تقریبات منارہی ہے۔ مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل کپل سبل نے بیگم اختر کے کلام کی تعریف کرتے ہوئے کہا ان کی آواز اتنی شیریں تھی کہ ہم اسے کبھی نہیں بھلا پائیں گے۔ ان کی آواز ہمارے دل اور ذہنوں پر چھائی ہوئی ہے جو ہر وقت گونجتی

رہتی ہے۔ ان کی غزلوں کے الفاظ ہمارے دلوں کو چھو لیتے ہیں جن میں ایک مٹھاس بھری ہوتی ہے۔ میں اپنے بچپن سے ہی غزل وغیرہ کو کافی پسند کرتا تھا اور یہ سلسلہ اسکول اور کالج تک جاری رہا۔ کلادھری تنظیم بیگم اختر کی یاد میں پروگرام منعقد کرتی ہے جو انھیں خراجِ عقیدت پیش کرنے کا ایک بہتر ذریعہ ہے۔ دور درشن کے ڈائریکٹر جنرل تریالی نے کہا کہ بیگم اختر نے جیسی زندگی کو جیا اسی طرح ان کی غزلوں کو پیش کیا جو قابلِ تعریف ہے۔ بیگم اختر ہر طرح کے دور سے گزریں اور زمانہ کے ساتھ چل کر موسیقی کو فروغ دیا۔ ہندوستانی گلوکاری کے فروغ میں اہم رول نبھایا جس کو ابھی آگے بڑھایا جا رہا ہے۔ کلادھری کی جنرل سکریٹری ریتا گانگولی سے دوردرشن کا معاہدہ ہوا ہے، جس میں بیگم اختر کی زندگی پر فلم بنائی جائے گی۔ وائس چیئرمین کلادھری ڈاکٹر ایس کے ورما نے تنظیم کے اغراض ومقاصد بیان کیے۔ تنظیم کیفی اعظمی، علی سردار جعفری، ندا فاضلی، اور احمد فراز وغیرہ کو بھی شعری خدمات کے طور پر ایوارڈ دے چکی ہے۔ اس سال مایۂ ناز شاعر منور رانا کو یہ ایوارڈ پیش کیا جا رہا ہے۔ تنظیم کی جنرل سکریٹری ریتا گانگولی نے بھی بیگم اختر اور کیفی اعظمی کی زندگی پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ منور رانا نے بھی اس موقعے پر اپنا کلام پیش کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 7 اکتوبر 2012

قاسم خورشید

پٹنہ: اردو ہندی کے تخلیق کار و ڈرامہ نگار و فلم ساز ڈاکٹر قاسم خورشید کو نوشکتی نکیتن بہار کے شادا اسٹڈی سرکل کے تحت 'ساہتیہ سادھنا ایوارڈ 2012' سے نوازا گیا ہے۔ یہ اعزاز انھیں 26 اگست کو بہار سرکار کی کابینہ کے وزیر نند

کشور یادو نے پدم شری ڈاکٹر گوپال پرساد سنہا، خدا بخش لائبریری کے ڈائرکٹر پروفیسر امتیاز احمد، ڈاکٹر انیل سلبھ اور بہار کے دیگر معزز تخلیق کاروں، فنکاروں اور محبانِ اردو کی موجودگی میں پٹنہ سیٹی کے ایک وسیع ہال میں پیش کیا۔ قاسم خورشید شروع سے اپٹا IPTA سے وابستہ رہے ہیں۔ انھوں نے کئی ٹیلی فلمیں بنائی ہیں اور بین الاقوامی فلم فیسٹول میں بھی اعزاز حاصل کیا ہے۔

پریس نوٹ: سعید عبید اللہ سنبلی، سیسو پچھی، دربھنگہ، 29 ستمبر 2012

رسم اجرا

ارمغان

نئی دهلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ گنگا جمنی تہذیب، انسانی رواداری، میانہ روی اور سیکولر قدروں پر گامزن ہندوستان کی مثالی یونیورسٹی ہے، یہ یونیورسٹی قدیم اور جدید دونوں علوم کا سنگم ہے، اردو زبان وادب کے حوالے سے جامعہ مثالی شناخت رکھتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار لوک سبھا کی اسپیکر میرا کمار نے جامعہ میں 'بی اماں گرلس ہاسٹل' کے افتتاح اور شعبہ اردو کے سالانہ ادبی مجلّے

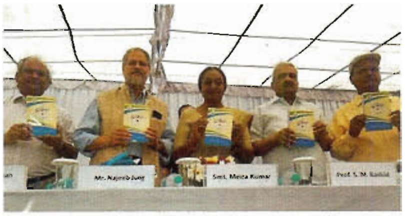

'ارمغان' کی رسم اجرا کے موقعے پر کیا۔ 'ارمغان' جامعہ کے شعبہ اردو کی تاریخ میں پہلا ادبی، تحقیقی اور تنقیدی مجلّہ جاری کیا گیا ہے، یہ مجلّہ پی ایچ ڈی اور ایم فل والوں کو مدنظر رکھ کر تیار کیا گیا ہے۔ شیخ الجامعہ نے کہا کہ جامعہ کے قیام کے 92 برس ہونے جا رہے ہیں مگر ہمیں جو حق ملنا چاہیے، وہ اب تک نہیں مل سکا ہے۔ انھوں نے کہا کہ شعبہ اسلامک اسٹڈیز، اردو فارسی جیسے شعبے جامعہ کی جان ہیں۔ اسی کے مدنظر ہم نے یہاں ہر طالب علم کو دو سال اردو کی تعلیم دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ گرلس ہاسٹل میں فی الحال 400 بیڈ ہیں اور بی اماں گرلس ہاسٹل کو لے کر 900 بیڈ ہو جائیں گے۔ اگلے ڈھائی برسوں میں ہم اپنے جامعہ کے پچاس فیصد طلبہ کو ہاسٹل میں جگہ دینے کا ہدف پورا کرلیں گے۔ اس موقعے پر میرا کمار نے بی اماں ہاسٹل کا معائنہ کر کے جامعہ کی کوششوں کو سراہا۔ واضح رہے کہ بی اماں مولانا محمد علی جوہر کی والدہ کا نام ہے۔ پروگرام کی نظامت صدر شعبۂ اردو پروفیسر خالد محمود نے کی۔ انھوں نے کہا کہ اردو ایسی زبان ہے، جو عقلمند اور ذہین لوگوں کے دلوں میں رچی بسی ہے ارمغان کی رسم اجرا کے موقعے پر انھوں نے بے انتہا خوشی کا اظہار کیا۔ اخیر میں پروفیسر سید محمد راشد پرو وائس چانسلر نے ہدیہ تشکر پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' 29 ستمبر 2012

جدید اردو افسانے کا تکنیکی مطالعہ

پربھنی: گیان ریاسک کالج پربھنی کے آڈیٹوریم ہال میں تحریک اردو ادب پربھنی کی جانب سے ڈاکٹر حمید اللہ خان کی تصنیف 'جدید اردو افسانے کا تکنیکی مطالعہ' کا اجرا رکن پارلیمنٹ ایڈوکیٹ گنیش راؤ دودھ گاؤنکر کے ہاتھوں ہوا تقریب میں مہمان خصوصی ڈاکٹر حمید سہروردی صدر شعبہ اردو گلبرگہ یونیورسٹی ڈاکٹر معین الدین جینابڑے صدر شعبہ اردو جواہر لعل نہرو یونیورسٹی دہلی، ڈاکٹر مجید بیدار حیدرآباد، ڈاکٹر کلیم ضیا معروف افسانہ نگار، نورالحسن اورنگ آباد وغیرہ شریک تھے۔ بعد ازاں پربھنی کے رکن پارلیمنٹ گنیش دودھ گاؤنکر کو تحریک اردو ادب پربھنی کی جانب سے محبِ اردو ایوارڈ اور سپاس نامہ سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر تحریک اردو ادب پربھنی کے سرپرست علی شاہ خان، صدر سمیع اللہ خان موجود تھے۔ بعد ازاں رکن پارلیمان نے اپنے ہندی اردو منفرد لب ولہجے میں کہا کہ میرے آبا و اجداد اردو بولتے تھے اور اردو زبان ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی علمبردار ہے اردو زبان اپنی مٹھاس اور اپنا ایک خاص اثر عوام کے دل پر چھوڑتی ہے۔ انھوں نے اپنے ہی کالج کے پروفیسر و ڈاکٹر حمید اللہ خان کی اردو افسانہ تکنیکی مطالعے کے رسم اجرا پر خوشی و مسرت کا اظہار کیا اور ان کی گراں قدر اردو خدمات پر انھیں مجاہد اردو ایوارڈ رکن پارلیمان گنیش راؤ کے ہاتھوں نوازا گیا۔

روزنامہ 'اورنگ آباد ٹائمز'، اورنگ آباد، 26 ستمبر 2012

اسلامی ریاست

نئی دهلی: انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں لگے 5 ویں بین الاقوامی اسلامی کتاب میلہ میں ڈاکٹر الطاف احمد

اعظمی کی کتاب 'اسلامی ریاست' کا اجرا کیا گیا۔ آرگنائزر این جی او زایجوکیشنل ہیلتھ اینڈ سوشل اویرنیس سوسائٹی اور الحسنات بکس پرائیویٹ لمیٹڈ کے تحت جاری کتاب میلے میں منعقدہ تقریب اجرا کے موقعے پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے کہا کہ اسلامی کتاب میلہ لگانا قابل ستائش ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس طرح میلہ ہر جگہ لگائے جانے کی ضرورت ہے۔ اس موقعے پر الطاف اعظمی، ڈاکٹر اے ایم فہیم ڈاکٹر فیصل، محمد یوسف وغیرہ موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 ستمبر 2012

اقلیتی اسکیموں کی کتاب کا اردو ترجمہ

نئی دھلی: دہلی کے وزیر شہری ترقی راج کمار چوہان نے دہلی سکریٹریٹ میں اقلیتوں کے لیے ملک بھر میں جاری تعلیمی اسکیموں سے متعلق کتاب 'اے اسٹیپ فارورڈ' کے اردو ترجمہ 'ایک قدم آگے' کا اجرا کیا۔ وزیر اعلیٰ کے پارلیمانی سکریٹری مکیش شرما اور قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر خواجہ اکرام الدین بھی موجود تھے۔ راج کمار چوہان نے کہا کہ یہ کتاب اقلیتوں کو سرکار کی تعلیمی اسکیموں کا فائدہ اٹھانے کے لیے کافی مددگار ثابت ہوگی۔ دہلی سرکار اقلیتوں کو تعلیم کے حصول کے لیے ہر ممکن سہولت مہیا کرانے کے اپنے عہد پر قائم ہے۔ خواجہ اکرام نے کہا کہ اس کتاب کے ذریعے اردو داں طبقے کو مرکز اور ریاستی سرکاروں کے ذریعے چلائی جارہی اقلیتی تعلیمی اسکیموں سے واقف کرایا جاسکے گا۔ وزارت فروغ انسانی وسائل نے اردو زبان کی ترقی اور اسکل ڈیولپ کے لیے مختلف اسکیمیں نافذ کی ہیں، جو ہماری ویب سائٹ پر موجود ہیں اور جلد ہی انٹرنیٹ پر اردو میں دستیاب ہوں گی۔ اردو کونسل کا کمپیوٹر کورس کرنے والے 60 فی صد بچوں کو روزگار مل چکا ہے۔ دہلی اسٹیٹ اقلیتی کمیشن کے چیئرمین صفدر ایچ خاں نے کہا کہ اقلیتی تعلیمی اسکیموں کی تفصیل اردو زبان میں شائع کرا کے پشپندر سنگھ نے قابل ستائش کام کیا ہے۔ وزیر اعظم منموہن سنگھ کے 80 ویں یوم پیدائش پر اقلیتی تعلیمی اسکیموں سے متعلق کتاب جاری کر کے ایک اچھا قدم اٹھایا ہے۔ وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ یہ کتاب مدارس اور دیگر اردو اداروں میں مفت بھیجی جائے گی۔ اقلیتی کمیشن کے ممبر اے سی مائکل نے کہا کہ 'ایک قدم آگے' کے اردو میں شائع ہونے کے بعد اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں میں بیداری لانے میں مدد ملے گی۔ اس موقعے پر علامہ رفیق انٹر کالج (ہاپوڑ) کے 200 بچوں کو اسکول بیگ اور جیومیٹری باکس اور سلیم پور کے 100 طلبا کو بھی جیومیٹری باکس تقسیم کیے گئے۔ پنجابی پرموشن کونسل کے صدر جسونت سنگھ بابی نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر کو ایک پمفلیٹ پیش کر کے اعلان کیا کہ نویں کلاس سے لے کر بارہویں کلاس تک کے اردو میڈیم کے طلبہ کا ایک مضمون نویسی مقابلہ منعقد کرایا جائے گا جس میں اول آنے والے طالب علم کو چار دن کے لیے دوبئی لے جایا جائے گا اور وہاں تمام تاریخی مساجد اور مقامات کی تفریح کرائی جائے گی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' 27 ستمبر 2012

فن تقریر وخطابت رموز واشاعت

حیدر آباد: مولانا ابوالنصر عابر کی کتاب 'فن تقریر و خطابت رموز و اشاعت' 231 صفحات پر مشتمل ہے۔ سب ڈپو مرکزی مکتبہ اسلامی ہند چھتہ بازار پر دستیاب ہے۔ یہ کتاب داعی کے لیے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ دراصل یہ کتاب مولانا عابر کے 50 سالہ دیرینہ تجربات کا نچوڑ بھی ہے۔ مزید تفصیلات کے لیے فون نمبر 66710339 پر ربط پیدا کیا جاسکتا ہے۔

روزنامہ 'رہنمائے دکن' حیدرآباد، 23 ستمبر 2012

مولانا یوسف حسن کی حیات وخدمات

امروهه: مرادآباد کے اسلامک اسٹڈیز سینٹر محلّہ حقانی میں مولانا یوسف حسین کی حیات وخدمات پر مبنی کتاب کی رونمائی پروفیسر منظر عباس سابق صدر شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، پروفیسر سید محمد سیادت نقوی، قیصر مبین، مولانا ڈاکٹر حسن اختر، کمال امروہی کے دست مبارک سے عمل میں لایا گیا۔ اس موقعے پر اپنی تقریر میں روہیل کھنڈ یونیورسٹی سے پروفیسر محمد سیادت، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق صدر شعبہ اردو پروفیسر منظر عباس، قیصر مبین واعسکری رضا ایڈوکیٹ نے بتایا کہ جہاں حضرت ایک معروف عالم دین تھے وہی مجاہد آزادی بھی تھے کیونکہ حضرت نے مسلمانوں کو بذریعہ فتویٰ انگریزی فوج میں شامل ہونے سے پابندی لگائی تھی جبکہ انگریزی حکومت نے آزادی کی جنگ سے مسلمانوں کو ہٹانے کے لیے انھیں فوج میں شامل کرنے کا فرمان جاری کیا تھا، اسی لیے مولانا کی خدمات پر مبنی اس کتاب کی رونمائی بابائے قوم کی یوم ولادت پر کی گئی۔ تلاوت الٰہی حمد ونعت سلام کے بعد رسم اجرا کی تقریب عمل میں لائی گئی۔ مولانا ڈاکٹر شہوار ایران و پاکستان سے اعزاز یافتہ مصنف ہے جن کی کئی اہم ادبیوں کی تحقیقی تخلیقات منظر عام پر آچکی ہے۔ جلسہ رونمائی کی نظامت کمال امروہی نے انجام دی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 3 اکتوبر 2012

'دی ہولی قرآن ان رومن اردو'

نئی دھلی: انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں جاری

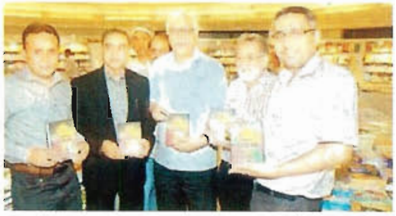

5 ویں بین الاقوامی اسلامی کتاب میلے میں 'دی ہولی قرآن ان رومن اردو' کا افتتاح عمل میں آیا۔ قرآن کے اردو ترجمہ کو رومن کرنے کی پہل الحسنات بکس پرائیوٹ لمیٹڈ کے ایڈیٹوریل بورڈ نے کی ہے۔ رسم اجرا کی تقریب میں شریک سابق الیکشن کمشنر ڈاکٹر وائی ایس قریشی نے قرآن کے اردو ترجمہ کو رومن کرنے کی تعریف کرتے ہوئے کہ بہت سے لوگ جو اردو سے پوری طرح واقف نہیں ہیں، ان کے لیے رومن اردو میں قرآن کا ترجمہ کافی مفید ثابت ہوگا۔ ایجوکیشنل ہیلتھ اینڈ سوشل اویرنیس سوسائٹی اور الحسنات بکس پرائیوٹ لمیٹڈ کے زیر انتظام منعقدہ کتاب میلے میں تقریب اجرا کے موقعے پر خطاب کرتے ہوئے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر خواجہ محمد اکرام نے کہا کہ اسلامی کتاب میلہ لگانا قابل ستائش ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس طرح کے میلے ہر جگہ لگائے جانے کی ضرورت ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 ستمبر 2012

'حیاتِ جاوید' کا ہندی ترجمہ

علی گڑھ: خواجہ الطاف حسین حالی کی تصنیف حیاتِ جاوید کے ہندی ترجمے کا اجرا کرتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیر الدین شاہ نے کہا کہ یہ کتاب ان لوگوں کے لیے بہت ہی سودمند ثابت ہوگی جو اردو نہیں جانتے۔ اس کتاب کے ہندی ترجمے کی ضرورت بہت مدت سے محسوس کی جارہی تھی۔ مہمانانِ خصوصی مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر جناب نسیم احمد نے کہا کہ میں اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے اور اردو سے ہندی میں ترجمہ کرتے وقت زبان کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے۔ یہ ترجمہ وہی شخص کرسکتا ہے جو سرسید اور ان کی تحریک سے متاثر ہو۔ حیاتِ جاوید کے ہندی مترجم ڈاکٹر راجیولوچن ناتھ شکل نے کہا کہ 550 صفحات پر مشتمل اس کتاب کا ہندی ترجمہ کرنے میں پانچ سال لگے۔ حیاتِ جاوید محض سرسید کی سوانح حیات ہی نہیں ہے بلکہ انیسویں صدی کی مستند تاریخ بھی ہے۔ سرسید نے مذہب اور سائنس کے درمیان تفریق نہیں برتی۔ وہ مذہبی اصلاح کے ساتھ ساتھ سائنسی بیداری بھی قائم کرنا چاہتے تھے۔ یہ ترجمہ سرسید احمد خاں کو خراجِ عقیدت ہے

اور اس کی ترغیب سب سے پہلے پروفیسر اختر الواسع سے ملی تھی۔ شعبۂ ہندی کے پروفیسر دیپک سکسینہ نے کہا کہ خواجہ الطاف حسین حالی اپنے عہد کے ممتاز دانشور تھے اور وہ ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ کی علامت تھے۔ محترمہ تسنیم سہیل نے کہا کہ سرسید قوم کے رہبر تھے اور حالی قومی شاعر تھے۔ شعبۂ ہندی کے پروفیسر عبدالعلیم نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ لٹریری کلب کے صدر ڈاکٹر سراج اجملی نے کہا کہ رسید احمد خاں اور خواجہ الطاف حسین حالی دونوں اساطیر میں سے تھے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 3 اکتوبر 2012

تمھیں محبت کا حق نہیں ہے

سرونج: شاعر و ادیب سیفی سرونجی کی پچاسویں کتاب 'تمھیں محبت کا حق نہیں ہے' کا اجرا کیا گیا ہے۔ محمد صابر خاں اور ان کی ٹیم کے عبدالقدیر خاں، عبدالرحمٰن خاں، عبدالغنی ایڈوکیٹ نے سپاس نامہ پیش کیا، اس موقعے پر اقلیتی کمیشن کے سابق چیئرمین ابراہیم قریشی، سابق ایم ایل اے گوردھن اپادھیائے اور مدرسہ بورڈ کے چیئرمین محمد راشد خان نے سیفی سرونجی کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ اس سال ہم مدرسہ بورڈ کے کورس کی کتابوں میں ان کا نام شامل کریں گے ابراہیم قریشی اور اقبال مسعود نے اپنی تقریر میں کہا کہ سیفی سرونجی کو راج سبھا کا ممبر بنایا جانا چاہیے۔ غازی ولی احمد، ڈاکٹر شان فخری، محمد متین ندوی، شکیل احمد، عبدالصبور خاں، ظفر صہبائی، اور سد بھاؤنا منچ کے صدر انل اگروال نے بھی اپنے مضامین اور تقریروں میں سیفی سرونجی کے کارناموں پر روشنی ڈالی۔

بذریعہ ڈاک، سرونج

رہنمائے صحافت

پٹنہ: نورالسلام ندوی کی تصنیف رہنمائے صحافت کا اجرا پٹنہ کے اردو بھون میں رام ولاس پاسوان کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ جناب رام ولاس پاسوان نے کہا کہ اردو بہت

ہی شیریں اور لطیف زبان ہے۔ آزادی میں اردو صحافت نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ ناقابل فراموش ہے۔ بہار قانون ساز اسمبلی کے رکن اختر الایمان نے کہا کہ صحافت افکار کی ترسیل کا ذریعہ ہے۔ فکر جتنی بلند ہوگی صحافت کا معیار اتنا ہی اونچا ہوگا۔ موجودہ دور میں نئی نسل کے صحافت میں آنے سے ایک نئی روشنی ملے گی۔ صحافی اشرف استھانوی نے جلسے کی نظامت کے دوران اردو صحافت کی تاریخ پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ پروفیسر شکیل قاسمی نے کہا کہ صحافت عوامی ترجمانی کے لیے نہیں ہے بلکہ اسے رہنمائی کا کردار بھی ادا کرنا چاہیے۔ بہار میں بی بی سی کے نمائندہ ڈاکٹر منی کانت ٹھاکر نے اردو اسکرپٹ کو زندہ رکھنے پر زور دیا۔ کتاب کے مصنف نورالسلام ندوی نے 350 صفحات پر مشتمل اپنی کتاب رہنمائے صحافت کا تعارف پیش کیا۔ پٹنہ یونیورسٹی کی شعبہ اردو کی صدر پروفیسر اشرف جہاں، روزنامہ قومی تنظیم کے ایڈیٹر ایس ایم اجمل فرید ملی و سماجی رہنما انجینیئر حسین اور معروف صحافی ریاض عظیم آبادی نے بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔

پریس نوٹ، اشرف استھانوی، پٹنہ، 19 ستمبر 2012

علی جواد زیدی: ایک مونوگراف

لکھنؤ: اترپردیش کے وزیر شہری ترقیات اور اقلیتی بہبود محمد اعظم خاں نے ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی کی کتاب 'علی جواد زیدی ایک مونوگراف' کا اجرا یہاں سکریٹریٹ میں واقع اپنے دفتر میں کیا۔ اعظم خاں نے کہا کہ پدم شری علی جواد زیدی ریاست کے جانے مانے مجاہد آزادی ہونے کے ساتھ اول درجے کے شاعر اور مشہور تخلیق کار تھے اور محکمہ اطلاعات کی جانب سے شائع ہونے والے ماہنامہ 'نیا دور' کے بانی مدیر بھی تھے۔ 'نیا دور' کے موجودہ مدیر ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی نے اپنے اس مونوگراف میں زیدی کی زندگی اور ان کی خدمات کو بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے۔ وزیر شہری ترقیات نے ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی کو اس مونوگراف کی اشاعت پر مبارکباد دیتے ہوئے کہا رضوی نے 'نیا دور' کے تقریباً دس خاص نمبر شائع کیے۔ ان میں مولانا محمد علی جوہر خاص نمبر بہت پسند کیا گیا اور کہا کہ وہ ایک کامیاب ایڈیٹر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے قلمکار بھی ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 26 ستمبر 2012

'صوفی طاہر حسن عثمانی'

سہارنپور: ایجوکیشنل لیگ آف مسلمس ان انڈیا کے زیر اہتمام اسلامیہ انٹر کالج کے سابق استاد و اولڈ بوائے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور نام و نمود سے دور رہ کر خاموشی کے ساتھ لوگوں کی اصلاح کرنے والی سہارنپور کی بزرگ

شخصیت صوفی طاہر حسن عثمانیؒ کی خدمات پر مشتمل ماہنامہ 'علمی صدا' کے خصوصی شمارے کا اجرا حب رسولؐ کے عنوان سے ایک سیمینار اسلامیہ انٹر کالج کے ہال میں کیا گیا جس میں علما و مشائخ اور عمائدین شہر کے علاوہ کالج کے طلبہ و اسٹاف نے شرکت کی۔ مہمان خصوصی جامعہ مظاہر علوم کے سکریٹری مولانا سید محمد شاہد الحسنی نے صوفی طاہر حسن عثمانی کو شریعت اور طریقت کا حامل بتایا اور کہا کہ صوفیائے کرام نے اس ملک میں اشاعت اسلام کا جو کام کیا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ حکیم سید محمد احمد قادری، وحدت اسلامی کے مولانا عطاء الرحمٰن وجدی اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکن پیر جی حافظ حسین کے علاوہ علمی صدا کے مدیر اور پروگرام کے کنوینر محمد عارف حسن عثمانی نے کہا کہ صوفی صاحب کے رفیق کار فیاض احمد انصاری، اختر علی خاں، ڈاکٹر جمیل مانوی، قاضی شوکت حسین، ڈاکٹر شاہد زبیری، جلال عمر، حاجی عبیداللہ کاظم، قاضی ندیم اختر، شفاعت عظیم شامل رہے۔

پریس نوٹ، عارف حسن عثمانی، 3 اکتوبر 2012

وفیات:

ہاجرہ مسرور

کراچی: برصغیر میں حقوقِ نسواں کی علمبردار ممتاز افسانہ نگار ہاجرہ مسرور ہفتہ 15 ستمبر 2012 کو کراچی میں 83 سال کی عمر میں انتقال کرگئیں۔ ہاجرہ مسرور کا آبائی تعلق ہندوستان کے مرکز علم و ادب لکھنؤ سے تھا۔ ان کے والد ڈاکٹر تہور احمد خان برطانوی فوج میں ڈاکٹر تھے۔ ان کی بہن خدیجہ مستور بھی اردو کی معروف ادیبہ تھیں۔ ہاجرہ مسرور کے افسانوں اور مختصر کہانیوں کے 7 مجموعے شائع ہوئے، ان میں 'چاند کے دوسری طرف'، 'تیسری منزل'، 'اندھیرے اُجالے'، 'چوری چھپے'، 'ہائے اللہ'، 'چرکے' اور 'وہ لوگ' شامل ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 ستمبر 2012

پروفیسر اکبر حیدری

سری نگر: پروفیسر اکبر حیدری کشمیری نے آج صبح 10 بجے داعی اجل کو لبیک کہا۔ پروفیسر حیدری کئی مہینہ سے علیل تھے۔ ان کا انتقال ہمدانیہ کالونی سری نگر میں ان

کی رہائش گاہ پر ہوا پروفیسر حیدری 85 برس کے تھے ان کی تدفین ان کے آبائی قبرستان بمنہ میں ہوئی اور نماز جنازہ مولانا محمد عباس انصاری نے پڑھائی۔ حال ہی میں پروفیسر حیدری کی شریک حیات فرحت آرا حیدری کا بھی انتقال ہوا تھا وہ اردو کی معروف ناول نگار تھیں۔ پروفیسر حیدری کے پسماندگان میں دو بیٹے ظفر حیدری، جہانگیر حیدری اور دو بیٹیاں تبسم آرا (زوجہ علی اصغر) عفت آرا (زوجہ محمود عطریان) ہیں۔

پریس نوٹ مرزا شفیق حسین، 18 ستمبر 2012

ڈاکٹر عبدالحق انصاری

نئی دھلی: سابق امیر جماعت اسلامی ہند ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری کا 3 اکتوبر کو 3:30 بجے سہ پہر علی گڑھ میں حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 81 سال تھی۔ ڈاکٹر عبدالحق انصاری مرحوم یکم ستمبر 1931 کو تمکوہی ضلع کشی نگر (اترپردیش) میں پیدا ہوئے تھے۔ والد کا نام علیم الدین تھا۔ آبائی قصبے سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ گورکھپور سے عالمیت ثانوی، درس گاہ اسلامی رامپور سے بی اے ایم اے اور پی ایچ ڈی (فلسفہ) 1962 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کیا۔ اس کے بعد مزید تعلیم کی غرض سے امریکہ گئے وہاں ہارورڈ یونیورسٹی سے 1972 میں ایم ٹی ایس کیا۔ آپ نے علی گڑھ اور شانتی نکیتن میں بھی درس وتدریس کے فرائض انجام دیے۔ بعد میں جامعہ اسلامیہ ام رومان سوڈان، یوپی ایم یونیورسٹی ظہران اور امام محمد بن سعود اسلامک یونیورسٹی ریاض سعودی عرب میں تحقیق و تدریس کی خدمات انجام دیں۔

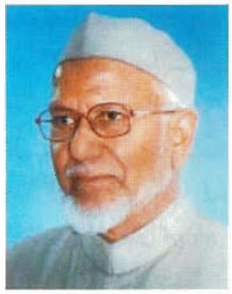

روزنامہ 'جدید خبر'، دہلی، 17 اکتوبر 2012

مظفر رزمی

کیرانہ: بزرگ شاعر مظفر رزمی کیرانوی 19 ستمبر کو انتقال کر گئے۔ مرحوم حضرت مشیر جھنجھانوی کے مکتب کے ہونہار شاگردوں میں سے تھے۔ میونسپل بورڈ کیرانہ میں کم و بیش تیس برس تک اعلیٰ عہدہ پر فائز رہے۔ رڑکی (اتراکھنڈ) میونسپل بورڈ میں 1996 میں ریٹائر ہوئے اور اس کے بعد کیرانہ میں ہی مقیم رہے۔ 2000 عیسوی میں دہلی کے اپولو ہاسپٹل میں آپ کی بائی پاس سرجری ہوئی۔ پسماندگان میں تین بیٹے جاوید اقبال، پرویز جمال، نوید کمال اور بیٹی عذار پروین، ہنی رانی نیز زوجہ شاہجہاں بیگم ہیں۔ ان کا شعر ''یہ جبر بھی دیکھا ہے تاریخ کی نظروں نے۔لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی'' ملک کے کم وبیش دس وزرائے اعظم نے مذکورہ شعر پارلیمنٹ میں دوران خطاب پڑھا۔ جنازہ کی نماز مسجد سرائے والی میں ادا کی گئی اور آبائی قبرستان بھورا روڈ پر تدفین عمل میں آئی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 20 ستمبر 2012

نیر اقبال

باغپت: اردو کی معروف ادیبہ وشاعرہ نیر اقبال زبیری کا اچانک انتقال ہونے کی اطلاع پر اردو حلقوں میں رنج وغم کا ماحول ہے۔ نیر اقبال فیض آباد گورنمنٹ کالج کے شعبہ اردو میں پروفیسر رہیں۔ صحافی کامران زبیری (میرٹھ) کی حقیقی پھوپھی تھیں اور میرٹھ میں ہی کامران زبیری کے یہاں رہتی تھیں۔ آل انڈیا اردو تنظیم نے ان کے انتقال پر رنج وغم کا اظہار کیا اور اردو ادب کا ایک ناقابل تلافی نقصان قرار دیا ہے۔ ان کے انتقال پر اردو تنظیم ملت پر چیریٹیبل ٹرسٹ، پیس میڈیا نیٹ کی طرف سے تعزیر کی گئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 ستمبر 2012

خراج عقیدت

رضیہ بٹ

بھروٹ/راجوری: بھروٹ راجوری میں اقرا فاونڈیشن نے اپنے ایک خصوصی تعزیتی اجلاس میں رضیہ بٹ کے لاہور میں رحلت کر جانے پر اپنے دکھ کا اظہار کیا ہے۔ اپنے صدارتی خطبے میں جناب شہباز راجوروی نے خراج عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے رضیہ بٹ مرحومہ کے انتقال پُر ملال کو اردو دنیا خاص کر اُردو ناول نگاری کے ایک دور کا خاتمہ بتایا۔ جناب عبدالسلام بہار، جناب فدا راجوروی، شبیر راتھر، رضیہ بٹ کی رحلت پر اظہارِ خیال کیا۔ ہم لواحقین اور اہلِ کنبہ کے ساتھ دکھ اور غم میں برابر کے شریک ہیں۔

پریس ریلیز، میڈیا سکریٹری، اقرا فاونڈیشن، راجوری 6 اکتوبر 2012

شاغل ادیب

حیدرآباد: 2 ستمبر کی شام مسدوسی ہال مغل پورہ میں تعزیتی جلسہ 'دشاغل ادیب' منعقد ہوا۔ اثر غوری اور ڈاکٹر راہی نے جلسے سے خطاب کیا۔ شاغل ادیب نے خود پی ایچ ڈی نہیں کیا لیکن کئی ریسرچ اسکالرز کی رہنمائی کرتے ہوئے انھیں ایم فل اور پی ایچ ڈی کروایا تھا۔ ڈاکٹر راہی نے پچاس سال پہلے کی ادبی تاریخ شعری محفلوں اور اس وقت کے اساتذۂ سخن کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر محسن جلگانوی نے شاغل ادیب سے اپنی چالیس سالہ رفاقت کا ذکر کرتے ہوئے شاغل ادیب کو ایک ہمہ مقصدی اور حرکیاتی شخصیت قرار دیتے ہوئے ان کی طویل ادبی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا۔ ڈاکٹر سلیم عابدی نے کہا کہ شاغل ادیب ایک فعال اور حرکیاتی شخصیت تھے۔ فاروق عارفی نے کہا کہ ایک شریف النفس انسان صاحب کردار وادیب وشاعر تھے۔ حمید الظفر نے کہا کہ شاغر ادیب ایک قلندر مزاج سیدھے سادھے انسان اور اردو کے خاموش خدمت گار تھے۔ صوفی سلطان شطاری تمیز الدین اور شکیل مظہر فرزند شاغل ادیب نے بھی خطاب کیا۔ یوسف روش نے تعزیتی قطعات پیش کیے۔

روزنامہ 'منصف' حیدرآباد، 5 ستمبر 2012

جوہر عابدی

منگلور: اردو سماج اتراکھنڈ کی ایک میٹنگ سید جوہر عابدی کے سانحۂ ارتحال پر شاہ ولایت گرلز ہائی اسکول میں منعقد کی گئی اس موقعے پر پروفیسر تنویر چشتی صدر اتراکھنڈ اردو سماج نے کہا کہ سید جوہر عابدی کا خاندانی نام سید حیدر رضا اور تخلص جوہر عابدی تھا ان کے والد مرحوم کا اسمِ گرامی سید زوار حسین عابدی تھا۔ جوہر عابدی کی تاریخِ ولادت 3 دسمبر 1950 تھی موصوف منگلور کے قریب زین پور کے رہنے والے تھے ان کے والد محترم کا آبائی وطن موضع نین پور سید نزد نانوتہ ضلع سہارنپور ہے۔ موصوف کا شعری مجموعہ اشاعت کا منتظر ہے، بزرگ شاعر شمیم قریشی نے کہا کہ جوہر عابدی کی غزلوں میں کہیں کہیں مرثیے کا رنگ نظر آتا تھا۔ احمد بھارتی ایڈیٹر روزنامہ نئی آواز نے کہا کہ موصوف ایک اچھے انسان اور سچے شاعر کے طور پر روڑکی کی ادبی محفلوں میں شریک رہتے تھے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 7 اکتوبر 2012

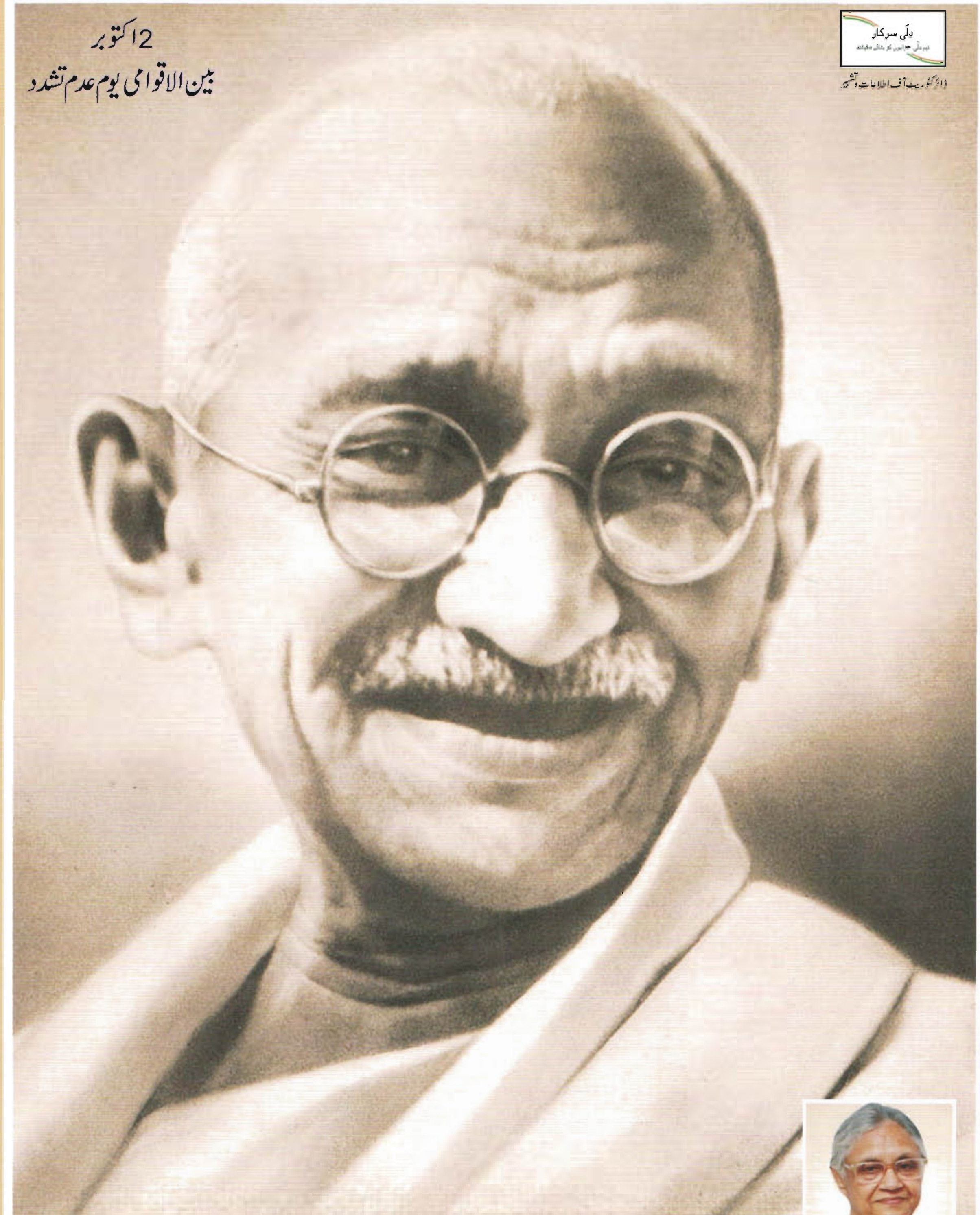

2 اکتوبر
بین الاقوامی یوم عدم تشدد
دلّی سرکار
ڈائرکٹوریٹ آف اطلاعات وتشہیر
شریمتی شیلا دکشت
وزیر اعلیٰ۔ دہلی
DIP/1146/2012-13

URDU DUNIYA Monthly, November 2012, Vol. 14, Issue: 11
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2011-13
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication: 24/10/2012
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

اب گھر بیٹھے سیکھیں اردو زبان
اور وہ بھی اپنے کمپیوٹر پر
بغیر کسی استاد کے بالکل مفت
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے
آن لائن اردو لرننگ کورس کی مدد سے

کونسل کی بہترین مطبوعات
وہ بھی بغیر کسی پریشانی کے بالکل مفت
اب دستیاب ہیں
آپ کے اپنے کمپیوٹر پر

کمپیوٹر سیکھنا اب ہوگا آسان
ہر گھر میں پہنچا
ڈیجیٹل کمپیوٹر لرننگ پروگرام

لوگ ان کریں ...

www.urducouncil.nic.in

Printed and Published by Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Director, NCPUL on behalf of NCPUL, FAROGH-E-URDU-BHAWAN, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi-110025 and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 on 80 GSM Art Paper produced by JK Editor :Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Tel : 49539000